چند قدم گھر سے ......

(سفر نامہ پاکستان)

(نظر ثانی شدہ)

انجینئر محمد سمیع الدین (علیگ)

JALALI BOOKS

تعارف

☆ نام : محمد سمیع الدین

☆ سنہ پیدائش : ۱۹۴۰ء

☆ وطنِ مالوف : موضع حبیب والا (بجنور)

☆ تعلیم : B.Sc. Engg. (Civil)

☆ مشغلہ : سرکاری اعلیٰ عہدہ سے سبکدوش ہوجانے کے بعد سے تصوف، اسلامیات، نیز اردو ادب پر تحقیقاتی کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ کئی کتابیں تصنیف کرچکے ہیں۔

☆ پتہ : بلقیس ولا، حبیب باغ، بھمولا اسٹریٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

☆ موبائل : 9759318584

Library

چند قدم گھر سے..................!

[سفر نامۂ پاکستان]

[نظرِ ثانی شدہ]

''**سمجھوتہ ایکسپریس**'' جو ۱۹ر فروری ۲۰۰۷ کی علی الصبح پانی پت [ہندوستان] کے قریب واقع دیوانہ ریلوے اسٹیشن پر ایک انسانیت کی دشمن اور شیطانیت کی علمبردار تنظیم کی بربریت جس میں ۶۸ بے گناہ مسافر اور حفاظتی عملے کے افراد شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے، کا شکار ہوئی۔

انجینیر محمد سمیع الدین
(علیگ)

[جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔]

☆ نام کتاب : ''چند قدم گھر سے.......!'' (نظرِ ثانی شدہ)
☆ نام مصنف : انجینیر محمد سمیع الدین (علیگ)
موبائل نمبر۔ +91-9759318584
+91-9808179281
☆ سنہ اشاعت :
(اوّل بار) ۲۰۰۱ء
(نظرِ ثانی شدہ) ۲۰۰۹ء
☆ تعداد اشاعت :
(اوّل بار) ۱۰۰۰
(نظرِ ثانی شدہ) ۲۰۰
☆ ناشر (بار اوّل) : عاکف بک ڈپو
۳۲۲۳۔ کوچہ تاراچند، دریا گنج، نئی دہلی۔۲
(نظرِ ثانی شدہ) : ''مرکزِ حبیب برائے تحقیق و تصنیف''
بلقیس ولا، حبیب باغ، بھمولہ اسٹریٹ،
علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲
☆ کمپیوٹر کتابت : طیب حسین،
(نظرِ ثانی شدہ) پنڈت جی کا احاطہ، بھمولہ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲
☆ طابع : بھارت آفسیٹ پریس
۲۰۳۵، قاسم جان اسٹریٹ، بلی ماران، دہلی
☆ قیمت : تین سو پچاس روپیہ
☆ ملنے کا پتہ : انجینیر محمد سمیع الدین
۴/۱۰۔ حبیب باغ، بھمولہ اسٹریٹ
علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

● یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ کسی بھی قسم کی قانونی، عدالتی چارہ جوئی صرف علی گڑھ (یوپی) کی عدالت میں قابلِ سماعت ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

JALALI BOOKS

مصنف (محمد سمیع الدین)

ماضی کے جھرونکوں سے، حال کے انینہ تک

اے عشق! مل سکیں گے نہ ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے
(کلیم عاجز)

۱۹۵۸ء

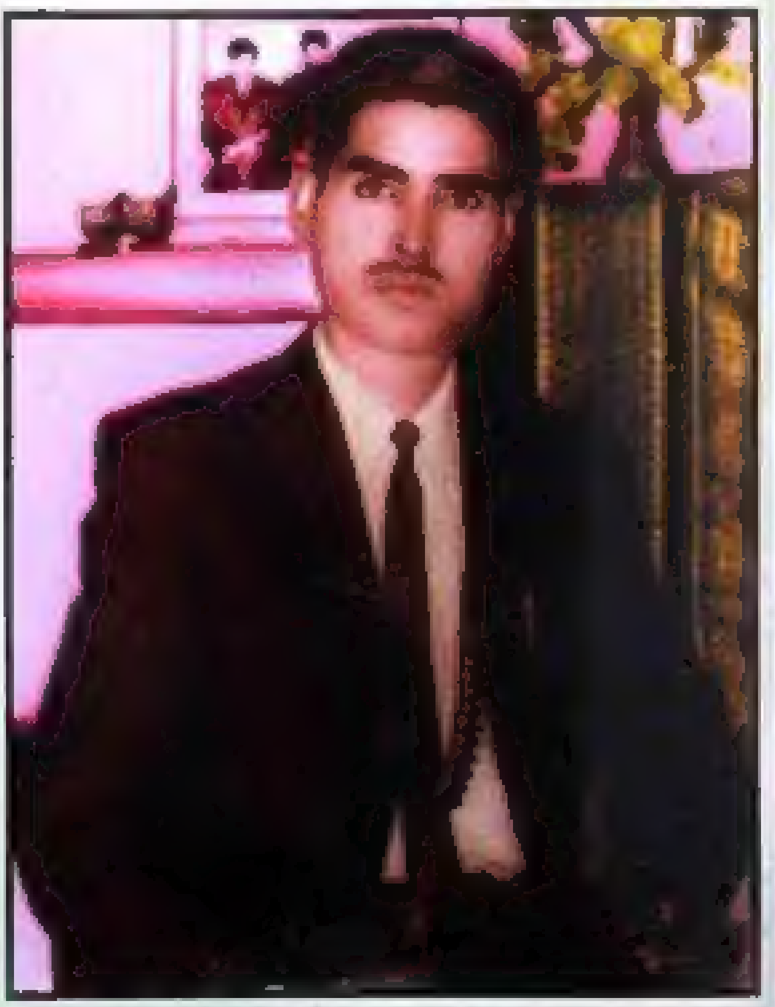

۱۹۷۲ء

۱۹۸۲ء

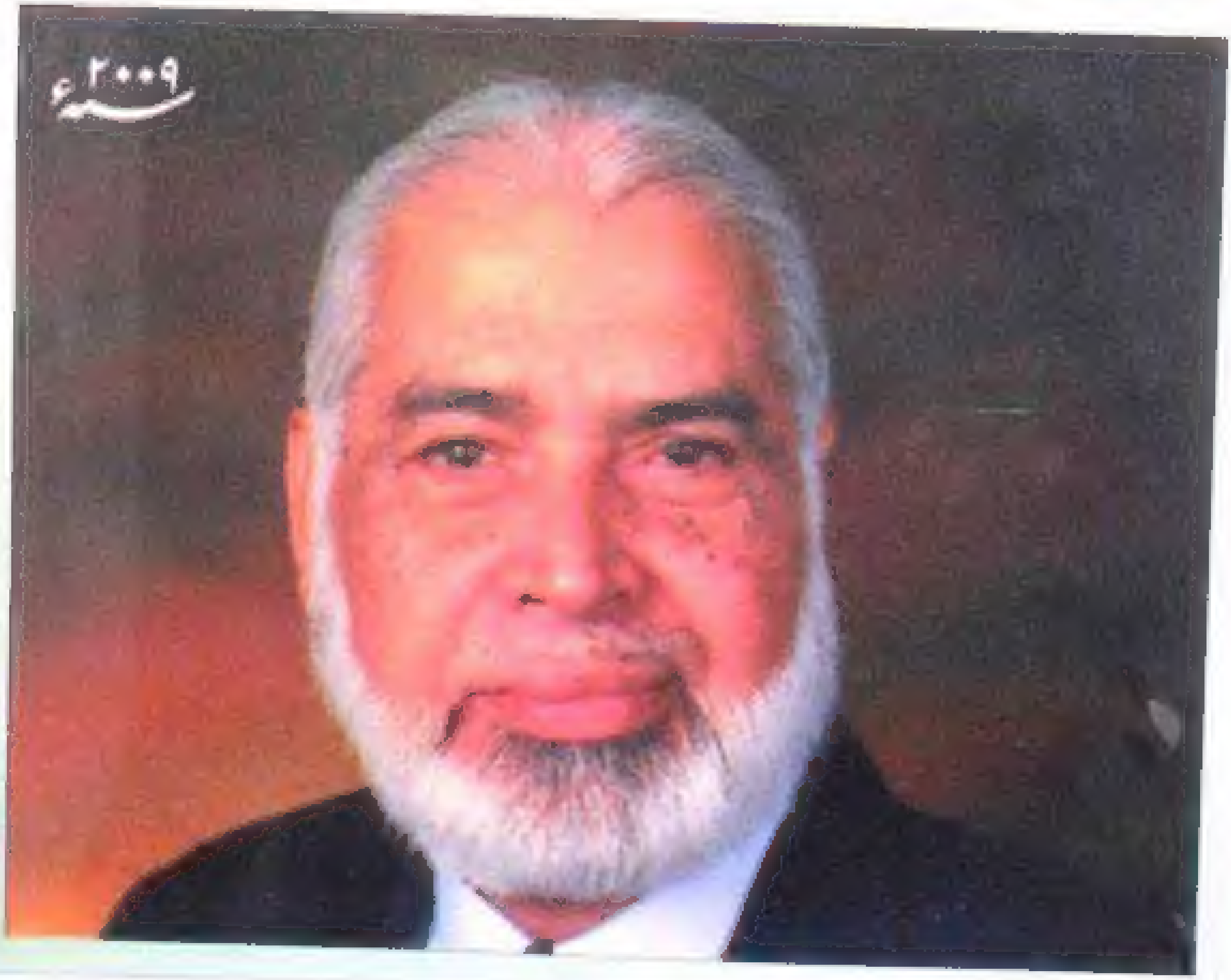
۲۰۰۹ء

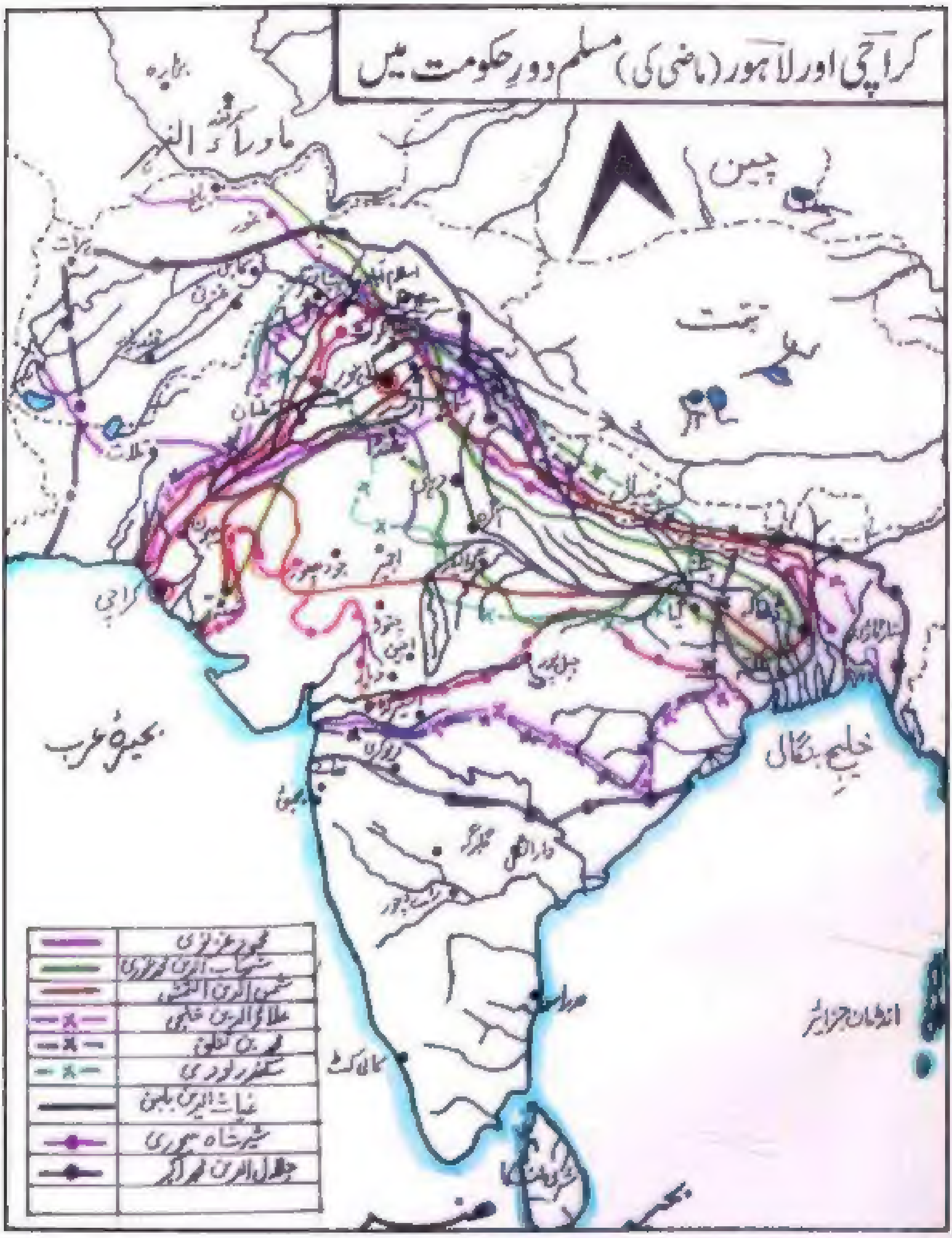
کراچی اور لاہور (ماضی کی) مسلم دورِ حکومت میں
ماوراء النہر
چین
تبت
کراچی
بحیرۂ عرب
خلیجِ بنگال
انڈمان جزائر
محمود غزنوی
شہاب الدین غوری
شمس الدین التمش
علاؤ الدین خلجی
محمد بن تغلق
سکندر لودھی
غیاث الدین بلبن
شیر شاہ سوری
جلال الدین محمد اکبر

JALALI BOOKS

انتساب

سرحدوں کے دونوں جانب آباد

اُس نوجوان نسل کے نام

جو جذبۂ خیر سگالی سے سرشار ہے۔

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
(۱)	(۲)	(۳)
۱۔	**باب اوّل۔ "خیال اپنا اپنا.......!!"**	
	[۱] انھوں نے فرمایا...........!	۲
	[۲] وہ فرماتے ہیں..........!! [تعارف مصنف]...	۳
۲۔	**باب دوم۔ گذارشات**	
	[۱] بارِ اوّل [طباعتِ اولیٰ]...........	۱۳
	[۱] بارِ دوم [طباعتِ ثانی]...........	۱۹
۳۔	**باب سوم۔ روانگی**...........	۲۳
۴۔	**باب چہارم۔ کراچی**	
	[۱] جغرافیائی پس منظر...........	۳۶
	[۲] تاریخی پس منظر...........	۳۶
	[۳] ترقیاتی پس منظر...........	۳۹
	[۴] آبادکاری(Housing)...........	۴۲
	[۵] پینے کے پانی کا نظام(Water Supply System)	۵۵
	[۶] گندگی کی نکاسی کا نظام(Drainage System)........	۵۹

(۱)	(۲)	(۳)
	(۱) برساتی پانی(Flood Water)	۵۹
	(۲) سیوریج(Sewerage)	۶۰
	[۷] بجلی کا نظام (Electric Supply System)	۶۲
	[۸] ذرائع نقل وحمل(Transportation)	۶۴
	[۹] مذہبی بیداری(Religious Awareness)	۶۷
	[۱۰] صحت عامہ(Health)....	۶۹
	[۱۱] نظم ونسق(Law & Order) ...	۷۰
	[۱۲] معاشی حالات (Economical Conditions)	۸۴
	[۱۳] قابل دید چند یادگاریں Worth Seeing few Monuments	۹
	[۱۴] مختصراً کراچی میں ترقیاتی کام........	۹۲
	[۱۵] مختصراً کراچی کی اہمیت........	۹۸
	[۱۶] کراچی میں میری مصروفیات........	۱۰۰
	[۱۷] کراچی تصاویر کے عکس میں...	۱۰۳
۵۔	**باب پنجم ۔ لاہور**	
	[۱] حقیقت کے آئینہ میں........	۰۴
	[۲] تاریخ کے جھرونکوں سے	
	[۱] چند اہم تاریخی واقعات........	۱۳۹
	[۲] لاہور کے چند نامور امراء........	۱۴۳
	[۳] لاہور میں پیدا ہوئے/وصال پائے چند نامور امراء	۱۷۱

(۱)	(۲)	(۳)
	[۳] لاہور کے چند معروف صوفیاء کرام	
	(۱) جن کے مزارات پر حاضری ممکن ہو سکی	
	۱۔ سید علی بن عثمان بن علی الجلابیؒ [المشہور بہ داتا گنج بخشؒ]	۱۸۹
	۲۔ حضرت شیخ محمد میرؒ [المشہور بہ میاں میرؒ]	۲۰۱
	۳۔ سید فخر الدین حسین زنجانیؒ	۲۰۹
	۴۔ سید عزیز الدین مکی ثم لاہوریؒ [المشہور بہ پیر مکی]	۲۱۵
	(۲) جن کے مزارات پر حاضری کاش کہ ممکن ہو سکتی!	
	۱۔ ''قادریہ'' سلسلے سے وابستہ صوفیاء کرام	۲۱۸
	۲۔ ''نقشبندیہ'' ایضاً	۲۳۷
	۳۔ ''سہروردیہ'' ایضاً	۲۳۹
	۴۔ ''چشتیہ'' سلسلے ایضاً	۲۴۷
	۵۔ خانوادہ ہائے متفرق سے وابستہ صوفیاء کرام	۲۵۲
	[۴] چند بزرگ/خاندان جو باہر سے لاہور وارد ہوئے۔	۲۶۱
	[۵] قابلِ دید چند یادگاریں (Worth Seeing few Monuments)	۲۶۵
	[۶] مختلف مسلم ادوار میں کیے گئے چند تعمیراتی کام	۲۷۵
	[۷] لاہور تصاویر کے آئینہ میں	۲۸۰
۶۔	**باب ششم۔ خدا حافظ**	
	(۱) وطن واپسی	۲۸۲
	(۲) دعائیہ کلمات	۳۱۵
۷۔	**باب ہفتم۔ مآخذ**	۳۱۷
۸۔	**باب ہشتم۔ احقر کی دیگر تصنیفات**	۳۲۱

باب اوّل

"خیال اپنا اپنا......!"

[۱] انھوں نے فرمایا!

''پاکستان کی نئی مملکت اب ایک حقیقت ہے۔ لہٰذا اب یہ ہندوستان اور پاکستان، دونوں کے حق میں ہے کہ وہ باہم دوستانہ تعلقات قائم اور آپس میں تعاون کریں نہیں تو اور زیادہ پریشانیاں، الجھنیں اور مصیبتیں ہوں گی۔''

فیروز بخت عرف محی الدین احمدؒ

المعروف بہ **مولانا ابوالکلام آزاد**

[''انڈیا ونس فریڈم'' صفحہ ۲۴۸]

کسی نے ایک دن مجلس میں شیخ الاسلام حضرت **مولانا حسین احمد مدنیؒ** سے پوچھا ''حضرت! پاکستان کے لئے اب آپ کا کیا خیال ہے؟'' تو انھوں نے حسب معمول سنجیدگی اور بشاشت سے فرمایا ''مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے۔''

[روزنامہ ''الجمعیۃ'' (شیخ الاسلام نمبر) فروری ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۳۶]

''ہم آخیر تک تقسیم وطن کے خلاف رہے لیکن جب کہ پاکستان ایک ملک بن گیا ہے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ پاکستان والے اپنے ملک میں خوش رہیں۔''

مجاہد ملت حضرت **مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ**

[روزنامہ ''الجمعیۃ'' (مجاہد ملت نمبر) ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۴۱]

[۲] وہ فرماتے ہیں ....!!

[تعارف مصنف]

حضرت ابوایوب انصاریؓ جن کو رسول مقبول ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہے، ایک بلند مرتبہ صحابیؓ تھے۔ ان کے صاحبزادے، حضرت ابومنصورتابعی عہد عثمانی میں بسلسلۂ جہاد خراسان تشریف لائے اور ہرات میں مقیم ہوگئے۔ حضرت ابومنصورکی آٹھویں پشت سے شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری ہرویؒ ۳۹۶ھ (۱۰۰۵ء) میں ہرات میں پیدا ہوئے۔ آپ زہد وتقویٰ اور علم وفضل میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ نے بچاسی سال کی عمر میں ۴۸۱ھ (۱۰۸۸ء) میں وفات پائی۔ آپ کا مزار مبارک آج بھی ہرات میں مرجع خلائق ہے۔ شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری ہروی کے پڑپوتے، خواجہ جلال الدینؒ، سلطان شہاب الدین محمد غوری کے عہد حکومت [۱۲۰۲ء تا ۱۲۰۶ء] میں بسلسلۂ تبلیغ دین متین ہند میں وارد ہوکر علاقہ نیمسار۔ مسرکھ (ضلع سیتاپور) میں قیام پذیر ہوئے۔

خواجہ جلال الدینؒ کی دسویں پشت سے ایک نہایت ہی برگزیدہ شخصیت، شیخ خان علیہ الرحمۃ ہوئے۔ آپ شب وروز دریائے معرفت میں اس قدر مستغرق رہتے تھے کہ ہفتہ بھر میں کبھی ایسی حالت بھی پیش آتی کہ آپ کو اپنی مطلق بھی خبر نہ رہتی۔ "منقبت سلطانی" سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت ایک بیمار بچے کو لے کر آپ کے حضور حاضر ہوئی۔ آپ کلام پاک کی تلاوت میں مشغول تھے۔ بعد فراغت آپ نے اس عورت سے وجہ آمد معلوم کرکے بچے کے چہرے سے چادر ہٹانے کو کہا۔ پردہ ہٹایا تو دیکھا کہ بچہ مردہ تھا۔ وہ عورت بین کرکے زاروقطار رونے لگی اور شیخ کے سر ہوگئی کہ وہ تو بچہ زندہ لائی

تھی اب مردہ کیسے لے کر جائے؟۔آپ نے ہر چند عورت کو سمجھایا لیکن جب وہ نہ مانی تو حکم دیا کہ بچے کا منہ دوبارہ کپڑے سے ڈھانپ دو۔اس کے بعد آپ نے کچھ پڑھ کر بچے پر دم کیا۔ بچہ حکم ربّی سے دوبارہ زندہ ہوگیا۔

اپنے وصال سے آٹھ روز قبل آپ نے اپنے پوتے، شیخ عبدالحمیدؒ کو چند نصیحتیں فرماتے ہوئے اپنے مزار شریف کی جگہ دکھائی اور اپنی تاریخ وفات سے بھی آگاہ فرمایا۔ اس کے بعد ایک ہفتے صاحب فراش رہ کر ہردم یادِ خدا میں مصروف رہے۔ بروز چہارشنبہ اپنی بہو (اہلیہ شیخ حبیب اللہؒ) سے دریافت فرمایا کہ آج کون دن ہے؟۔انہوں نے بتایا کہ چہارشنبہ۔منہ پھیر کر آپ کسی قدر ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ کب تک انتظار کروں، جمعہ کے روز شربت وصال پینے کا وعدہ ہے۔ چنانچہ بروز جمعہ، قبل نماز، نہم شہر ربیع الاوّل ۱۰۱۴ھ، (۱۶۰۵ء) حضرت ذوالجلال سے وصال لایزال حاصل کیا۔آپ کی وصیت کے مطابق قصبہ چاندپور (ضلع بجنور) کے پاس موضع سیاؤ میں آپ کو دفن کیا گیا۔

حضرت شیخ خانؒ کے صاحبزادے، حضرت شیخ حبیب اللہؒ بھی ایک صاحب کرامات، ولی صفت اور برگزیدہ شخصیت تھے۔آپ کا بچپن ہی سے ریاضت کا یہ عالم تھا کہ سخت سردیوں میں بھی رات کو بیس بیس بار وضو فرماتے اور ہر بار تحیۃ الوضو ادا کرتے۔ گرمیوں میں کئی کئی ہفتے لگاتار نفل روزے رکھتے۔آپ کو حالتِ نماز میں بھی جب ولولۂ الٰہی کا غلبہ ہوتا تو رقص کرنے لگتے۔مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے نورتنوں میں سے شیخ فیضی اور شیخ ابوالفضل آپ کے بہت معتقد تھے۔''منقبتِ سلطانی'' سے نقل ہے کہ ایک بار ابوالفضل کے صاحبزادے، شیخ عبدالرحمٰن، شیخ حبیب اللہ علیہ الرحمۃ کو اپنے گھر لاہور لے گئے۔شیخ عبدالرحمٰن کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔شیخ عبدالرحمٰن نے شیخ حبیب اللہؒ کی خدمت میں دو آم نذر کیے۔شیخ نے اُن میں سے ایک آم عبدالرحمٰن کی زوجہ جو خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ کی نسل سے تھیں، کو دیا اور دوسرے آم میں سے آدھا خود کھا کر باقی عبدالرحمٰن کو دے

دیا اور اپنی زبانِ معجز بیان سے فرمایا کہ اس کو کھاؤ تمھارے اولادِ نرینہ پیدا ہوگی۔ چنانچہ حضرت کی دُعاؤں کے طفیل اور خدا کی رحمت سے ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) (۳ ذیقعدہ بروز جمعہ) میں عبدالرحمن کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اکبر نے پشوتن رکھا۔ بیاسی سال کی عمر میں بروز نوا زدہم جمادی الآخر ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) کو شیخ حبیب اللہ نے وصال فرمایا۔

آپ کے وصال کے فوراً بعد غیب سے "شیخ حبیب اللہ ولی" کی صدا آئی۔ اس حساب سے بھی آپ کی وفات سن ہجری نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۰۴۴ھ آپ کے صاحبزادے، شیخ عبدالحمیدؒ جو خود بھی ایک جید عالم اور کامل بزرگ تھے، نے عربی میں آپ کی تاریخ وفات قلم بندکی جو اس طرح سے ہے:—

"قدرحل الشیخ محبوب القلوب هو حبیب اللّٰه محی السنة
کان تاریخ الوصال الربه هو حبیبی و ابشر و ابالجنة"

۱۰۴۴ھ

آپ اپنے والد، شیخ خان علیہ الرحمۃ کے پہلو میں مدفون ہیں۔ آپ ہی کے نام پر یہ علاقہ "سرائے شیخ حبیب" کہلاتا ہے۔ آپ کا مقبرہ ایک بلند مقام پر لکھوری اینٹوں اور بلاک کنکر کا بنا ہوا اور مرجعِ خلائق ہے۔

بجنور کے قصبہ دھامپور سے تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر، شمال۔ مغرب کی جانب ایک گھنا جنگل تھا جس میں کافی تعداد میں شیر اور دیگر متعدد جنگلی جانور رہا کرتے تھے۔ اس جنگل سے انسان کا گزرنا ممکن تھا۔ شیخ حبیب اللہ علیہ الرحمۃ نے یہاں قیام فرما کر ریاضت فرمائی۔ وضو کے واسطے جب شیخ کو پانی کی حاجت ہوئی تو حکمِ ربی سے فوراً ایک چشمہ جاری ہوا جس نے بعد میں ایک ندی کی شکل اختیار کرلی اور یہ ندی، پاؤں دھوئی کہلائی۔ یہیں شیخ نے ایک بلند مقام پر ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں ایک بستی کی بنیاد

رکھی جس کا نام حبیب والا رکھا۔حروف تہجی کے اعتبار سے بھی ''موضع حبیب والا (ولی)''

سے سن بنیاد نکلتی ہے۔ یہاں شیخ کی اولاد آباد ہوئی۔ ۱۰۲۲ھ

حضور مقبول ﷺ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے لیے علم کی دعا کی تھی اس لیے ان کی اولاد میں یہی خصوصیات ہمیشہ سے پائی جاتی رہی ہیں۔ چنانچہ قصبہ حبیب والا میں بھی علماء، فضلاء، ادیبوں، دانشوروں، شعراء اور فقراء کی کسی دور میں کمی نہیں رہی لیکن یہ لوگ نام ونمود سے بے نیاز، گوشہ نشینی کی فقیرانہ زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ اسی لیے دنیا ان کے کارناموں سے واقف نہ ہو سکی۔ قصبہ حبیب والا قدیم ہی سے ایک مردم خیز بستی رہی ہے۔ اس بستی کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے اہلِ نظر اس کو بجنور کا خطۂ یونان کہتے ہیں۔ یہاں قدیم ہی سے صد فی صد آبادی تعلیم یافتہ رہی ہے۔ یہاں مغربی اور مشرقی دونوں تہذیبوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے جس کی وجہ یہاں کے عوام کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دار العلوم دیوبند سے قریبی وابستگی رہی ہے۔ ملک کے دو ٹکڑے ہو جانے اور نئی مملکتِ پاکستان کے بن جانے سے یوپی کا شاید ہی کوئی ایسا مسلم خاندان یا آبادی رہی ہوگی جو اس سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ اس بستی اور اس کے ساکنان پر بھی اس کا اثر ہوا۔ آج بھی بستی کے کھنڈرات اس کے گواہ ہیں۔

اس درویش خاندان اور مردم خیز بستی میں غالباً ۷ ستمبر ۱۹۴۰ء کو جناب محمد سمیع الدین کا جنم ہوا۔ آپ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی بتیسویں پشت سے ہیں۔ کمسنی میں ہی آپ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے۔ آپ کی پرورش آپ کے بڑے بھائیوں نے نہایت شفقتِ پدرانہ کے ساتھ کی اور اس طرح دولتِ پدری سے محروم ہونے پر بھی آپ شفقتِ پدری سے مالا مال رہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ صوم وصلوٰۃ کی پابند ایک ولی صفت خاتون تھیں جنھوں نے اپنی تمام اولاد کو اس خوبصورتی سے پرورش کیا اور تربیت دی کہ دینی اور دنیاوی، دونوں اعتبار سے وہ باصلاحیت بنی۔ شاید ان ہی کی اعلیٰ صلاحیتوں

اور دعاؤں کا طفیل ہے کہ آج جناب سمیع الدین کے بارے میں یہ سب کچھ لکھا جا رہا ہے۔
جناب سمیع الدین نے ابتدائی تعلیم حبیب والا اور پھر قصبہ دھامپور (بجنور) میں حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے علی گڑھ تشریف لے گئے جہاں ۱۹۶۷ء میں نمایاں کامیابی کے ساتھ سول انجینیر نگ میں گریجویشن کیا۔ کئی محکموں میں کام کرنے کے بعد آپ یوپی کے محکمۂ آبپاشی سے ۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ء کو سبکدوش ہوئے۔ پہلے آپ نے دلی میونسپل کارپوریشن کے تحت "Water Supply & Sewage Disposal Undertaking" میں اس کے بعد ''مرکزی وزارتِ ورکس اینڈ ہاؤسنگ'' کے تحت "National Buildings Construction Corporation" (N.B.C C) میں اور بعد ازاں اتر پردیش کے محکمۂ آبپاشی میں اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ کام کیا اور ٹیکنیکل مہارت کا لوہا منوایا۔
چونکہ آپ کا تعلق ایک درویش خاندان سے ہے لہٰذا مغربی علوم سے آراستہ ہونے کے باوجود بھی وراثت میں ملی فقیرانہ صفات آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جب آپ کی عمر محض دس سال تھی تو خواب میں آپ کو حضور مقبول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ جناب رامیشور دیال گپتا جو دلی کے رہنے والے ہیں [اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔] اور محکمہ آبپاشی میں بھی ٹھیکیداری کر چکے ہیں، نے جناب محمد سمیع الدین کے بارے میں عجیب وغریب واقعات کا انکشاف کیا۔ بقول اُن کے قصبہ ٹپل (علی گڑھ) کے پاس، جمنا ندی کے بائیں کنارے پر سرکاری کام سے جناب سمیع الدین خیمہ زن تھے۔ جون کا مہینہ تھا۔ سخت ترین گرمی اور خوفناک جھلسا دینے والی لوئیں چل رہی تھیں کہ عین دوپہر کے وقت ایک شخص تکلیف سے بدحال آپ کے خیمے میں داخل ہوا۔ سمیع الدین صاحب اُس وقت ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ پوری بات معلوم کرنے کے بعد سمیع الدین صاحب نے اُس پر کچھ پڑھ کر دم کیا جس سے وہ شخص خدا کے فضل وکرم سے بالکل ٹھیک

ہو کر ہنسی خوشی فوراً گھر چلا گیا۔ اس کے علاوہ اور چند واقعات جناب گپتا نے بیان کیے جن سے جناب سمیع الدین کی درویشانہ صفات اور بزرگی کی نمایاں عکاسی ہوتی ہے۔

مرادآباد کے جناب شاہد حسین [اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔] نے بتایا کہ جب جناب سمیع الدین صاحب مرادآباد میں تعینات تھے تو ۲۶ر جنوری ۱۹۹۶ء کو یوم جمہوریہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے آپ کچھ دیر کے لئے اچانک خاموش ہوئے اور پھر اعلان کیا کہ اگلے ماہ فروری کے آخری ہفتے میں اُن کا یہاں سے تبادلہ ہو جائے گا۔ ہر چند کے انجینیرس کا مالی سال کے آخیر میں تبادلہ نہیں ہوتا لیکن پھر بھی آپ کا وہاں سے ۲۸ر فروری کو تبادلہ ہو گیا۔

ڈاکٹر عابد جو ضلع دہرہ دون میں ڈاک پتھر کے پاس موضع جیون گڑھ کے رہنے والے ہیں، نے سمیع الدین صاحب کی بزرگی سے متعلق کئی واقعات بیان فرمائے۔ ان کا کہنا ہے کہ سمیع الدین صاحب ڈاک پتھر میں تعینات تھے، میرا لڑکا گھوڑا کھال سینک اسکول میں داخلے کے لئے امتحان میں بیٹھا لیکن وہ بظاہر فیل ہو گیا۔ میں نے سمیع الدین صاحب سے دعا کے لئے کہا۔ بمشکل تمام آپ نے ایک دن فرمایا کہ جاؤ تمہارے بچے کا داخلہ ہو گیا ہے۔ میں بھاگا بھاگا اسکول گیا۔ واقعیٔ غیبی طور سے کچھ ایسی مدد اللہ تعالیٰ نے فرمائی کہ میرے بچے کا داخلہ ہو گیا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ انھوں نے اپنی لڑکی نسرین بانو کا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلے کے سلسلے میں بھی بیان کیا۔

آپ ایک بلند ہمت، بہادر اور باحوصلہ مردِ مومن ہیں۔ آپ کی زندگی دلیرانہ اقدامات سے بھری پڑی ہے۔ خطرات سے ٹکرانے میں آپ کو بے حد لُطف آتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں احمد آباد میں جو زبردست مسلم کش فساد ہوا جس کے سلسلے میں خان عبدالغفار خان صاحب کو بھی احمد آباد جانا پڑا، آپ بے خوف و خطر عین فساد کے دوران، جس وقت فساد شباب پر تھا، اپنے محکمہ جاتی کام سے وہاں گئے۔

۱۲ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو آپ کو سرکاری کام سے ضلع جھانسی میں ایک ایسے مقام پر جانا پڑا جہاں بیتوا ندی کی گھاٹیوں میں خونخوار ڈاکوؤں کا مسکن تھا لیکن آپ بے خوف و خطر وہاں گئے اور تمام رات ڈاکوؤں کے مہمان رہے۔ ان کی اس جرأت اور پامردی پر ڈاکو بھی انگشت بدنداں رہ گئے اور بہت اخلاق سے پیش آئے۔ اس سے سمیع الدین صاحب کی فرض شناسی کا بھی عندیہ ملتا ہے۔

۱۹۷۸ء میں آپ کی زیر نگرانی ایک مٹی کا باندھ تیار ہوا۔ یہ باندھ جمنا ندی کے بائیں کنارے پر، دہلی کے بالکل سامنے، دہلی۔ سہارنپور شاہراہ کے متوازی اور قصبہ باغپت اور قصبہ لونی (ضلع غازی آباد) کے بیچ واقع ہے۔ ابھی یہ باندھ بن کر تیار ہو ہی تھا کہ برسات کی وجہ سے جمنا میں سیلابوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۴ر ستمبر ۱۹۷۸ء کو اس دریا میں اپنی تاریخ کا شدید ترین خوفناک سیلاب آیا جس کے پیش نظر ضلع حکام نے قرب و جوار کی آبادی کو محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا اور اس باندھ سے بھی تمام عملہ چلا گیا کیوں کہ یہ یقینی تھا کہ یا تو یہ باندھ ٹوٹ جائے گا یا پھر اس کے اوپر سے سیلاب کا پانی اتر جائے گا۔ سمیع الدین صاحب سے بھی باندھ چھوڑنے کو کہا گیا لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور یک و تنہا تقریباً ایک ہفتہ تک اس طغیانی کا مقابلہ کرتے رہے اور اپنی اعلیٰ ٹیکنیکل مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے متعدد ایسے کام کئے جس سے یہ سیلاب اس باندھ کے لئے ایک نعمت ہی ثابت ہوا۔ عین سیلاب کے شباب کے دن عید الفطر (۵ر ستمبر) تھی جو سمیع الدین صاحب نے وہیں اپنے بیوی بچوں اور خاندان کے دیگر افراد سے دور رہ کر منائی اور اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ شب و روز یادِ خدا میں بھی مشغول رہے۔ سیلاب کا زور کم ہو جانے پر محکمہ آبپاشی کے چیف انجینیر نے باندھ کا دورہ کیا اور باندھ کو مکمل محفوظ اور سمیع الدین صاحب کو زندہ و سلامت دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور تعجب اور فرطِ خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ انھیں سینے سے لگا لیا اور تمغۂ صدر جمہوریہ دلانے کا وعدہ فرمایا۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ اس سیلاب کی شدت اس قدر تھی کہ ہریانہ اور دہلی کی جانب کے کئی باندھ ٹوٹ گئے تھے اور اگر یہ باندھ بھی ٹوٹ جاتا تو غازی آباد کے پاس واقع فرخ نگر کے نزدیک میں دو فوجی ہوائی اڈے کو خطرہ ہو سکتا تھا۔

سمیع الدین صاحب کے مزاج میں انتظامی صلاحیتوں اور ذوقِ سلیم کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے۔ بلند شہر اور علی گڑھ میں تعیناتی کے دوران ''ضلع زراعتی، صنعتی نیز ثقافتی نمائشوں'' کے موقعوں پر آپ نے کئی تاریخ ساز مشاعرے کرائے جس کی وجہ سے ہندوستان کے صفِ اول کے سبھی شعراء کرام آپ سے بخوبی واقف ہیں۔ شمیم جے پوری، راز الہ آبادی، خمار بارہ بنکوی، نازش پرتاپ گڑھی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، واثق جونپوری، کیف بھوپالی، فنا نظامی کانپوری، عالم فتح پوری، مشیر جھنجھانوی، شمسی مینائی وغیرہ وغیرہ مرحومین تو آپ کے گرویدہ تھے۔ راز الہ آبادی کا جو مجموعۂ کلام ''منزلیں'' کے عنوان سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا اس کے سرورق پر آپ کے ہی Comments درج ہیں۔

جناب سمیع الدین کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ اردو میں ''کہکشاں'' اور ''آبگینہ''، ہندی میں ''پریتی پنج'' اور کچھ ٹیکنیکل کتابیں آپ کی شاہکار ہیں۔ ''آبگینہ'' سے متاثر ہو کر تو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے آپ کو دعوت دی تھی کہ آپ ملازمت چھوڑ کر ان کے ساتھ فلمی دنیا میں آجائیں اور فلمی کہانیاں نیز مکالمے لکھنے لگیں۔ آپ کی ایک اور کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' جو تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہے، زیرِ اشاعت ہے۔ یہ کتاب انشاءاللہ تصوف میں سنگِ میل ثابت ہوگی۔

جناب سمیع الدین ''زباں شیریں ملک گیری'' کے مقولے کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ ایک ملاقات پر انسان آپ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میں بے پناہ قوتِ ارادی ہے۔ ایک بار ارادہ کر لینے پر دنیا کی کوئی طاقت، کوئی پریشانی آپ کو اس سے نہیں ہٹا سکتی۔ آپ کو شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں سے حد درجہ رغبت اور لگاؤ ہے۔

مختصراً جناب سمیع الدین میں بیک وقت وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک بہترین انسان میں ہونی چاہیے۔ آپ بہترین دوست، کامیاب انجینیر، فرض شناس آفیسر، خوش مذاق، سلیقہ مند، باوضع، متواضع، منکسر مزاج، نرم اور شیریں گفتار، صاف گو، جری، بہادر، حوصلہ مند، درویش صفت، ادب نواز، علم دوست اور حسنِ مجلسی رکھنے والے عمدہ انسان ہیں۔ اللہ آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے (آمین)

(ایس۔ ایم۔ ظفر)

بابِ دوم

گزارشات

[۱] بارِ اوّل

[طباعتِ اولیٰ]

اس برصغیر ہندو پاک کے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہوجانے پر دو خود مختار مملکتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ بحث تو غالباً بے معنی ہے کہ تقسیم مناسب تھی یا غیر مناسب کیوں کہ نہ تو یہ میرا موضوع ہے اور نہ ہی بقول شخصیکہ ''گڑے مردے اکھاڑنے'' سے کوئی فائدہ ہی ہوگا بلکہ تلخی میں مزید اضافہ ہی ہوگا۔ اب یہ ایک حقیقت ہے کہ دو مملکتیں وجود میں آچکی ہیں اور حقیقت کو تسلیم کرلینا ہی دانش مندی ہے۔ شترمرغ کے ریت میں منھ چھپالینے سے حقیقت بدل نہیں جاتی یا بلّی کے دودھ میں منہ ڈالتے وقت آنکھیں بند کرلینے سے چوری چھپ نہیں سکتی۔ اب ضرورت ہے تو اس بات کی کہ ہر دو جانب کے عوام ماضی کی تلخیوں کو فراموش کرکے آپس میں بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کے قوتِ بازو بنیں اور دوست کی طرح شیروشکر ہوکر رہیں۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔ میں نے اپنے سفر کے دوران دیکھا کہ ہر دو جانب کے عوام اور سرکاری مشینری میں یہ جذبۂ خیر سگالی موجود بھی ہے۔ یہ ایک امید افزا امر ہے۔ کاش کہ حکمراں طبقہ بھی اس جذبہ کی آبیاری کرے تاکہ یہ ایک تناور درخت بن کر آنے والی نسلوں کو سایہ اور شیریں پھل مہیا کرسکے۔ لیکن یہاں تو کھیلوں پر بھی سیاست کا ملمع چڑھادیا گیا ہے جس کا عوام کے جذبۂ خیر سگالی کے آگے کافی عرصے تک برقرار رہنا مشکل ہوگا۔ [انڈین کرکٹ ٹیم کو ۲؍جنوری سے ۲۶؍فروری ۲۰۰۹ء تک پاکستان کا دورہ کرنا تھا جہاں اسے تین ٹیسٹ، پانچ

ایک روزہ اور ایک ٹیسٹ اوور کے میچ کھیلنے تھے لیکن اب ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ء کو ممبئی میں ہوئے دہشت گردانہ حملوں کے پس منظر میں ان کو Cancel کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی دونوں ممالک کے درمیاں کشیدہ تعلقات کی بنا پر کرکٹ پر زلزلہ ڈھل چکا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں جو تعلقات منقطع ہوگئے تھے وہ ۱۰ مارچ تا ۱۳ اپریل ۲۰۰۴ء کے مذاکرات سے بحال ہوئے، ۲۸ فروری تا ۱۸ اپریل ۲۰۰۵ء کے مذاکرات سے ۶ سال بعد پاکستانی کرکٹ ٹیم کا دورہ ہند اور ۷ جنوری تا ۱۹ فروری ۲۰۰۶ء کے مذاکرات سے دونوں ممالک کے مابین کرکٹ سیریز کا انعقاد ممکن ہو سکا تھا۔ خدا کرے کہ پھر سے جلد تعلقات استوار ہو جائیں۔]

آزادی کے فوراً بعد ہر دو ممالک مذکورہ سے عوام کے نقل مکانی کا ایک دردناک المیہ ظہور پذیر ہوا۔ سرحد کے اس پار صدیوں سے رہنے والے مسلم خاندان اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ شاید ہی ایسا کوئی مسلم خاندان، بالخصوص شمالی ہند میں آباد تعلیم یافتہ خاندان رہا ہوگا جو ملک کی تقسیم کے ساتھ خود بھی منقسم نہ ہو گیا ہو۔ ہوا دراصل یہ کہ ناگفتہ بہ حالات نے جس برق رفتاری سے کروٹ لی اس سے ہر تعلیم یافتہ مسلم خاندان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ اس کو جلد یا بدیر اپنی جنم بھومی کو خیر باد کہنا ہوگا۔ چنانچہ پہلے ان افراد نے ہجرت کی جو یا تو سرکاری ملازمت میں تھے یا جو نوجوان اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ نتیجتاً زیادہ تر عمر رسیدہ اشخاص، زیر تعلیم بچے اور کچھ سرکاری ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں رہ گئے۔ اسی اثناء میں پُر آشوب دور کے دم توڑنے، ماحول کے پرسکون اور حالات کے سازگار ہو جانے سے امید کی ایک نئی کرن پھوٹی جس سے نقل مکانی کا وہ خوفناک ریلا یکلخت تھم سا گیا اور جو جہاں تھا وہیں کا ہو رہا۔ لیکن اس سے خاندان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے اور والدین سے اولاد، بھائی سے بھائی اور بہن بچھڑ گئے۔ غرض یہ کہ Creamy Layer اپنے Base سے جدا ہو گئی۔

انسانوں نے سرحد کی شکل میں زمین پر لکیر کھینچ کر خاندانوں کو تو بانٹ دیا لیکن وہ اللہ کے بنائے ہوئے دلوں کو تقسیم نہ کر سکے۔ چنانچہ آج بھی (ابھی تک تو) منقسم خاندان ترجیحی بنیادوں پر آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پاکستان میں تو ہندوستانی لڑکی کو جلد ہی شہریت مل جاتی ہے جب کہ ہندوستان میں شاذونادر ہی کسی پاکستانی لڑکی کو شہری حقوق مل پاتے ہوں حتیٰ کہ اس کے کئی کئی بچے بھی ہو جاتے ہیں جو ہندوستانی شہری ہی ہوتے ہیں۔ ستم ظریفی تو دیکھئے کہ شوہر ہندوستانی، بچے ہندوستانی لیکن محترمہ غیر ملکی!۔ لاہور میں مجھے بھتیجی [بھائی نمبر ۳ کی سب سے بڑی بیٹی] کی لڑکیاں بہت پیاری لگیں۔ کاش کہ وہ ہندوستان میں ہوتیں تو میں ان میں سے ایک کو تو ضرور اپنی بہو بنالیتا! انھیں دیکھ کر اور حالات کے پیش نظر میں دل مسوس کر رہ گیا۔

میری بات رہی میرے من میں
کچھ کہہ نہ سکا انجمن میں

اس سلسلے میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر حکمرانوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ملک کو تقسیم ہوئے چون سال (۲۰۰۱ء تک) ہو چکے ہیں۔ ہجرت کرنے والوں میں سے زیادہ تر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میں نے اپنے قیام پاکستان کے دوران کچھ بقید حیات مہاجرین سے اُن کے ہجرت کرنے سے متعلق تاثرات جاننے چاہے تو کم وبیش سبھی کے یہ تاثرات تھے کہ اُس وقت جو حالات تھے اُس سے ایسا لگتا تھا کہ بالآخر بھی کو نقل مکانی کرنا ہوگا یا پھر دونوں ممالک کے درمیان حالات اِس حد تک خوشگوار ضرور رہیں گے کہ ہر دو ممالک کے عوام بنا روک ٹوک سرحد کے دونوں جانب آجا سکیں گے اور پاسپورٹ کی کوئی بندش نہیں ہوگی۔[جس طرح سے یوروپین یونین کے ممالک میں ہے۔] میں نے اُس نسل کے بھی تاثرات جاننے چاہے جو وہیں پیدا ہوئی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ یہاں زیادہ خوش ہیں۔ البتہ وہ اپنے ہندوستانی رشتہ داروں کے بارے میں ضرور فکر مند دکھائی دیے۔

اُن میں اپنے خانوادے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا جذبہ تو جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ کچھ خاندانوں نے تو نئے ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کفو ہی بدل ڈالے ہیں۔ [اس سلسلے میں حقیر کی کتاب ''تذکرۂ شیخ بہ گُرہن ماہیہ'' کی جلد اوّل، ''تاریخ دودمان عاقی'' ملاحظہ فرمائیں۔] جس سے ازدواجی زندگیوں میں رخنہ اندازی واقع ہوئی ہے۔ ویسے پاکستانی اپنے بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں کفو سے متعلق کچھ زیادہ چھان بین نہیں کرتے محض معاشی حالات کو دیکھتے ہیں۔ ایک مہاجر خاندان اپنے آبائی وطن کے مہاجر خاندان ہی کو اولیت دیتا ہے۔ پہلے ضلعی سطح پر، پھر صوبائی سطح پر اور آخر میں یوپی۔ بہار، یوپی۔ راجستھان، یوپی۔ مدھیہ پردیش اور یوپی۔ دہلی کے تعلقات کی تجدید کرتا ہے۔

میرے والد بزرگوار کا ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں میرا خاندان نو افراد (والدہ، جدہ، پانچ بھائی اور تین بہنیں) پر مشتمل تھا۔ اس میں سے دو بھائی (بھائی نمبر ۱ اور ۳) ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء) میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ بعد میں ایک بہن (بہن نمبر ۲) کی بھی پاکستان میں شادی ہو جانے سے وہ وہاں کی شہری ہو گئیں تھیں۔ [ان کی شادی تائے زاد بھائی سے ہوئی تھی جو ۱۹۴۸ء ہی میں پاکستان چلے گئے تھے۔] اس طرح میرا ایک تہائی خاندان پاکستان اور دو تہائی ہندوستان کے مابین تقسیم ہو کر رہ گیا تھا۔ بھائیوں میں سے ایک بھائی (نمبر ۱) اور بہن تو کئی بار ہندوستان تشریف لا چکے تھے اور ان سے ملاقات بھی ہو گئی تھی لیکن دوسرے بھائی (نمبر ۳) پاکستان جانے کے بعد سے ایک بار بھی ہندوستان تشریف نہیں لائے (غالباً عیالدار ہونے کی وجہ سے یا پھر اس وجہ سے کہ بھابی صاحبہ کے والدین اور بہن، بھائی بھی پاکستانی شہری ہو چکے تھے) اور نہ ہی میں (۲۰۰۱ء سے پہلے) اور والدہ صاحبہ پاکستان جا سکے۔ اس سے نہ تو میں بھائی سے بغلگیر ہو سکا اور نہ ہی والدہ اپنے بیٹے کو گلے لگا سکیں۔

والدہ صاحبہ اکثر انھیں یاد کرکے رویا کرتی تھیں اور اسی تڑپ میں بالآخر انھوں نے ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں اس دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ اُدھر بھائی بھی والدہ اور ہم سب کو یاد کرتے کرتے ۶؍اگست ۱۴۲۱ھ (۲۰۰۰ء) کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ میں سرکاری ملازمت میں تھا۔ والدہ صاحبہ کو پاکستان لے جانے کی غرض سے میں نے اپنا پاسپورٹ بنوانے کے سلسلے میں گورنمنٹ سے No Objection Certificate کی درخواست دی لیکن افسوس کہ والدہ صاحبہ کی حیات تک مطلوبہ سرٹیفکیٹ دستیاب نہ ہو سکا۔ ہر بار ایک نئی Query کی جاتی رہی۔ مثلاً پوچھا گیا، کیوں جانا چاہتے ہیں؟۔ احقر نے جواب دے دیا، حالانکہ درخواست میں پہلے ہی سب کچھ لکھ چکا تھا۔ پھر پوچھا، کب جانا چاہتے ہیں؟۔ پھر جواب دے دیا۔ پھر پوچھا، کب واپس آئیں گے؟۔ اب ان سے کون یہ پوچھے کہ اجازت دی نہیں، چنانچہ گیا بھی نہیں، اب یہ کیسے بتادوں کہ واپس کب آؤں گا" وغیرہ وغیرہ۔ مجبور ہوکر خاموشی اختیار کرنی پڑی اور ملازمت سے سبکدوش ہوجانے پر ہی میں نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔ عزیزوں سے ملاقات کا منظر سوچنے سے ہی میرا دل بھر آتا تھا اور آنکھیں نم ہوجاتی تھیں۔ بالآخر میں نے رخت سفر باندھا اور خوشی خوشی جب ٹیلیفون پر بھائی (نمبر۳) کو یہ مژدۂ جانفزا سنانے کے لیے رنگ کیا تو پتہ چلا، کہ وہ اُسی دن صبح کو ابدی نیند سو چکے تھے اور اُس وقت غسال کے ہاتھوں میں تھے۔ اُس طرف سے روتے ہوئے میری ان دیکھی بھابھی نے بتایا کہ انتقال سے پہلے انھوں نے مجھے (راقم الحروف کو) یاد کیا اور پھر حسرت و یاس کے عالم میں فرمایا (مرحوم بھائی نے) کہ اب وہ (میں) میرے انتقال کے بعد ہی آئے گا۔ انھوں نے (بھابی صاحبہ نے) یہ بھی بتایا کہ زندگی کے آخری دور میں ان کی زبان پر، کثرت سے داغ دہلوی کا یہ شعر رہتا تھا جو ان کے لیے

ایک الہامی شعر ثابت ہوا۔

ہوش وحواس، تاب وتواں جا چکے ہیں داغ
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

مجھ پر اُس وقت کیا گزرا ہوگا، قلم اُس کے بیان سے قاصر ہے۔ کیا کیا خواب سجائے تھا!!۔ ملنے کی خوشی کے احساس سے جو آنسو آنکھوں سے چھلک جاتے تھے اب وہ رنج والم کی غمازی کرنے لگے تھے۔ صبر کا دامن تار تار ہو چکا تھا۔ ایک ایک کرکے ماضی کی دھندلی تصویریں ابھرنے لگیں تھیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد جب میں نے ایک بار ٹیلیفون پر اُن سے کہا تھا کہ اب میں ریٹائر ہو چکا ہوں، اب ضرور آؤں گا تو انھوں نے قدرے چونکتے ہوئے کہا تھا کہ تُو ابھی سے کیسے ریٹائر ہو گیا! میرے سامنے تو ابھی بھی وہ منظر ہے کہ تُو مچل رہا ہے اور میں اُنگلی پکڑے تجھے مدرسے لے جا رہا ہوں اور پھر اس کے بعد ان کا گلا کچھ رندھ سا گیا تھا اور انھوں نے روتے ہوئے ریسور رکھ دیا تھا۔ ادھر میں بھی بے قابو ہو کر رونے لگا تھا۔ بقول جگر مرادآبادی۔

ادھر سے بھی سوا ہے کچھ اُدھر کی مجبوری!
کہ ہم نے آہ کی تو، اُن سے آہ بھی نہ ہوئی !!

اس کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ یہ اُن سے میرا آخری رابطہ تھا۔

بھائی کے انتقال کی خبر سن کر میں نے دل شکستگی کے عالم میں پاکستان جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا۔ میں ڈرپوک تھا، ڈرتا تھا کہ کس طرح بیوہ بھابی اور یتیم بھتیجوں کے افسردہ چہرے دیکھ سکوں گا!، کیا کہہ کر ان کو دلاسا دے سکوں گا!!۔ بھائی کے انتقال سے میں تو خود ٹوٹ چکا تھا، مجھے تو خود سہارے کی ضرورت تھی۔ پھر کس طرح دوسروں کو سہارا دے سکوں گا!!! ——— میں بچپن میں ہی نعمتِ پدری سے محروم ہو گیا تھا۔ اس لئے دولتِ پدری کے درد سے بخوبی واقف تھا۔ وہ بھائی ہی تو تھے جنھوں نے سایۂ پدری سے مجھے مالا مال رکھا اور اللہ کے فضل وکرم سے پروان چڑھایا۔

کچھ عرصہ بعد جب پاکستان سے بھابی صاحبہ کا ٹیلیفون آیا اور میں نے اُن کو نہ آنے کا فیصلہ سنایا تو انھوں نے قدرے ڈانٹتے ہوئے، شفقت بھرے لہجے میں سمجھایا اور سوال کیا کہ کیا اپنے مرحوم بھائی کو جھوٹا ثابت کروگے؟ جنھوں نے کہا تھا کہ وہ ضرور آئے گا؟۔ پھر سوال کیا کہ کیا اپنی اولاد کے سر پر ہاتھ نہ رکھوگے؟۔ اُن کی آواز میں کرب و بے چینی تھی، شفقت تھی۔ ان کے سوالات نے ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ اسی بیچ میرے دوسرے بھائی (نمبر ۱) بھی پاکستان سے ہند تشریف لے آئے۔ انھوں نے بھی جب پاکستان چلنے کو کہا تو بالآخر میں نے انھیں کے ہمراہ پاکستان جانے کا ارادہ کر ہی لیا۔

بارِ دوم [۲]

[طباعتِ ثانی]

مجھے پوری زندگی میں، ملازمت سے سبکدوش ہوجانے کے بعد محض ایک بار ۲۰۰۱ء میں پاکستان جاکر اپنے حقیقی بہن، بھائی اور ان کے اہلِ خانہ نیز دیگر عزیز واقارب اور بستی کے مہاجر افراد سے ملاقات کرنے کا سنہرا موقع نصیب ہوا۔ اس دلچسپ سفر اور جذباتی ملن کو یادگاری بنانے کے مقصد سے احقر نے وطن واپسی پر یادوں کی بارات سجائے ''چند قدم گھر سے ....'' [ہمارے یہاں سے پہلے مزدور تک مزدوری کرنے لاہور جایا کرتے تھے۔] کے عنوان سے ایک سفر نامہ تحریر کیا جو دہلی سے ''عاکف بک ڈپو'' نے شائع کیا۔

مذکورہ سفرنامے کی وطنِ عزیز اور پاکستان میں جس طرح پذیرائی ہوئی اس سے احقر کی ہمت افزائی تو ہوئی ہی ساتھ ہی اس کے اس احساس کو بھی تقویت ملی کہ دونوں جانب کے عوام بہر صورت ایک روح دو قالب ہیں۔

احقر کے بھی پاکستانی حقیقی رشتے دار اور زیادہ تر عزیز واقارب کراچی، لاہور اور راولپنڈی، خاص کر کراچی اور لاہور میں رہتے ہیں۔ اسی لئے ان ہی دو شہروں کے ویزے حاصل کئے گئے تھے لیکن عجلت کی وجہ سے سفرنامے میں محض کراچی ہی کی تفصیل دی جانی ممکن ہو سکی تھی۔ اس پر لاہور کے اپنوں نے پیار بھرا قدر احتجاج کیا جس کو احقر نے سر آنکھوں پر قبول کرتے ہوئے ان کو یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ پہلی فرصت میں سفرنامے پر

نظرِ ثانی کرتے ہوئے اس میں لاہور کو بھی اس کے شایانِ شان شامل کر لیا جائے گا۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ کچھ تو خانگی مصروفیات اور کچھ نامکمل مسودوں [''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' (جلد اوّل تا چہارم)، ''سلطان الشہداء'' اور ''سید عبدالرحمٰن بن فضل اللہ''] کو مکمل کرنے میں اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ جلد وعدہ وفا کر سکتا اور تقریباً سات سال کا ایک طویل عرصہ شرمندگی کی نذر ہو گیا۔ یہ صفائی اس لئے دینی پڑی کہ کہیں قارئین زیرِ نظر سفرنامے کو ''باسی کڑھی میں اُبال'' کے مترادف نہ سمجھ لیں۔

یہ تکمیلِ تحریر ہے کہ سفر اور کراچی سے متعلق بھی جو چند دلچسپ اور معلوماتی احوال لکھنے سے رہ گئے تھے، اب ان کو بھی زیرِ نظر جلد میں شامل کر لیا گیا ہے اور مناسب تصاویر کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ایک حقیقت جس کا ذکر کرنا میں اوّل بار بھول گیا تھا، وہ یہ کہ ماضی میں جو پاکستانی ہندوستان آتے تھے وہ اپنے عزیز و اقارب کے لئے تحفتاً ''فلیٹ'' (کپڑے کی ایک قسم) لاتے تھے اور باقی کپڑا ہندوستان سے خرید کر لے جاتے تھے لیکن اب اس کے برعکس ہے۔ میرے بھانجے اور بھتیجوں نے مجھے جو سفاری سوٹ (احقر کو موسمِ گرماں میں سفاری سوٹ زیادہ پسند ہیں) اور پٹھانی سوٹ بنا کر دیئے ان کا کپڑا اتنا عمدہ ہے کہ وہ آج بھی (سات سال بعد) ایسے ہیں جیسے پہلے تھے۔ یہی حال جوتوں کا بھی ہے۔ جو پشاوری سینڈل مجھے سوغات میں ملا تھا، وہ آج بھی جیوں کا تیوں ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے جوتوں کے مارکیٹ پر تو کافی حد تک پاکستان نے قبضہ کر لیا ہے۔ اسی ضمن میں اکبرالہ آبادی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

بوٹ ''ڈاسن'' نے بنایا، میں نے اک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا، اور جوتا چل گیا

بہر حال وعدہ وفا کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، یعنی لاہور کی تفصیلات بھی شائع کی جا رہی ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ کراچی کی تفصیلات تو بحیثیت ایک مخبر کے پیش کی گئی تھیں اور اب لاہور کی تفصیلات بحیثیت ایک فقیر [احقر کا تعلق "چشتیہ" سلسلے کے خاندان سے ہے۔] کے پیش کی جا رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں جتنے اولیاء اللہ محو خواب ہیں اتنے شاید ہی اس برصغیر کے کسی دوسرے مقام پر ہوں گے۔ ویسے بھی لاہور کو "دار السلام" کہا گیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ احقر اتنا وقت نہیں نکال سکا کہ وہ سب اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دے سکتا۔ محض تین مزارات پر ہی فاتحہ پڑھ سکا۔ ان میں سے دو کے نام تو داتا گنج بخشؒ اور میاں میر یاد رہے جب کہ تیسرے کا نام اب ذہن سے اتر چکا ہے۔ وہ تیسرے یا تو شیخ عزیز الدین (مشہور بہ پیر مکیؒ) رہے ہیں یا پھر سید فخر الدین زنجانیؒ۔ بہرحال، ان دونوں ہی بزرگوں کے بھی حالات زندگی قلم بند کر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کاش کہ قارئین کو پسند آ جائیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہر طور مکمل، ہر خامی سے پاک، ہر غلطی سے مبرا اور ہر تنقید سے بالاتر ہے، پھر احقر کی تو بساط ہی کیا ہے"۔

آخر میں احقر ان تمام ناشرین اور مصنفین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے جن کی تصنیفات سے اس نے استفادہ کیا۔ اگر اس موقع پر وہ اپنے ان کرم فرماؤں کو فراموش کر دے جن کی مثبت تنقید اور بروقت مشوروں سے یہ "بیل منڈھے چڑھ سکی" تو یہ ان کی کم ظرفی ہوگی، یعنی اس کا اشارہ جناب نور الحسن راشد کاندھلوی (مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، مظفر نگر)، مولانا ریاست علی ظفر (استاذ دار العلوم، دیوبند، سہارن پور)، جناب ڈاکٹر الطاف حسین ندوی (سابق ریڈر، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) اور

جناب فضل الرحمٰن نجم یونی شمولہ یونی وغیرہ کی طرف ہے۔

ہر چند کہ "گھر کی مرغی دال برابر" کہی گئی ہے لیکن درحقیقت دال بھی بڑا مال ہوتا ہے۔ اب مسور کی دال کو لے لیجیے، دالوں میں سب سے زیادہ گراں ہے، شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ "یہ منہ اور مسور کی دال!"۔ اس لیے مشکور ہوں اپنے سب سے چھوٹے فرزند میاں محمد کامران سعید کا جنھوں نے انٹرنیٹ سے اہم معلومات اور تصاویر حاصل کر کے احقر تک بہم پہونچائیں۔ اللہ اس کو عمرِ خضرؑ عطا فرمائے۔ (آمین)

بابِ سوم

روانگی

میں ایک ماہ کے ارادے سے ۲۸ فروری ۲۰۰۱ء بروز بدھ بذریعہ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' (۱) شب کے تقریباً نو بجے پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن سے بھائی، بھابی وغیرہ کے ہمراہ پاکستان کے لئے روانہ ہوا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بذریعہ ٹرین آمد و رفت کا محض ''سمجھوتہ ایکسپریس'' ہی واحد ذریعہ ہے [یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے۔ اب بذریعہ ''تھار ایکسپریس'' (۲) بھی جایا جا سکتا ہے، بلکہ کراچی کے لئے تو یہ ہی زیادہ مناسب ہے۔] جو ہفتہ میں دو دن پیر اور جمعرات کو لاہور سے اور بدھ اور اتوار کو دہلی سے چلتی ہے۔ یعنی محض پیر اور جمعرات کو ہی بارڈر رکھتا ہے۔ اس میں محض ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہی سفر کرنے والے سوار ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے پاسپورٹ دکھا کر اس ٹرین کا ٹکٹ ملتا ہے۔ پہلے دہلی سے پاکستان کے کسی بھی ریلوے اسٹیشن اور لاہور سے ہندوستان کے کسی بھی ریلوے اسٹیشن تک کا ٹکٹ مل جایا کرتا تھا لیکن اب دہلی سے محض انڈین بارڈر (اٹاری ریلوے اسٹیشن) اور لاہور سے محض پاکستانی بارڈر (واہگہ ریلوے اسٹیشن) تک کا ہی ٹکٹ مل پاتا ہے۔ خدا کرے کہ پھر سے پہلے ہی جیسے قانون پر عمل ہونے لگے کیوں کہ اس میں مسافروں کو زیادہ سہولت تھی۔

ہماری ٹرین اگلے دن، یکم مارچ بروز جمعرات علی الصبح تقریباً چار بجے اٹاری ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ یہ ریلوے اسٹیشن ہندوستان کی سرحد سے ملحق آخری ہندوستانی ریلوے اسٹیشن ہے اس لئے یہ چیک پوسٹ بھی ہے۔ اسٹیشن پر دو پلیٹ فارم ہیں جو کافی لمبے چوڑے اور ریلوے کے مخصوص ڈیزائن کے مطابق Steeltruss سے Covered ہیں۔ جس پلیٹ فارم پر ہماری ٹرین جا کر رکی اس پر کافی تعداد میں Emigration اور Custom کے لئے مستقل Counters بنے ہیں جو آپس میں یکساں، خاصے فاصلے پر اور پورے پلیٹ فارم پر پھیلے ہیں اور ان پر نمبر پڑے ہیں۔ اسی پلیٹ فارم کے ایک کنارے پر ٹکٹ گھر، کرنسی تبدیل کرنے کے لئے ''اسٹیٹ بینک آف

انڈیا" کا ایک دفتر، کینٹین اور کافی تعداد میں الگ الگ زنانے اور مردانے بیت الخلاء، نیز غسل خانوں کا معقول بندوبست ہے۔ اسٹیشن نہایت صاف ستھرا اور کشادہ ہے۔ یہ نئی نئی تعمیر ہوئی ہے۔ اسٹیشن پر قلی کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ غالباً اس لئے کہ ان کی کوئی گنجائش نہ رہنے پائے' حالانکہ یہ ایک تنگ سوچ ہے۔ [سادے کپڑوں میں بہت سے لوگ یہ کام انجام دیتے ہوئے دیکھنے میں آئے۔] مسافروں کو اسٹیشن پر مہیا Luggage Carriers (ٹرالیوں) کے ذریعہ خود اپنا سامان لے جانا ہوتا ہے۔ Carriers کم ہیں اور مسافر زیادہ ہوتے ہیں اس لئے جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر آکر آہستہ ہوتی ہے تو فوراً سب لوگ Carriers حاصل کرنے کے لئے چلتی ٹرین سے کودنے لگتے ہیں۔ ان Carriers کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔

تقریباً آٹھ بجے Counters کھلے۔ سب مسافر پہلے Emigration کے لئے Counters پر قطار در قطار کھڑے ہوگئے۔ ہندوستانی اور پاکستانی شہریوں کے لئے الگ الگ کاؤنٹر ہیں۔ ہندوستانی مسافروں کی مزید سہولت کی خاطر صوبہ وار الگ الگ کاؤنٹر ہیں۔ یوپی چونکہ بڑا صوبہ ہے وہاں کے مسافروں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے اس لئے یوپی والوں کے لئے زیادہ کاؤنٹروں کا انتظام کیا ہوا ہے۔ کاؤنٹروں کے قدرے قریب ہونے سے یہ فائدہ ہے کہ ان کاموں میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

Emigration کے بعد Custom کرانا ہوتا ہے۔ Emigration کاؤنٹر ہی کسٹم کاؤنٹر کا بھی کام دیتا ہے۔ چونکہ میرا اور بھائی کا الگ الگ کاؤنٹروں پر Emigration اور کسٹم ہوا تھا (شہریت کی وجہ سے) اس لئے پہلے میں نے بھائی کے سامان کا کسٹم کرایا اور پھر اپنے کاؤنٹر پر پہنچی۔ چونکہ ہمارے پاس کوئی غیر قانونی سامان تو تھا نہیں اس لئے کسٹم ہونے میں بھی نہ تو کوئی دیر ہوئی اور نہ ہی تکلیف۔ کاؤنٹر پر

موجود عملے نے بہت خندہ پیشانی سے ہمارے سامان پر نمبر ڈال کر اسے کلیر کر دیا۔ میں نے سن رکھا تھا، اور دیکھ بھی رہا تھا کہ کسٹم کا عملہ اٹیچی، بستر بند اور بیگ وغیرہ سب کچھ کھلوا کر ایک ایک سامان دیکھتا ہے لیکن مجھے تعجب تھا کہ انھوں نے میری اٹیچی نہیں کھلوائی۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ تجربے کی بنا پر انھیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس کے پاس غیر قانونی سامان ہوگا۔ میں نے ہندی رسم الخط میں اردو شعر و شاعری کی ایک کتاب لکھی ہے (''پریتی پنچھی'')۔ میں عملے کے حسن اخلاق سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے انھیں ایک کتاب اپنے دستخط کے ساتھ نذر کی۔ ایک صاحب جو غالباً اس عملے کے افسر رہے ہوں گے، یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ فوراً لپک کر میرے پاس آئے اور معلوم کیا کہ مذکورہ کتاب ان کے عملے نے تو مجھ سے طلب نہیں کی ہے؟۔ جب میں نے ان کو پوری بات بتائی تو انھوں نے بھی اس کتاب کی سرسری طور ورق گردانی کرتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

کسٹم کے وقت میں نے دیکھا کہ لوگ اس حد تک سامان لاتے ہیں کہ ان کے دیکھنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اُن کی نیت صاف نہیں ہے۔ کسٹم کے عملے کا رویہ بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی ہوتا ہے۔

اسٹیشن پر ایک Steel Wire Mesh کا Partition دیتے ہوئے دونوں پلیٹ فارموں کو الگ کیا ہوا ہے اور ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پر جانے کے لئے دونوں کے بیچ ایک آہنی گیٹ لگا ہوا ہے۔ جب زیادہ تر مسافروں کا کسٹم ہو گیا تو گیٹ کھول دیا گیا اور مسافر پہلے پلیٹ فارم سے دوسرے پر آنے لگے۔ جب سب کا کسٹم ہو گیا اور سب دوسرے پلیٹ فارم پر آگئے تو گیٹ کو پھر سے بند کر دیا گیا۔ بعد ازاں پہلے پلیٹ فارم پر لاہور کی جانب سے مسافروں کو لے کر ٹرین آگئی۔ اب اُس پلیٹ فارم پر اُن

مسافروں کا Emigration اور کسٹم ہوتا تھا۔ مسافروں کو اتار کر وہی ٹرین اس پلیٹ فارم پر آ گئی جس پر ہم آ چکے تھے۔

جب مسافر ٹرین میں بیٹھ گئے تو وہ خراماں خراماں واہگہ کی جانب روانہ ہوئی۔ ٹرین کے ساتھ ساتھ، اس کے دونوں جانب ہندوستانی فوجی دستے کے چاق و چوبند مسلح گھوڑ سوار بھی چل رہے تھے۔ یہ بارڈر کی سرحد پر آ کر ٹرین رک گئی اور وہیں وہ گھوڑ سوار بھی رک گئے۔ جہاں ریلوے لائن سرحد کو کاٹتی ہے وہاں ایک آہنی گیٹ مقفل رہتا ہے۔ محض ٹرین کے آنے پر ہی اس کو دونوں حکومتوں کے محافظ عملے کے ارکان کھولتے ہیں۔ جب ضابطے کی کارروائی کے بعد گیٹ کھل گیا تو ٹرین پھر سے روانہ ہوئی۔ اب صرف پاکستان کا علاقہ تھا۔ سرحد سے تقریباً سو میٹر فاصلے پر پاکستان ریلوے کا آخری سٹیشن اور چیک پوسٹ، واہگہ واقع ہے۔ [اٹاری اور واہگہ کے درمیان تقریباً تین کلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ اسی درمیان، پاکستانی علاقے میں، تاریخی "اچھوگل کینال" بھی واقع ہے۔]

یہ قابلِ ذکر ہے کہ اٹاری سے واہگہ تک دونوں حکومتوں نے اپنے اپنے علاقے میں، ریلوے لائن کے دونوں جانب خاردار آہنی تار لگائے اور بچھائے ہوئے ہیں تاکہ ٹرین میں سے کوئی مسافر اتر کر فرار نہ ہو سکے یا اس بیچ کوئی شخص ٹرین میں سوار نہ ہو سکے۔ پاکستانی علاقے میں ٹرین کے ساتھ گھوڑ سوار نہیں چلتے البتہ Position لئے محافظ ضرور دکھائی پڑتے ہیں۔

ٹرین کے واہگہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچتے ہی، اس کے رکنے سے پہلے، مسافروں نے ایک بار پھر سے ٹرین سے کود کود کر Luggage Carriers حاصل کرنے کی غرض سے دوڑ لگانی شروع کر دی۔ یہاں Carriers مفت نہیں ملتے بلکہ دس روپیہ فی کیریر دینا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سب مسافر سامان سے لدے پھندے پلیٹ فارم سے

ایک ہال میں داخل ہوئے۔ اس ہال کے صدر گیٹ پر ''رینجرس'' تعینات تھے جو پاسپورٹ دیکھ کر ہی ہال میں داخل ہونے دے رہے تھے۔

یہاں ایک پُرلطف واقعہ کا ذکر کردینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہوا یہ کہ پلیٹ فارم سے گیٹ پر پاسپورٹ دکھا کر جیسے ہی میں Emigration Hall No.1 میں داخل ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچا ہو۔ میں نے مڑکر دیکھا تو ایک اجنبی شخص نے قدرے تلخ لہجے میں مجھ سے میرا پاسپورٹ طلب کیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ "Pakistan Local Intelligence Unit" سے ہے۔ میں نے جب اس سے Identity Card دکھانے کو کہا تو اس نے مزید تحکمانہ لہجے میں جواب دیا کہ اس وقت اس کے پاس I.Card نہیں ہے۔ میں اس کے لب و لہجے سے اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ میں نے بھی بغیر I.Card دکھائے اس کو اپنا پاسپورٹ دکھانے سے صاف انکار کردیا۔ قریب ہی ایک ''رینجر'' بھی کھڑا تھا جو کافی دیر تک ہم دونوں کی تکرار بغور سنتا رہا۔ پھر اس نے اس اجنبی شخص کو پنجابی میں پھٹکار لگائی۔ اس پر اس اجنبی نے اس بار اپنا لہجہ بدلتے ہوئے قدرے خوشامدانہ انداز میں پاسپورٹ چاہا۔ اس بار میں نے اس کو اپنا پاسپورٹ دے دیا۔ اس کے بعد اس نے سوال و جواب کا ایک سلسلہ شروع کردیا۔ پہلے پوچھا کہ آپ لاہور میں کہاں جائیں گے؟۔ میں نے جواب دیا کہ پہلی بار آیا ہوں مجھے پتہ زبانی معلوم نہیں، جو بھی ہے وہ پاسپورٹ میں لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد اس نے سوال کیا کہ آپ کا نام کیا ہے؟۔ میں نے قدرے ہنس کر جواب دیا کہ پاسپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک کاغذ پر اردو میں میرا نام نوٹ کیا۔ اپنے نام کا املا دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ اس بار میں نے سوال کیا کہ آپ کی Qualification کیا ہے؟۔ اس نے جواب دیا کہ Graduate۔ میں نے پھر

سوال کیا کہ آپ کی مادری اور قومی زبانیں کیا ہیں؟۔اس نے جواب دیا کہ مادری زبان پنجابی اور قومی زبان اردو ہیں۔اس پر میں نے قدرے چٹکی لیتے ہوئے کہا کہ قومی زبان اردو ہوتے ہوئے بھی آپ اردو میں صحیح صحیح نام نہیں لکھ سکتے، یہ ہے آپ کی علمی استعداد!!۔ [اس نے میرے نام کا املا کی الدین لکھا تھا۔] ''رینجر'' جو ابھی تک ہماری باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا، نے ایک کھسیانی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''صاحب! ہم لوگ پنجابی ہیں، بولتے ضرور کا چو ہیں لیکن لکھتے چا تو ہی ہیں۔'' میں نے جواب دیا کہ محترم! بات لکھنے کی ہے، بولنے کی نہیں، یہ تو ایسی ہی ہوا ''مارے گھٹنا اور پھوٹے آنکھ''۔ [یہ ان کے جھینپ تارنے کی بات تھی ورنہ مسئلہ بولنے کا نہیں بلکہ املے (لکھنے) کا تھا۔] اس کے بعد وہ دونوں ایک طرف کو چلے گئے اور میں Emigration کے لئے لائن میں لگ گیا۔

اس ہال کے اندر، آگے کے حصہ میں میزیں ڈال کر ایک ہی جگہ عارضی Emigration Counters بنے ہوئے تھے۔ان کے سامنے Steel Barricading کی ہوئی تھی جن میں مسافروں کو لائن میں لگ کر Emigration کرانا تھا۔ہال کی گنجائش مسافروں کی تعداد کے لحاظ سے بہت محدود ہے جس کی وجہ سے لمبی لمبی قطاریں لگانی پڑتی ہیں اور ان قطاروں کا صحیح طریقہ سے قائم رہنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ایسے میں لاغر اور ضعیف مسافروں کو خوب دھکے کھانے پڑتے ہیں۔بس وہ انسانی ریلے کے سامنے فٹ بال بن کر رہ جاتے ہیں۔انڈین چیک پوسٹ کی طرح یہاں بھی پاکستانی اور ہندوستانی شہریت رکھنے والے مسافروں کی الگ الگ قطاریں لگتی ہیں۔ جگہ کی تنگی اور انسانی سیلاب کی وجہ سے گھٹن کا سا ماحول رہتا ہے۔ میں نے تو توبہ کی کہ آئندہ پاکستان آنے سے پیشتر ہزار بار سوچوں گا یا پھر بس یا ہوائی جہاز سے سفر کروں گا۔

خدا خدا کر کے Emigration سے نمٹے۔اس کے بعد اُس ہال سے

دوسرے ہال میں سامان کے ساتھ جانا پڑا جہاں پہلے مشین اور پھر انسانی نگاہوں سے سامان کا کسٹم کرانا تھا۔ ہمارے پاس چونکہ کوئی غیر قانونی سامان تھا نہیں اس لئے ان مراحل سے بھی باعزت طریقہ سے گزر گئے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مشین سے سامان کا اسکریننگ (Screening) کرانے کے بعد جب ہم کسٹم حکام کے پاس سامان لے کر آگے بڑھے تو حکام نے پہلے تو اوپر سے نیچے تک ہمارا بغور جائزہ لیا اور پھر مسکراتے ہوئے قدرے ہمدردانہ لہجے میں بنا سامان کھولے ہمیں آگے بڑھا دیا۔ آگے ''رینجرس'' کی ایک ٹیم بھی سامان کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو انھوں نے بھی ایک طائرانہ نگاہ ہم پر ڈال کر بنا سامان کھولے ہمیں آگے جانے دیا۔ کچھ دور آگے بڑھ کر ہم نے ٹکٹ خریدے اور پھر پلیٹ فارم پر موجود پاکستانی ٹرین میں جا کر بیٹھ گئے۔

پاکستان میں ''رینجرس'' (Rangers)، پولس اور کسٹم کے عملے کی بالترتیب ہلکے ہرے رنگ کی قمیض یا کرتا اور اس پر گہرے ہرے رنگ کی پتلون یا شلوار، سلیٹی رنگ کی قمیض یا کرتا اور اس پر گہرے رنگ کی پتلون یا شلوار اور سفید رنگ کی ڈریس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سے ملٹری برسرِ اقتدار آئی ہے [یہ سنہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے۔] سب اپنی اپنی Proper ڈریس میں رہتے ہیں جس سے Disciplin کی غمازی ہوتی ہے۔ Disciplin ایک اچھی چیز ہے۔ [اب پاکستان میں بھی جمہوری دور ہے۔]

جب سب مسافروں کا کسٹم ہو گیا اور وہ ٹرین میں آ کر بیٹھ گئے تب کہیں ٹرین لاہور کی سمت پٹریوں پر دوڑی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہلے ہی سے عزیز و اقرب موجود تھے۔ پہلی بار جب ان سے ملاقات ہوئی تو من میں ایک تلاطم سا برپا ہو گیا اور آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگ گئی۔

لاہور سے ہم دوسری ٹرین سے کراچی کی سمت روانہ ہوئے۔

جب تک ٹرین صوبہ پنجاب کی حدود میں چلتی رہی، ہریالی دکھائی دیتی رہی اس کے بعد صوبہ سندھ میں جیسے جیسے ہم کراچی کے نزدیک ہوتے گئے، ہریالی بھی بتدریج غائب ہوتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کراچی پہنچتے پہنچتے ریت اور گرد و غبار سے ہماری صورتیں اتنی بگڑ گئیں کہ خود کو ہی پہچاننا مشکل ہو گیا۔

بالآخر لاہور سے روانہ ہو کر ہم اگلے دن کراچی پہنچے۔ لاہور کی طرح یہاں بھی ریلوے اسٹیشن پر بہت سے صورت آشنا و نا آشنا عزیز پہلے ہی سے خوش آمدید کہنے کو موجود تھے۔ سب سے بغلگیر ہوا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بار بار رومال کا سہارا لیتا رہا۔ اسٹیشن سے پورا قافلہ بھائی صاحب (نمبرا۔ جن کے ہمراہ میں آیا تھا) کے گھر پہنچا۔ منہ ہاتھ دھو کر فوراً ہی پولس ہیڈ کوارٹر جا کر آمد لکھائی۔ پولس ہیڈ کوارٹر پر بھی سرکاری عملہ بہت اخلاق سے پیش آیا اور عزت و احترام سے بٹھا کر ضابطے کی کارروائی مکمل کی۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں ملٹری حکومت ہونے سے ''رینجرس'' کا سبھی محکموں میں عمل دخل ہے۔ [یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے۔] اس سے عوام نے راحت کا سانس لیا ہے۔ ورنہ کہتے ہیں کہ دیگر عملہ کھلے بندوں بھتہ [ہندوستان میں یہ ''سوئیدھا شلک'' (آسانی بہم پہنچانے والی فیس) کہلاتا ہے] وصولتا تھا۔ [اب جمہوری دور میں یہ حال ہے، یہ معلوم نہیں۔]

حواشی

(۱) **''سمجھوتہ ایکسپریس''** = یہ دہلی سے لاہور کے درمیاں ہفتہ میں دو بار [دہلی سے اٹاری (ہندوستانی علاقے میں) اور واگھہ سے لاہور (پاکستانی علاقے میں)] چلنے والی

ایک دوستانہ ٹرین ہے۔ حال ہی میں چلائی گئی ''تھار ایکسپریس'' (۲) سے پہلے یہ دونوں ممالک کے درمیان چلنے والی واحد ٹرین تھی۔ اس کی شروعات ۲۲ ؍جولائی ۱۹۷۶ء سے ''شملہ معاہدہ'' میں طے شدہ خطوط پر ہوئی۔ پہلے یہ امرتسر اور لاہور (۴۲ کلومیٹر کا فاصلہ) کے بیچ چلائی گئی تھی لیکن ۱۹۸۰ء کے عشرہ میں پنجاب میں ہوئی بدامنی کے پیش نظر انڈین ریلوے نے اس کو امرتسر کی بجائے اٹاری تک کر دیا تھا اور ۱۴؍اپریل ۲۰۰۰ء کو انڈین ریلوے (IR) اور پاکستانی ریلوے (PR) کے درمیان ہوئے معاہدے کی رو سے ۴۲ کلومیٹر کا فاصلہ Revise کر کے تین کلومیٹر کے اندر اندر [اٹاری سے واہگہ] کر دیا گیا۔

شروع میں یہ روزانہ چلتی تھی لیکن ۱۹۹۴ء سے اس کو ہفتہ میں دو بار (Bi-weekly) کر دیا گیا اور پہلے جو rakes اسی دن اس کے ملک کو واپس کرائے جاتے تھے وہ ۲۰۰۰ء سے اگلے دن واپس کئے جانے لگے۔ اس کے علاوہ شروع میں ایک ہی rakes دہلی اور لاہور کے درمیان چلائی جاتی تھیں لیکن بعد میں انڈین ریلوے کے rakes واہگہ (پاکستان) اسٹیشن پر اور پاک ریلوے کے rakes اٹاری (ہندوستان) اسٹیشن پر روکے جانے لگے، یعنی مسافروں کو ان دونوں اسٹیشنوں پر rakes تبدیل کئے جانے پڑنے لگے۔ ہندوستانی اور پاکستانی rakes اور انجن لگاتار چھ ماہ تک کے عرصے کے لئے alternately استعمال کئے جاتے ہیں۔ ٹرین میں عموماً چار سے آٹھ coaches ہوتے ہیں۔ پاکستانی rakes جن میں Alco DL-543 کلاس ALU20 ڈیزل لوکو (لاہور شیڈ) لگا ہوتا ہے، کا رنگ گہرا سبز ہوتا ہے۔

دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کی حالت میں کئی بار یہ سروس منقطع بھی کی گئی۔ ایک بار یکم جنوری ۲۰۰۲ء سے ۱۵؍جنوری ۲۰۰۴ء تک جب دہشت گردوں نے ۱۳؍دسمبر ۲۰۰۱ء کو ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ کیا۔ دوسری بار احتیاطاً جب ۲۷؍دسمبر ۲۰۰۷ء کو دہشت گردوں نے بے نظیر بھٹو کو قتل کیا اور تیسری بار ۱۹؍فروری ۲۰۰۷ء کو علی الصبح پانی پت کے قریب واقع دیوانہ ریلوے اسٹیشن (ہندوستان) پر دہشت گردوں کے اس میں آگ لگا دینے کے

سبب۔ اس سانحہ میں ۶۸ افراد (پاکستانی مسافر اور ہندوستانی حفاظتی عملے کے افراد) جاں بحق اور سینکڑوں زخمی ہوئے تھے۔ پہلے تو ہندوستانی خفیہ ایجنسی نے اس کا الزام "S.MI" کے نام پر صفدر ناگوری وغیرہ (مسلمانوں) پر لگایا لیکن بعد میں جب مہاراشٹر ''دہشت گردی مخالف دستے'' (ATS) نے مالیگاؤں بم دھماکوں کے سلسلے میں پرگیہ سنگھ ٹھاکر (سادھوی)، لیفٹیننٹ کرنل شری کانت پروہت اور امرتانند سرسوتی مہاراج وغیرہ کو پکڑ کر ان سے معلومات کیں تو راز فاش ہو چلا تھا کہ اس میں پروہت کا ہاتھ تھا لیکن بدقسمتی سے ۲۶ رنومبر ۲۰۰۸ء کو جب دہشت گردوں نے ممبئی میں ''تاج ہوٹل''، ''اوبرائے ہوٹل'' اور ''نریمن ہاؤس'' وغیرہ پر حملے کیے تو ATS کے اُن افسران جو مالیگاؤں سانحہ کی تفتیش میں ایمانداری سے لگے ہوئے تھے، کو شہید کر دیا گیا۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ ہیمنت کرکرے (ATS چیف) کو مستقل ''ہندو دہشت گرد'' تنظیموں کی جانب سے قتل اور گھر کو اڑا دینے کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ [مزید تفصیلات ص ۱۳۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔]

(۲) **''تھار ایکسپریس''** = یہ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' کی طرح، بھگت کی کوٹھی جودھ پور (ہندوستان) اور کراچی (پاکستان) کے درمیان چلنے والی ایک دوستانہ ٹرین ہے۔ اٹاری اور واگھہ کی طرح، موناباؤ (Munabao) اور کھوکھراپار (Khokhrapar) جو آپس میں چھ کلومیٹر فاصلے سے واقع ہیں، بالترتیب ہندوستان اور پاکستان کے علاقوں میں واقع سرحدی ریلوے اسٹیشن ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی ہند۔پاک جنگ کے دوران بمباری کی وجہ سے یہ track تباہ ہو گیا تھا۔ پھر سے رشتے استوار کرنے کی غرض سے دونوں ممالک کے اربابِ اقتدار نے جو متعدد ذرائع اختیار کیے انھیں میں سے ایک ۴۰ سال بعد ۱۸ رفروری ۲۰۰۶ء سے اس رابطے کا بھی بحال کیا جانا ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان زیادہ تر سفر کرنے والوں کا تعلق پاکستان کے کراچی، لاہور اور راولپنڈی، بالخصوص کراچی اور لاہور شہروں سے ہے۔ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' سے لاہور جانا تو بہت آسان ہے۔ [لاہور کے بالکل سرحد پر واقع ہونے کی

وجہ سے] لیکن اس سے کراچی کا سفر بہت تکلیف دہ ہے۔[کراچی کے لاہور سے بہت دور ہونے کی وجہ سے] جب کہ ''تھار ایکسپریس'' سے معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خدا کرے کہ اس کو کسی دہشت گردی کی نظر نہ لگے اور یہ بحال رہے۔ نیز مزید اخوت و بھائی چارے کی علامت بنی رہے۔ (آمین)

باب چہارم

کراچی

کینٹ ریلوے اسٹیشن، کراچی

[۱] جغرافیائی پس منظر

میں چونکہ ایک انجینیر ہوں اس لئے میں نے اسی زاویے سے کراچی کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ کراچی 24°-45'-12" تا 25°-39'-03" شمالی عرض البلد اور 66°-39'-12" تا 67°-35'-30" مشرق طول البلد کے درمیان واقع دنیا کا بانیسواں ایک بڑا بین الاقوامی شہر ہے۔ اس کے شمال۔مشرق میں ضلع دادو، مشرق میں ضلع ٹھٹھہ، جنوب میں بحیرۂ عرب اور دریائے سندھ کے طاس کی کھاڑیاں (Creeks) واقع ہیں۔

[۲] تاریخی پس منظر

جہاں اس وقت کراچی آباد ہے وہاں کافی پہلے ایک ویرانہ ہوا کرتا تھا اور مچھیروں کی چند جھونپڑیاں تھیں۔ وہ اس کو ڈربو کہتے تھے۔ ڈربو اصل میں درب یا الدرب کا بگڑا ہوا نام ہے۔ درب یا الدرب عربی میں راستے کو کہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کافی پہلے سے عرب جہاز رانوں کا آنا جانا رہا ہے اور انھوں نے ہی اس کو یہ نام دیا ہوگا۔ اس بستی کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا تالاب تھا جو ایک مچھیرے، کلاچی کے نام پر کلاچی کنوں کہلاتا تھا۔ [کنوں، گہرے گڑھے کو کہتے ہیں۔]

موجودہ کراچی بندرگاہ سے تقریباً چالیس کلومیٹر مغرب میں، حب ندی کے دہانے پر، بحرالعرب میں سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں کھڑک بندرگاہ کے نام سے ایک اہم بندرگاہ تھا۔ ۱۱۴۱-۴۲ھ (۱۷۲۸-۲۹ء) میں جب تیز بارش، طوفانی ہواؤں اور سمندری موجوں کے سبب اس بندرگاہ کا دہانہ ریت سے پٹ گیا تو اُس پر آباد لوگوں نے مذکورہ بالا قدرتی بندرگاہ کو اپنا مسکن بنالیا اور اُس کو کلاچی

جو گوٹھ کے نام سے پکارنے لگے۔ اس طرح موجودہ کراچی بندرگاہ کا سنگ بنیاد ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) میں رکھا گیا۔

مچھیروں کی اس چھوٹی سی بستی نے آگے چل کر بہت سے۔ رنجی، سیاسی اور اقتصادی بحران دیکھے۔ کبھی اس پر کلہوڑوں کا قبضہ رہا جن کا سلسلۂ نسب کہتے ہیں کہ عباسیوں سے ملتا تھا اور جن کا حکمران نہایت منصف مزاج اور شریعت اسلامیہ کا پابند تھا۔ اس کے بعد ''خان آف قلات'' کی حکمرانی رہی لیکن جلد ہی ''تالپوروں'' (بلوچیوں) نے اس پر قبضہ کر لیا ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) سے ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) تک یہ ''تالپوروں'' کے قبضہ میں رہا۔

''میران تالپور'' کے زمانہ میں اس بستی نے خوب ترقی کی۔ انھوں نے منوڑا جزیرے پر ایک قلعہ تعمیر کرایا اور اس کی فصیلوں پر توپیں نصب کرائیں۔ بعد میں بندرگاہ کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی نگاہوں میں آ گیا۔ چنانچہ ''کمپنی'' نے ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) اور پھر ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں ''میران سندھ'' سے مختلف معاہدے کئے جو بظاہر دوستانہ اور درپردہ معاندانہ تھے۔ ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ [تفصیل لاہور کے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔] نے سندھ پر حملہ کیا تو ''میران سندھ'' نے کمپنی سے مدد طلب کی۔ کمپنی پہلے ہی سے موقع کی تلاش میں تھی۔ غرضیکہ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں دونوں کے مابین ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے کمپنی کو حیدرآباد (سندھ) میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ بعد میں، ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں کراچی اور ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں سندھ پر بھی کمپنی کا قبضہ ہو گیا۔ اُس نے سندھ کا صدر مقام حیدرآباد سے کراچی منتقل کرتے ہوئے سندھ کو بمبئی پریسیڈنسی کا حصہ بنا دیا۔ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں سندھ کو کمشنری کا درجہ دے دیا گیا لیکن اس کو صوبہ بمبئی کے ہی تحت رکھا گیا۔ ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں سندھ کو الگ ایک صوبہ کا درجہ دیتے ہوئے

اسے بمبئی سے الگ کر دیا گیا۔ اس کے بعد کراچی آزادی ملنے تک کئی ادوار سے گزرا۔
آزادی سے پہلے کے کراچی کو موٹے طور پر مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے کی آبادی والا علاقہ اور اُس سے ملحق وہ علاقہ جو انگریزوں کی آمد کے بعد آباد ہوا۔ اُن علاقوں میں گھنی آبادی، تنگ گلیاں اور Wholesale مارکیٹ تھی۔ ان میں کافی تعداد میں مساجد، مندر اور دھرم شالائیں بھی تھیں۔

۲۔ صدر بازار، جو انگریزوں کے لئے خرید و فروخت کا مرکز تھا۔ اس علاقے میں پارسیوں اور یورپین کی آبادی اور تجارت تھی۔ اس میں سڑکیں عمدہ اور کشادہ تھیں۔ بازار میں چرچ، مشنری اسکول اور دیگر اہم عمارتیں تھیں جن کے مالک یورپین تھے۔

صدر بازار کے جنوب۔ مشرق میں سول لائن اور ملٹری چھاؤنی کا علاقہ تھا جہاں انگریزوں کے کلب اور ان کے رہائشی مکانات واقع تھے۔

۳۔ مندرجہ بالا دونوں علاقوں کے درمیان میں واقع وہ علاقہ جس میں انتظامی امور سے متعلق عمارتیں اور اسکول وغیرہ تھے۔

۴۔ لیاری اور دوسرا وہ علاقہ جس میں Working Class رہتی تھی۔

اُس وقت کراچی کی آبادی ۵۰،۰۰۰،۴ تھی جن میں سے ۶۱.۲ فی صد سندھی بولنے والے اور ۶.۳ فی صدی ہندی یا اردو بولنے والے رہتے تھے۔ اُن میں ہندوؤں کی تعداد ۵۱ فی صدی اور مسلمانوں کی تعداد ۴۲ فی صدی تھی۔

کراچی شہر کے مغربی حصہ میں زمین کے ایسے متعدد بڑے بڑے قطعات تھے جن پر نمک کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ کراچی کے شہری اس نمک کو اکٹھا کر کے نہ صرف اپنی ضروریات پوری کرتے تھے بلکہ اُسے دوسرے شہروں کو بھی بھیجتے تھے۔

نمک کے علاوہ کراچی بندرگاہ سے تیل کے بیج، غلہ، کپاس، اُون بھی Export ہوتی تھی اور بنی بنائی مصنوعات کراچی کی بندرگاہ پر اترتی تھیں۔ ان میں دھاتیں، ریشم اور شکر وغیرہ شامل تھیں۔

[۳] ترقیاتی پس منظر

ترقیاتی کاموں (Developmental Works) کا Rate of Population Growth، سیاسی استحکام اور معیشت سے سیدھا تعلق ہوتا ہے۔ پہلے Factor، یعنی Rate of Population Growth کے بارے میں جو آگے تفصیل دی گئی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مختلف وجوہات سے کراچی میں بہت زیادہ رہا ہے۔ سیاسی استحکام اور معیشت کے بارے میں سب کو علم ہے ہی۔ لہٰذا ان پر تبصرہ کرنا میں غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ پاکستان میں وقتاً فوقتاً فوجی انقلابات آتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں بہت جلدی جلدی حکومتیں بدلتی رہی ہیں جن کا ترقیاتی کاموں پر اثر پڑنا فطری بات ہے۔ دراصل ہر شخص، ہر گروپ کا اپنا ایک الگ نظریہ، نقطۂ نظر یا منصوبہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کو اپنے منصوبے کو مکمل کرنے کے لئے مناسب عرصہ نہ ملے تو اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ کراچی کے بارے میں بھی ہوا۔ کراچی کے حق میں کون سا دور کیسا رہا، اس کا تجزیہ کر لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آزادی کے بعد کراچی کو Develop کرنے کی سب سے پہلی کوشش ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۲ء) میں کی گئی۔ اس سلسلے میں ایک ''سویڈش'' (Swedish) کمپنی نے ایک پلان تیار کیا۔ اس کے مطابق مرکزی سیکریٹریٹ، ریلوے نظام، Legislative عمارات، ایک یونیورسٹی، مہاجرین کی آبادکاری کے لئے لیاری ندی کے کنارے دس منزلہ

عمارتوں وغیرہ کا منصوبہ تیار کیا گیا لیکن ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۳ء) میں طلباء کا ہنگامہ ہوا جس کی وجہ سے محض ایک سال میں ہی حکومت گر گئی اور اس طرح یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

۱۳۷۸ھ (۱۹۵۸ء) سے ۱۳۸۹ھ (۱۹۶۹ء) کے دوران ایک فوجی انقلاب کے ذریعہ جنرل ایوب خاں برسر اقتدار رہے۔ انھوں نے سپریم کورٹ، مرکزی پارلیمنٹ، سفارت خانے اور دوسرے مرکزی دفاتر کراچی سے اسلام آباد (۱) منتقل کرتے ہوئے کراچی کی بجائے اسلام آباد کو پاکستان کا دارالخلافہ بنا دیا، اور اس طرح کراچی محض صوبۂ سندھ کا ہی صدر مقام ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے ایک "گریک" پلانر کے ذریعہ "Greater Karachi Resettlement Plan" تیار کرایا جس کے لحاظ سے دو "Setellite Towns" Develop کرنے تھے، ایک لانڈھی۔ کورنگی، شہر کے مشرق میں اور دوسرا نیو کراچی، شہر کے شمال میں۔ یہ شہر سے ۲۵ کلومیٹر فاصلہ پر تھے۔ یہ منصوبہ بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا اور بالآخر ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴ء) میں اس کو ترک کرنا پڑا۔

ایوب خاں کے دور حکومت سے پہلے کراچی میں تمام Transport Companies پر سندھیوں، بلوچیوں اور مہاجرین کی اجارہ داری تھی۔ بڑے بڑے سرکاری Projects کا ٹھیکہ بھی سندھیوں اور بلوچیوں کے ہی پاس تھا۔ ایوب خاں نے اپنے دور میں صوبہ سرحد کے پٹھانوں کو زیادہ اہمیت دی۔ نتیجتاً بھی Ethnic چپقلش کو بڑھاوا ملا۔ اس کے علاوہ ایوب خاں نے جب National Language، جو اردو تھی، کے حق میں سندھی پریس اور Publications کو بند کرانا شروع کیا تو اردو بولنے والوں نے اُس کی تائید وحمایت کی۔ اس سے پورا سندھ اردو بولنے والے اور سندھی بولنے والے، دو خیموں میں منقسم ہو کر رہ گیا۔

جنرل ایوب خاں کے بعد، ۱۳۸۹ھ (۱۹۶۹ء) (۲) میں جنرل یحیی خاں برسر

اقتدار آئے۔ موصوف کے کارناموں کے بارے میں تو آج کل (۲۰۰۰ء میں) پاکستانی اخبارات میں کافی تفصیلات آرہی ہیں۔ اخبارات میں شائع اطلاعات کے مطابق ان کو تو ''تھری ڈبلیو'' سے ہی فرصت نہیں تھی۔ [واللہ عالم بالصواب] اگر یہ صحیح ہے، تو ایک اسلامی مملکت کا سربراہ اور اس کا یہ کردار، سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

۱۳۹۱ھ (۱۹۷۱ء) سے ۱۳۹۸ھ (۱۹۷۷ء) تک جناب ذو الفقار علی بھٹو برسرِ اقتدار رہے۔ انھوں نے خود کو ایک طرف تو کچی آبادی کے مکینوں کے مسیحا کے روپ میں پیش کیا اور دوسری جانب سندھی بولنے والے Masses کے حق میں سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں کوٹا سسٹم رائج کیا۔ اس سے اردو بولنے والوں (مہاجرین) اور سندھی بولنے والوں کے بیچ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوگئی۔ اس کے علاوہ اس نے Gulf States کو کراچی کی طرف راغب کرنے کی غرض سے کراچی میں ''ریس کورس''، ''فائیو اسٹار ہوٹلس''، ''کیبر یٹس'' (Cabarets) اور ''کیسینوز'' (Casinos) وغیرہ کا منصوبہ تیار کرایا اور ان میں سے کچھ پر عمل درآمد بھی کرایا گیا۔ اس نے Building-by-Laws میں بھی ترمیمات کرائیں جس سے مکانات کی اونچائی اور Covered Area میں مزید اضافہ کیا جاسکے۔ اس سے ''فلیٹ کلچر'' نے جنم لیا اور آبادی میں Congestion بڑھا۔ ساتھ ہی Horizontal کی بجائے Vertical Development کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انھیں کے دورِ حکومت میں پاکستانی مزدوروں، Professionals اور Entrepreneurs کو گلف اسٹیٹس میں جانے کا بڑھاوا ملا جنھوں نے جب اپنا سرمایہ پاکستان بھیجا تو اُن کے لواحقین نے اس کو زیادہ تر مکانات تعمیر کرنے پر خرچ کیا یہاں تک کہ کھلی جگہوں پر بھی قبضے کر لئے گئے۔ صدر بازار سے ملحق علاقوں میں جو مکانات گرادیے گئے تھے ان کی بھی پھر سے تعمیر ہوگئی۔

۱۳۹۹ھ (۱۹۷۸ء) سے ۱۴۰۹ھ (۱۹۸۸ء) تک ایک فوجی انقلاب کے

ذریعہ جرنیل ضیاء الحق برسرِ اقتدار رہے۔ ان کے دور میں افغانستان میں خانہ جنگی کی وجہ سے کراچی میں سستے داموں اسلحہ اور منشیات کا دھندہ خوب پنپا اور یہی آبادی میں مزید اضافہ ہوا۔ ۱۴۰۸ھ (۱۹۸۷ء) سے ۱۴۱۸ھ (۱۹۹۷ء) کے عرصہ میں ایم۔کیو۔ایم (مہاجر قومی موومینٹ) ایک زبردست طاقت کی شکل میں برسرِ اقتدار رہی۔ اس عرصہ میں سیاسی نقطۂ نگاہ سے سرکاری محکموں میں ملازمتیں، ٹھیکے، Consultancies، تعلیمی اداروں میں داخلے اور تجارتی پرمٹ جاری کیے گئے۔ سرکاری سیکٹر میں ہزاروں کی تعداد میں بنا ضرورت بھرتیاں کی گئیں، مثلاً "Karachi Water & Sewerage Board" (KWSB) جہاں محض ۶،۰۰۰ عملہ کی ضرورت تھی میں ۱۲،۵۰۰ کا عملہ رکھا گیا۔ یہی حالت (KMC) "Karachi Municipal Corporation" اور ''پاکستان اسٹیل ملس'' کی بھی رہی۔ نتیجتاً ادارے دیوالیہ پن کے دہانے تک پہنچ گئے۔ "MQM" کے غلبے (Domination) کا سندھیوں، پٹھانوں، پنجابیوں اور بلوچیوں پر یہ اثر پڑا کہ الیکشن میں جہاں مہاجرین نے "MQM" کو ووٹ دیے وہیں سندھیوں اور بلوچیوں نے ''پاکستان پیپلس پارٹی'' (PPP) کو، پختونوں نے ''عوامی نیشنل پارٹی'' (ANP) کو اور پنجابیوں نے ''مسلم لیگ'' کو ووٹ دیے۔ اس سے باہمی اعتماد کی فضا کو ٹھیس پہنچی اور Ethnic دوریاں بڑھیں۔ بعد میں "MQM" بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی اور پھر اقتدار کی رسہ کشی میں دونوں کے درمیان خوب جم کر خوں ریز تصادم ہوئے۔ منشیات اور غیر قانونی اسلحے نے اس آگ میں گھی کا کام کیا۔

۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) سے ۱۴۰۶ھ (۱۹۸۵ء) کے عرصہ سے متعلق "Karachi Master Plan" کی میعاد کے خاتمہ کے بعد ''کراچی ڈیولپمینٹ اتھارٹی'' (KDA) نے UNDP کی مدد سے "Karachi Develop Plan 2000" شروع کیا جو ۱۴۱۱ھ (۱۹۹۰ء) میں اختتام پذیر ہو جانا تھا لیکن اس کا بھی سابقہ

دیگر Plans جیسا ہی حشر ہوا۔ یہاں یہ قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے یہاں ہندوستان میں ''ٹیکنوکریٹس'' (Technocrates) کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کو انتظامیہ کے مقابلے میں کم تر درجہ کا Treat کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک تحصیل دار بھی خود کو ایک اسسٹینٹ انجینیر (Assistant Engineer) حتیٰ کہ ایگزیکیٹیو انجینیر (Executive Engineer) اور چیف میڈیکل آفیسر سے Superior سمجھتا ہے ور اپنی سی کوشش کرتا ہے کہ یہ افسران اس کی میٹنگ میں حصہ لیں۔ ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جو کلکٹر کہلانا کسرِ شان سمجھتا ہے) Technical Matters میں بھی یک لیکھپال (پٹواری) کی رپورٹ کو Qualified Technical Hands کی رپورٹ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ (۲) غرضیکہ یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ مختلف محکموں میں کون سا افسر کس کے برابر ہے۔ پاکستان میں سب کے Grades مقرر کیے ہوئے ہیں اور میٹنگ بلاتے وقت اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ کارنامہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا تھا۔ اس سے ''ٹیکنوکریٹس'' کی ذہنی الجھنوں کا کسی حد تک ازالہ ہو جاتا ہے۔ کاش کہ ہمارے ملک میں بھی یہ دستور رائج ہو جائے۔ اچھائی کسی کی ملکیت نہیں ہوتی، جو بھی اس کو اپنا لے اسی کی ہوتی ہے۔

حواشی

(۱) اسلام آباد = یہ پاکستانی ساحلِ سمندر سے تقریباً ۱۲۰۰ کلومیٹر اندر، راولپنڈی شہر سے ملحق، ملک (پاکستان) کے شمالی حصے میں واقع "Potohar Plateau" پر بنا خوشنما ''مارگلا'' (Margalla) پہاڑیوں کے درمیان واقع ایک Well Planned، موڈرن اور نہایت خوبصورت شہر ہے جس کا تعمیراتی کام ۱۹۶۰ء سے شروع کیا گیا۔ اس کا ماسٹر پلان ایک گریک Architect فرم "Doxiadis Associates" نے تیار

کیا تھا۔ یہ آٹھ Zones میں منقسم ہے، جیسے سفارتی (Diplomatic) انکلیو، تجارتی (Commercial) زون، تعلیمی (Educational) سیکٹر، صنعتی (Industrial) سیکٹر وغیرہ وغیرہ۔

اس کی پلاننگ اور تعمیراتی کام جنرل ایوب خاں کے دور حکومت میں ہوا۔ وہی کراچی سے پہلے راولپنڈی اور پھر یہاں دارالخلافہ لائے جس کی وجہ کراچی کے ساحل سمندر پر واقع ہونے کے سبب اس کے دشمن کے جہازی بیڑے کی زد میں رہنے کی رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ راولپنڈی، جو آرمی کا جنرل ہیڈ کوارٹر ہے، سے ملحق بھی ہے اور اسی سبب دونوں شہروں کو Twin Cities کہا جاتا ہے۔

(۲) ایک لطیفہ یاد آیا۔ ۱۹۹۲ء میں میں دیوریا میں تعینات تھا۔ اس سال موسم باراں میں بھی بارش نہیں ہوئی اور سخت سوکھا پڑ گیا۔ ایک دن صبح کو سوکھے سے متعلق میٹنگ ہونی تھی لیکن اچانک اس رات بارش ہوگئی جس سے وہ میٹنگ سوکھے سے باڑھ (سیلاب) میں تبدیل ہوگئی۔ میٹنگ کے دوران ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا کہ انجینیر صاحب! رات کتنی بارش ہوئی؟۔ میں نے بتا دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک صاحب جو میرے ہی پاس بیٹھے ہوئے تھے، کھڑے ہوئے اور انھوں نے مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے دوسری figure بتائی۔ اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے قدرِ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھا۔ میں ان صاحب کو نہیں جانتا تھا۔ جب میں نے ان صاحب سے پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ تحصیلدار ہیں۔ اب تو میرے تعجب اور غصے کی کوئی انتہا نہ رہی [ایک ٹیکنیکل معاملہ میں بے جا مداخلت پر]۔ میں نے ان سے سوال کیا "آپ نے جو figure بتائی ہے، وہ کس Rain gauge اسٹیشن کی ہے؟" انھوں نے چونک کر پوچھا "یہ Rain gauge اسٹیشن کیا ہوتا ہے؟" میں معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ قدرِ چٹکی لیتے ہوئے میں نے پھر سوال کیا "آپ نے یہ کیسے پتہ لگالیا کہ کتنی بارش ہوئی ہے؟" اس پر وہ کچھ اس انداز سے مسکرائے گویا میں نے کوئی بچکانہ یا احمقانہ سوال ان سے کرلیا ہو۔ انھوں نے بہت لاپرواہی سے جواب دیا "اس میں کیا پریشانی ہے، ہماری تحصیل میں ایک مٹکا رکھا ہوا ہے، جب بارش ہوئی تو پانی اس میں بھی گرا۔ ہم نے سامنے، ایک دودھ والے کی دوکان سے

بنا ناسنگا کر سنگے کا پانی ناپ لیا، بس پتہ چل گیا کہ کتنی بارش ہوئی ہے۔" میں نے فوراً جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا دھیان تحصیلدار کے بیان کی طرف دلایا تو پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔[اس واقعے کے بعد سے ڈی۔ایم مجھ سے اس قدر احتیاط برتتے تھے کہ ایک بار جب میں ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء کے عرصے میں مرادآباد پوسٹیڈ تھا تو غالباً ۱۹۹۵ء میں ان سے بریلی میں (Agriculture Production Commissioner) (A P.C) کی میٹنگ میں ایک ملاقات ہوئی۔ ہیلو، ہیلو کے بعد انھوں نے پوچھا، انجینیر صاحب! آج کل کہاں پوسٹیڈ ہیں؟ میں نے جواب دیا "مرادآباد" چونک کر بولے "بھائی جان! میں بھی اسسٹینٹ کمشنر ہو کر مرادآباد گیا ہوں تھوڑی مہربانی رکھنا۔"]

(۳)۔ پاکستان کے صدور اور وزرائے اعظم کی تفصیلات

صدور

۱۔ سکندر مرزا ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸
۲۔ محمد ایوب خان ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹
۳۔ آغا محمد یحیٰ خان ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱
۴۔ ذوالفقار علی بھٹو ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ ۱۳ر اگست ۱۹۷۳
۵۔ فضل الٰہی چودھری ۱۴ر اگست ۱۹۷۳ ۱۶ر ستمبر ۱۹۷۸
۶۔ جنرل محمد ضیاء الحق ۱۶ر ستمبر ۱۹۷۸ ۱۷ر اگست ۱۹۸۸
۷۔ غلام اسحاق خان ۱۷ر اگست ۱۹۸۸ ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳
۸۔ وسیم سجاد (کارگزار) ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳ ۱۴ر نومبر ۱۹۹۳
۹۔ فاروق احمد لغاری ۱۴ر نومبر ۱۹۹۳ ۲ر دسمبر ۱۹۹۷
۱۰۔ وسیم سجاد (کارگزار) ۲ر دسمبر ۱۹۹۷ یکم جنوری ۱۹۹۸
۱۱۔ محمد رفیق تارڑ یکم جنوری ۱۹۹۸ ۲۰ر جون ۲۰۰۱
۱۲۔ جنرل پرویز مشرف ۲۰ر جون ۲۰۰۱ ۱۸ر اگست ۲۰۰۸
۱۳۔ محمد میاں سومرو (کارگزار) ۱۸ر اگست ۲۰۰۸ ۹ر ستمبر ۲۰۰۸
۱۴۔ آصف علی زرداری ۹ر ستمبر ۲۰۰۸ دم تحریر

وزرائے اعظم

۱۔ لیاقت علی خان ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱
۲۔ خواجہ ناظم الدین ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۱ ۱۷ر اپریل ۱۹۵۳
۳۔ محمد علی بوگرا ۱۷ر اپریل ۱۹۵۳ ۱۲ر اگست ۱۹۵۵
۴۔ چودھری محمد علی ۱۲ر اگست ۱۹۵۵ ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۶
۵۔ حسین شہید سہروردی ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۶ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۷
۶۔ ابراہیم اسماعیل چندریگر ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۷ ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۷
۷۔ سر فیروز خان نون ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۷ ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸
۸۔ محمد ایوب خان ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۵۸
۹۔ نورالامین ۷ر دسمبر ۱۹۷۱ ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱
۱۰۔ ذوالفقار علی بھٹو ۱۴ر اگست ۱۹۷۳ ۵ر جولائی ۱۹۷۷
۱۱۔ محمد خان جونیجو ۲۴ر مارچ ۱۹۸۵ ۲۹ر مئی ۱۹۸۸
۱۲۔ بینظیر بھٹو ۲ر دسمبر ۱۹۸۸ ۶ر اگست ۱۹۹۰
۱۳۔ غلام مصطفیٰ جتوئی ۶ر اگست ۱۹۹۰ ۶ر نومبر ۱۹۹۰
۱۴۔ نواز شریف ۶ر نومبر ۱۹۹۰ ۱۸ر اپریل ۱۹۹۳
۱۵۔ بلخ شیر مزاری (کارگزار) ۱۸ر اپریل ۱۹۹۳ ۲۶ر مئی ۱۹۹۳
۱۶۔ نواز شریف ۲۶ر مئی ۱۹۹۳ ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳
۱۷۔ معین الدین قریشی (ک) ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۹۳
۱۸۔ بینظیر بھٹو ۱۹ر اکتوبر ۱۹۹۳ ۵ر نومبر ۱۹۹۶
۱۹۔ ملک معراج خالد (ک) ۵ر نومبر ۱۹۹۶ ۱۷ر فروری ۱۹۹۷
۲۰۔ نواز شریف ۱۷ر فروری ۱۹۹۷ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۹۹
۲۱۔ ظفر اللہ خان جمالی ۲۱ر نومبر ۱۹۹۹ ۲۶ر جون ۲۰۰۴
۲۲۔ چودھری شجاعت حسین ۳۰ر جون ۲۰۰۴ ۲۰ر اگست ۲۰۰۴
۲۳۔ شوکت عزیز ۲۰ر اگست ۲۰۰۴ ۹ر نومبر ۲۰۰۷
۲۴۔ محمد میاں سومرو (ک) ۱۶ر نومبر ۲۰۰۷ ۲۵ر مارچ ۲۰۰۸
۲۵۔ یوسف رضا گیلانی ۲۵ر مارچ ۲۰۰۸ دم تحریر

ترقیاتی کاموں کے مختلف ادوار میں جائزے کے بعد کراچی میں دستیاب دیگر سہولتوں ; جیسے : آبادکاری (Housing)، Electric Suppply, Sewerage System, اور Water Supply System، ذرائع نقل و حمل (Transportation) نیز نظم و نسق (Law & Order) وغیرہ وغیرہ پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

[۴] آبادکاری (Housing)

کراچی کو ہمیشہ سے ہی مناسب آبادکاری کا مسئلہ درپیش رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کے بندرگاہ کی اہمیت کے پیشِ نظر نیز اندرون اور بیرون ملک سے مہاجرین کی یلغار کے سبب تیزی سے بڑھتی ہوئی مردم شماری رہی ہے۔ اس حقیقت پر مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے:—

۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں کُل مردم شماری ۱۴،۰۰۰ تھی۔
۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں کُل مردم شماری ۱۶،۷۷۳ تھی۔
۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں کُل مردم شماری ۵۷،۰۰۰ تھی۔
۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) میں کُل مردم شماری ۷۳،۰۵۶ تھی۔

۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) سے ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) کے بیچ آبادی کے بڑھنے کی وجہ کراچی سے پنجاب تک ریلوے لائن کا پورا ہونا اور نتیجتاً اندرونی علاقوں سے مال کا کراچی بندرگاہ پر آتا رہا۔ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ء) سے ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) کے دوران کراچی بندرگاہ پر جو شراب اتری اس کی مقدار ۶۸،۱۳۰ گیلن تھی جو

۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء) میں بڑھ کر چار لاکھ تین ہو گئی۔ اس کے علاوہ ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) سے ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) کے بیچ پنجاب اور سندھ میں نہری نظام کے پورا ہو جانے سے Exportable اجناس کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور نتیجتاً زیادہ مال بندرگاہ پر پہنچا۔

۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) میں کُل مردم شماری ۴،۳۵،۸۸۷ تھی۔

آزادی سے پہلے، ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) میں کُل مردم شماری ۴،۵۰،۰۰۰ تھی۔ سندھی بولنے والوں کی تعداد ۶۱.۲ فی صد اور اردو یا ہندی بولنے والوں کی تعداد ۶.۳ فی صدی تھی۔ اس کے علاوہ ہندو ۵۱ فیصد اور مسلمان ۴۲ فیصدی تھے۔

۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں کُل مردم شماری ۱۱،۳۷،۰۰۰ تھی۔

ہندوستان سے تقریباً ۶،۰۰،۰۰۰ مہاجرین کے ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) کے بعد کراچی آجانے سے، سندھی بولنے والوں کی تعداد گھٹ کر ۸.۶ فی صد اور اردو بولنے والوں کی تعداد بڑھ کر ۵۰ فی صد ہوئی۔ اس کے علاوہ مسلمان بڑھ کو ۹۶ فی صد اور ہندو گھٹ کر ۲ فی صد رہ گئے۔

۱۳۸۱ھ (۱۹۶۱ء) میں کُل مردم شماری ۲۰،۰۰،۰۰۰ تھی۔

۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) سے ۱۴۰۸ھ (۱۹۸۷ء) کے عرصہ میں جو اعداد و شمار جمع کیے گئے اس کے مطابق آبادی ۳.۶ ملین سے بڑھ کر ۷.۲ ملین ہوگئی جس کی وجہ سے اندرونی

علاقوں سے نقلِ مکانی کے علاوہ ۳،۵۰،۰۰۰ بنگلہ دیش سے، ۳،۰۰،۰۰۰ ایران اور افغانستان سے مہاجرین کا کراچی میں آکر آباد ہونا تھا۔ ان کے علاوہ بنگلہ دیش، سری لنکا، برما، فلپائن سے غیر قانونی تارکین وطن بھی آئے جن کی تعداد تقریبا ۲،۰۰،۰۰۰ تھی۔

۱۴۰۲ھ (۱۹۸۱ء) کے Census کے مطابق اردو بولنے والوں کی تعداد مزید بڑھ کر ۵۴.۳ فی صد، پنجابی بولنے والوں کی تعداد ۱۳.۷ فی صد، سندھی بولنے والوں کی تعداد ۶.۳ فی صد اور بلوچی بولنے والوں کی تعداد ۴.۴ فی صد ہوگئی۔

۱۴۱۹ھ (۱۹۹۸ء) میں کُل مردم شماری ۹۸،۰۲،۱۳۴ تھی۔

موجودہ کُل مردم شماری ۱،۲۵،۰۰،۰۰۰ کم و بیش ہے۔

پاکستان کا قیام عمل میں آنے پر ہندوستان سے ایک کثیر تعداد میں مہاجرین کے سیلاب کی وجہ سے کراچی میں آبادکاری کا ایک زبردست مسئلہ(۱) پیدا ہو گیا تھا۔ کچی آبادیاں قائم ہوگئیں تھیں، سڑکیں تنگ ہوگئیں تھیں نیز پارکوں کے اطراف اور کھیل کے میدانوں میں بھی جھونپڑیاں نظر آنے لگیں تھیں۔ اس پیچیدہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے حکومت نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اور دیگر صاحب استطاعت نجی شعبوں نے بھی ان کی آبادکاری کے سلسلے میں کئی اقدامات کئے۔ اورنگ آباد، لیاقت آباد، ڈرگ کالونی، ملیر کالونی، لانڈھی کالونی، کورنگی کالونی، نارتھ ناظم آباد اور اورنگی کالونی وغیرہ متعدد کالونیاں وجود میں آئیں۔ ان میں سے اورنگ آباد ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں، لیاقت آباد ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۲ء) میں، ڈرگ کالونی ۱۳۷۴ھ (۱۹۵۴ء) میں، ملیر کالونی

۱۳۷۵ھ(۱۹۵۵ء) میں، لانڈھی کالونی اور کورنگی کالونی ۱۳۷۵ھ(۱۹۵۵ء) میں، نارتھ کراچی اور اورنگی کالونی ۱۳۷۷ھ(۱۹۵۷ء) میں اور بلدیہ کالونی ۱۳۷۸ھ(۱۹۵۸ء) میں وجود میں آئیں۔ یہ سب مہاجرین کالونیاں ہیں۔ ان کے علاوہ دستگیر ۱۳۷۲ھ(۱۹۵۲ء) میں، تیموریہ (نارتھ ناظم آباد) ۱۳۷۳ھ(۱۹۵۳ء) میں، ہمدل، چاندنی چوک ۱۳۷۷ھ(۱۹۵۷ء) میں، منصورہ (فیڈرل بی ایریا) ۱۳۸۰ھ(۱۹۶۰ء) میں، قصبہ ٹاؤن ۱۳۸۲ھ(۱۹۶۲ء) میں، کہکشاں (کلفٹن) اور گلشن اقبال ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴ء) میں اور گلستان جوہر ۱۳۹۹ھ(۱۹۷۹ء) میں منظور ہوئیں۔ یہ متوسط طبقہ سے اعلیٰ طبقہ تک کے لئے منظور کی گئی تھیں جب کہ غریب طبقہ کے لئے کے ہر جانب اسکیم، دیگر اسکیمیں تیار کی گئی تھیں۔

کراچی میں رہ رہے ہر خاندان کی ابھی تک مناسب آبادکاری نہیں ہوسکی ہے۔ ۱۴۲۱ھ(۲۰۰۰ء) میں تقریباً ستر لاکھ انسان کچی آبادی میں رہ رہے تھے جو کل آبادی کا تقریباً ۵۶ فی صد ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا شمار ایشیا کی دوسری سب سے بڑی کچی آبادی میں سے ہوتا ہے۔ ویسے مسلسل "فلیٹس" کے نئے "پلازوں" کی تعمیر کا کام جاری ہے اور آہستہ آہستہ کراچی کنکریٹ کے ایک جنگل میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے جس سے اس کی Climatic Conditions بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے اس کی آب و ہوا مرطوب تھی لیکن کہتے ہیں کہ اب دن میں زیادہ گرمی کا احساس ہونے لگا ہے حالانکہ رات کو اب بھی ٹھنڈی ہوا چلنے سے موسم قدرِ خوشگوار ہو جاتا ہے۔

پہلے کبھی کراچی میں گھر کی دیواریں مٹی اور لکڑی کی اور چھتیں چٹائی، لکڑی اور مٹی کی بنائی جاتی تھیں۔ گھروں میں روشن دان کا معقول انتظام رکھا جاتا تھا لیکن اب یہ طرزِ تعمیر گو شہر میں تو موجود نہیں ہے، البتہ کہتے ہیں کہ گردونواح کے دیہاتوں میں ابھی بھی

ایسے مکانات موجود ہیں۔ اب تمام مکانات (.Cement Concrete (C.C اور (Re-inforced Cement Concrete (R.C.C کے بنائے جاتے ہیں۔ اینٹوں کی جگہ C.C. Blocks استعمال کئے جاتے ہیں کیوں کہ وہاں کی مٹی اینٹوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ [اچھی اینٹوں کے لئے مناسب مٹی جس میں Clay، Sand اور Loam ایک خاص ratio میں ہوں بہت ضروری ہے۔ Clay کی مقدار زیادہ ہونے سے اینٹوں میں Shrinkage، Cracking اور Warping ہوگی ور Sand کی مقدار زیادہ ہونے سے وہ اسی قدر Brittle اور جھانوا ہو جائیں گی۔ اس لئے Clay کی مقدار ۱۰ سے ۲۰ فیصد کے درمیان ہونی چاہیے۔ زیادہ پانی سے بھی اینٹیں Brittle ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مٹی ایسے علاقے کی نہ ہو جہاں کا پانی Salty ہو۔] تعمیرات کے لئے ریت ملیر ندی سے حاصل کیا جاتا ہے جو Coarse ہوتا ہے۔ Low income group اور middle class کے مکانات کی چھتیں Pre-casted R.C.C. Slabs کی بھی بنی ہوئی ہیں جو Pre-casted and pre-stressed beams پر رکھی جاتی ہیں۔ جگہ جگہ ایسے Slabs اور Beams ور Blocks بنائے اور فروخت کئے جاتے ہیں۔

''کراچی میونسپل کارپوریشن بلڈنگ بائی لاز'' کے مطابق ۳۵ فٹ سے زائد اونچائی یا پانچ منزل سے زائد منزلہ عمارت میں لفٹ کا لگانا لازمی ہے اس لئے زیادہ تر ''بلاکس'' پانچ منزل تک ہی بنائے جا رہے ہیں کیوں کہ عمارت میں لفٹ لگانے سے تعمیراتی لاگت زیادہ ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ کراچی میں سمندر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اس سے جو زمین حاصل ہو رہی ہے اس کے اوپر بھی عمارات کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسے ہی ایک قطعۂ زمین پر ایک Multi Storeyed بلڈنگ میں نے دیکھی جو حال ہی میں گجرات میں آئے

زلزلے، جس کا اثر پاکستانی علاقوں میں بھی دیکھا گیا، کی وجہ سے قدر زمین میں دھنس گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ نارتھ ناظم آباد سے ملحق جو پہاڑ ہے اور جس سے Lime Stone Querry کیا جاتا ہے، وہ پہلے کبھی سمندر کے اندر ہی تھا اسی سبب اس سے اوپر ابھی بھی Fossils پائے جاتے ہیں۔

ایک بات اور، وہ یہ کہ میں نے تمام "بلاکس" کی باہر سے رنگت اڑی اڑی سی پائی گویا اداس اداس سی۔ جب اس کی وجہ میں نے "کراچی بلڈنگس کنٹرول اتھورٹی" (KBCA) کے سابق افسر اعلیٰ جو میرے بھانجے ہوتے ہیں، سے پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ دراصل یہ "بلاکس" پرائیویٹ اداروں کے ذریعہ تعمیر کئے جاتے ہیں اور پھر ان کے "فلیٹس" مختلف لوگوں کو فروخت کردیے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں تو ان "بلاکس" کے باہر تازہ تازہ "سنوسیم" (Snowcem) ہونے کی وجہ سے تازگی رہتی ہے پھر جیسے جیسے عرصہ گزرتا جاتا ہے "سنوسیم" فیڈ ہونے لگتا ہے اور "بلاک" کی مشترکہ ملکیت ہو جانے کی وجہ سے اس پر آگے کوئی "سنوسیم" نہیں کراتا۔ اس طرح سب "بلاکس" ایک جیسے ہو جاتے ہیں اور ان سے بیوگی کا سا تاثر ملتا ہے۔

آبادی کے لحاظ سے کراچی کا موازنہ دہلی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی ہندوستان کا دارالخلافہ ہے اور کراچی پاکستان کا دارالخلافہ رہا ہے۔ اس معاملے میں بھی دونوں میں یکسانیت ہے۔ دونوں ہی میں نئی اور پرانی آبادی بھی ہے، یعنی نئی دہلی اور پرانی دہلی نیز نیو کراچی اور پرانا کراچی، لیکن اس معنی کر دونوں میں تضاد ہے کہ دہلی میں تو نئی دہلی، پرانی دہلی سے عمدہ، پرکشش اور جاذب نظر ہے جو ہونا بھی چاہیئے لیکن کراچی میں نیو کراچی، پرانی کراچی یعنی کلفٹن، صدر وغیرہ سے بہت کم تر درجے کا ہے۔ غالباً اس کی وجہ

یہ ہے کہ نئی دہلی انگریزوں نے اپنے اور روساء کے لئے نیز نئی کراچی پاکستانیوں نے Middle Class مہاجرین کے لئے آباد کیں۔ کراچی میں چوراہے کو چورنگی کہتے ہیں۔ تقریباً ہر چورنگی پر خوبصورت Monuments تعمیر کرائے گئے ہیں۔

اسی ضمن میں ''ابدی آبادکاری'' کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ کراچی میں کافی قبرستان ہیں جو وسیع و عریض علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ رات کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں جا سکتا، البتہ دن میں ہر وقت، خاص کر صبح اور شام کے اوقات میں، وہاں کافی چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔ کئی کئی میتیں ایک ساتھ لائی جاتی ہیں۔ لوگ اپنے عزیزوں کی قبروں پر پھول چڑھاتے اور فاتحہ خوانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جب کوئی اپنے کسی عزیز کی قبر پر پھول چڑھاتا ہے تو ساتھ ہی اس قبر کے آس پاس کی قبروں پر بھی پھول چڑھاتا ہے۔ قبروں کو پختہ کرنے کا زیادہ رواج ہو گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کئی قبرستانوں کو ان میں بظاہر گنجائش نہ ہونے کے سبب بند کرنا بتایا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کراچی میں ''فلیٹ'' خریدنا آسان ہے بہ نسبت قبر کی جگہ حاصل کرنے کے۔ کچھ برادریوں نے تو Societies بنا کر قبرستانوں میں زمین خریدتے ہوئے اس کی چہار دیواری کر رکھی ہے۔ اسی طرح کی ایک Site میں نے ایک قبرستان میں سادات امروہہ کی دیکھی۔ ارباب اقتدار کو اس طرف جلد دھیان دینا ہوگا ورنہ وہ دن دور نہیں جب قبرستانوں میں بھی زمیں دوز Multi Storeyed قبروں کا Culture Develop کرنا پڑ جائے گا۔

یہاں ایک سماجی ادارے، ''ایدھی ٹرسٹ فاؤنڈیشن'' کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی اور بے ربط نہ ہوگا۔ یہ ادارہ لاوارث بچوں اور بیواؤں کی پرورش، ان کی شادی بیاہ، لاوارث لاشوں کی تجہیز و تکفین کراتا ہے نیز قربانی اور صدقے کا انتظام کراتا ہے۔ ان کا اپنا

منشیات پر کنٹرول کرنے کا ادارہ، فری میڈیکل سروس، جنرل اسپتال، لنگر خانہ اور میتوں کو رکھنے کے لئے سرد خانہ وغیرہ دیتے ہیں۔ ان کی اپنی ایمبولینس اور حتیٰ کہ ہیلی کاپٹر سروس بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کو ٹیلیفون کرتے ہی آناً فاناً ان کا عملہ حرکت میں آ جاتا ہے اور یہ وقت سہولت بہم پہنچا دیتا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ شام کو عطیات دینے والے اہل خیر حضرات کی ان کے مراکز کے باہر قطاریں لگ جاتی ہیں۔ لطف یہ کہ اگر کوئی شخص دیئے گئے عطیہ کے صرف سے مطمئن نہ ہو تو وہ رسید دکھا کر اپنا عطیہ واپس لے سکتا ہے۔ اس ادارے کے پاکستان کے ہر بڑے شہر جیسے کراچی، لاہور، راولپنڈی، کوئٹہ، پشاور وغیرہ میں مراکز قائم ہیں۔ ٹرسٹ کے مالک نامور سماجی شخصیت جناب عبدالستار ایدھی ہیں جو میمن برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور گجرات نژاد ہیں۔ ان کو دیکھنے سے ایسا نہیں لگتا کہ وہ اتنے بڑے ادارے کو چلا رہے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ وہ کھدر کا لباس، اس پر ٹوپی اور پاؤں میں ٹوٹی ہوئی چپل استعمال کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر خود ہی ایمبولینس چلانے لگ جاتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ ایسی ہستی کو ابھی تک "نوبل انعام" سے نہیں نوازا گیا۔ اگر یہی شخص انگریز یا یہودی ہوا ہوتا تو کبھی کا اس اعزاز سے نوازا جا چکا ہوتا۔

حواشی

(۱) آخری اعداد و شمار کی رو سے پاکستان میں پناہ لینے والوں کی مجموعی تعداد ۹۰ لاکھ تھی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے سندھ چھوڑ کر جانے والے غیر مسلموں کی تعداد ۱۹ لاکھ تھی جب کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین میں سے فقط ۵ لاکھ ۳۰ ہزار ہی کو وہاں بسایا گیا۔ اسی طرح صوبہ سرحد سے جانے والے غیر مسلموں کی تعداد ۱،۲۱ لاکھ ۹۶ ہزار تھی جب کہ صرف ۵۱ ہزار مہاجرین ہی کو وہاں آباد کیا گیا۔

۱۹۵۰ء میں کھوکھراپار کے راستے آنے والے مسلمانوں کی تعداد ۲،۶۴،۸۹۹ تھی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ تعداد ۱۶ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۷ لاکھ مسلمان زیادہ تر بہار سے مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔

مہاجرین کو آباد کرنے کا مسئلہ سالہا سال تک پاکستان کے لئے دردِ سر بنا رہا۔ اس کے برخلاف جب دوسری جنگ عظیم [۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء] کے بعد مغربی جرمنی پر جرمن پناہ گزینوں کا ایک سیلاب ٹوٹ پڑا تھا اور جون ۱۹۶۱ء تک یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ایک کروڑ ۲۵ لاکھ تک پہنچ گئی تھی اور وہ بھی اس حال میں جب کہ مغربی جرمنی سے کوئی بھی شخص اپنی جائیداد وغیرہ چھوڑ کر نہیں گیا تھا، تو مغربی جرمنی نے بڑی خوش اسلوبی سے نہ صرف یہ کہ ان تمام مہاجرین کو آباد کیا بلکہ انھیں مناسب کاموں پر بھی لگایا جس سے مہاجرین کا وہی سیلاب مغربی جرمنی کی معاشی خوشحالی و ترقی کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا تھا۔

[''تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان'' حصہ دوم ص ۳۲۰، ۳۲۳]

[۵] پینے کے پانی کا نظام

(Water Supply System)

پہلے بھی کراچی میں ہر گھر کے ساتھ ایک کنواں ہوا کرتا تھا جس کا پانی برتن اور کپڑے دھونے کے کام آتا تھا جب کہ لیاری ندی کے کنارے جو کنویں تھے ان کا پانی پینے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ بعد میں دریائے ملیر کے کنارے بنے کنوؤں کا پانی تقسیم کرنے کا منصوبہ عمل میں لایا گیا۔ ساتھ ہی کچھ عرصہ بعد سندھ ندی سے بھی استفادہ کیا جانے لگا۔

۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں میونسپلٹی نے شہر کے مختلف علاقوں میں مزید گیارہ کنویں کھودے جن میں سے زیادہ تر لیاری ندی کے بائیں کنارے پر واقع تھے۔ اس کے علاوہ رام تلاؤ، رتن تلاؤ، فریئر تلاؤ، ٹانک واڑہ تلاؤ اور رام باغ تلاؤ کے گرد بھی متعدد کنویں کھودے گئے۔

۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) سے ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) کے عرصہ میں ڈملوٹی میں بارہ کنویں کھودے گئے اور ان سے حاصل شدہ پانی تقریباً چالیس کلومیٹر دور پتھر کی بنی ہوئی ایک زیرِ زمین پائپ لائن کے ذریعہ پمپ کر کے کراچی لایا گیا۔

پانی کا ذخیرہ کرنے کے لئے ''ٹیمپل'' اور ''کری''، دو ''رزروائیرس'' (Reservoirs) بھی بنائے گئے تھے۔ یہ دونوں آج بھی استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ مزید دو ''رزروائیرس''، ''سیڈھم'' اور ''ایل۔ ایس۔ آر'' بنائے گئے جو کشمیر روڈ پر واقع ہیں۔

دراصل ڈملوٹی کے کنوؤں کا پانی بارش کا مرہونِ منت ہے۔ بارش کا پانی ملیر ندی کے ریت میں جذب ہو جاتا ہے اور پھر کنوؤں کے ذریعہ تمام سال چلتا رہتا ہے لیکن بارش نہ ہونے کی صورت میں کنویں خشک ہو جاتے ہیں جس سے پانی کی قلت ہو جاتی

ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد کراچی میں تمام تعمیراتی کام اسی ندی سے حاصل کردہ ریت سے ہوا جس سے ندی کی پانی جذب کرنے کی استعداد کم ہوتی گئی اور اب ان کنوؤں سے بمشکل پانچ ملین گیلن پانی ہی مل پاتا ہے۔

مندرجہ بالا مشکلات کے پیش نظر ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۳ء) میں ایک منصوبے کے تحت ہالیجی جھیل سے پانی حاصل کیا جانے لگا۔ کلری نہر اس جھیل کے قریب سے ہی گزرتی ہے لہٰذا جھیل کے قریب چاروں طرف نو مربع میل (۲۳،۰۴ مربع کلومیٹر) میں ایک پشتہ بنا کر اسے ایک مصنوعی جھیل کی شکل دے دی گئی جس میں ۱۳،۰۰۰ ملین گیلن پانی کا ذخیرہ ہونے کی گنجائش ہے۔

اس وقت کس Source سے کتنا پانی دستیاب ہو رہا ہے اُس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

Source of Bulk Water Supply

Source	MGD
Dumlo ttee wells	5
Indus via Haleji/Gharo	20
Indus via Greater Karachi Bulk Water Supply	240
Indus Balance Conveyor Scheme	42
Hub System from Balochistan	100
TOTAL -	**407**

شہر میں ہر روز تقریباً ۳۶۳ ملین گیلن پانی فراہم کیا جاتا ہے جب کہ ۵۰۰ ملین گیلن پانی کی ضرورت ہے۔ جو پانی فراہم کیا جاتا ہے اس میں سے تقریباً ۳۷ فی صد پائپ لائن کی ٹوٹ پھوٹ اور رساؤ وغیرہ کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے، اور اس طرح

تقریباً ۵۰ فی صد پانی ہی صارفین کو مل پاتا ہے۔ اسی وجہ سے ابھی بھی جو کالونیاں Running Water کی سہولت سے محروم ہیں۔ وہاں Tankers سے پانی مہیا ہو پاتا ہے۔ تقریباً ۵،۰۰۰ ٹینکرس ۵۰،۰۰۰ کے قریب چکر روزانہ لگاتے ہیں اور اس طرح ۸.۵ ملین گیلن پانی روزانہ فروخت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گدھا گاڑیاں بھی پانی لادنے کے کام میں لائی جاتی ہیں۔ یہ بھی "KWSB" کی لائنوں سے ہی خلاف قانون پانی لے کر بیچتے ہیں۔ [اب بھی جگہ water table بہت تیزی سے down ہوتا جا رہا ہے، جو ایک مسئلہ ہے۔]

کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر صارفین پمپ سے پانی کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں تو گندہ اور بدبودار پانی آنے لگتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پانی کی لائنوں میں اس حد تک ٹوٹ پھوٹ ہے کہ ان میں Sewer یا گندے نالوں کا پانی آنے لگتا ہے اور Sewer Lines سے بھی رساؤ ہو رہا ہے۔ اس سے متعلقہ سرکاری عملے کی کارکردگی پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

پانی کی قلت کی وجہ سے کراچی میں "Intermittant Supply System" ہے [محض خاص اوقات میں پانی آتا ہے۔]۔ اگر "Continuous Supply System" [چوبیسوں گھنٹے پانی آئے۔] ہو تو پانی کی لائن میں گندہ پانی نہیں آئے گا [لائنوں میں اندر سے باہر کی طرف پانی کا دباؤ بنا رہتا ہے۔] لیکن اس میں پانی کی قلت کا مسئلہ مانع ہے۔

پانی کی لائنوں میں اتنا پریشر بھی نہیں ہوتا کہ Multi Storeyed Buildings میں پانی چڑھ سکے۔ چنانچہ تقریباً ہر "بلاک" میں مناسب سائز کا ایک زمین دوز "رزروائیر" (Reservior) بنایا ہوا ہے جس سے ضرورت کے مطابق پانی پمپ کر دیا جاتا ہے۔ [دہلی کو بھی اب پانی کی قلت کا سامنا ہے۔]

کچھ صارفین نے نجی Water Jet Pumps بھی لگائے ہوئے ہیں جو عموماً دو سو فٹ گہرائی تک بور کیے ہوئے ہیں۔ تقریباً سو فٹ گہرائی تک جو زیر زمین پانی کا ذخیرہ (Underground water reservoir) ہے، وہ کھارا ہے [ساحل سمندر پر واقع ہونے کے سبب]۔ اس کے نیچے کا ذخیرہ میٹھے پانی کا ہے۔ کچھ صاحب استطاعت لوگوں نے تو دو دو واٹر جیٹ پمپ لگائے ہوئے ہیں۔ ایک کم لاگت والا کھارے پانی کا اور دوسرا میٹھے پانی کا۔ کھارے پانی کو تو Plantation اور صفائی وغیرہ کے کام میں لایا جاتا ہے جب کہ میٹھے پانی کو کھانے پینے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

Chemically پانی کو دو Classes میں بانٹا ہوا ہے: Soft Water اور Hard Water۔ آخر الذکر بھی دو sub-classes ‘Temporary Hard Water اور Permanent Hard Water میں بانٹا ہوا ہے۔ Temporary Hard Water پانی میں Carbon Dioxide کی موجودگی کی وجہ سے ہوتا ہے جو Calcium اور Magnecium کے insoluble carbonate کو dissolve کرکے soluble bicarbonate کی شکل میں لئے رہتا ہے۔ Insoluble carbonates کی وجہ سے scale formation ہوتا ہے جب کہ Permanent Hard Water پانی میں Sulphates یا Nitrates یا Calcium اور Magnecium کے Chlorides کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ Salts, Corrosive ہوتے ہیں۔ Hard Water کے مقابلے میں Soft Water صابن کے زیادہ جھاگ دیتا ہے۔

[۲] گندگی کی نکاسی کا نظام

(Drainage System)

گندگی چار شکل میں ہو سکتی ہے (۱) کوڑا کرکٹ (Garbage)، (۲) ''سلج'' (Sullage)، یعنی غسل خانے، باورچی خانے اور واش بیسن وغیرہ کا گندہ پانی جس میں کسی جاندار کا فضلہ (Excreta) نہیں ہوتا۔ (۳) ''سیوج'' (Sewage)، یعنی بیت الخلاء سے نکلنے والا فضلہ اور پانی، Sullage-water اور Urinals کا اخراج اور (۴) برساتی پانی (Rain water)۔ ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے Drainage System بھی تین شکل میں ہو سکتا ہے۔ (۱) "Combined System" اس میں مندرجہ بالا سبھی ۲ سے ۴ تک کی گندگیوں کو یک ساتھ Remove کیا جاتا ہے۔ (۲) "Separate System" اس میں ۲ سے تین تک ایک ساتھ اور ۴ کو الگ Remove کیا جاتا ہے۔ (۳) "Partially Separate System" اس میں بارش کا زیادہ تر پانی نالوں کے ذریعے نکال دیا جاتا ہے جب کہ مکانوں کی چھت، صحن اور سڑکوں کا Run-off اور ''سوئل سیورس'' (Soil-sewers) الگ سے خارج ہونے دیا جاتا ہے۔ "Combined System" اور "Separate system" کی اپنی کچھ خصوصیات اور کمیاں ہیں۔ اس لئے "Partially Separate System" ہی زیادہ مناسب رہتا ہے۔ کراچی میں یہی System ہے۔

[۱] برساتی پانی (Flood Water)

کراچی کی ایک اہم خصوصیت اس کا صاف ستھرا پن تھا۔ آزادی سے پہلے

برساتی پانی کی نکاسی کا معقول بندوبست تھا۔ ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۲ء) میں متعدد نالوں کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا اور جیسے جیسے شہر پھیلتا گیا ان کو پختہ کیا جاتا رہا۔ بارش ہوتے ہی تمام تر پانی ان نالوں کے ذریعہ سمندر میں چلا جاتا تھا۔

شروع میں تو نالے کھلے ہوئے تھے لیکن بعد میں "کراچی میونسپل کارپوریشن" نے جب تجارتی عمارات تعمیر کرائیں تو ان نالوں کو بھی جگہ جگہ پر پاٹ دیا۔ نتیجتاً ان کی مناسب صفائی نہیں ہو پاتی اور نہ ہی ان کی ضروری مرمت کی جا رہی ہے۔ جگہ جگہ پر یہ ٹوٹ چکے ہیں اور خستہ حالت میں ہیں۔ ان میں گھاس اور دیگر جنگلی پودے تک اُگ آئے ہیں۔ Engineering نقطۂ نگاہ سے پختہ کاموں پر پیڑ پودھوں اور گھاس وغیرہ کے اُگنے سے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کی تھیلیاں، جن پر کسی کا کوئی کنٹرول نہیں، بھی اُڑ اُڑ کر ان میں آکر جمع ہو رہی ہیں۔ ان سب سے نالوں میں پانی کے مناسب بہاؤ میں رخنہ اندازی ہو رہی ہے اور گندے پانی کو Self Cleansing Velocity نہیں مل پا رہی ہے جس سے Solid Particles کے تلی میں جمتے چلے جانے سے نالے Chock ہو چلے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے زیر زمیں پانی بھی متاثر ہو رہا ہے۔

[۲] سیوریج (Sewerage)

برساتی پانی کے نظام کی طرح پہلے "Sewerage System" (Sullage & Sewage کی نکاسی) کا بھی موثر انتظام تھا۔ شہر کو اٹھائیس زون میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ہر زون میں سب سے نچلی سطح پر ایک اجیکٹر (Ejector) لگایا گیا

تھا۔ قدرتی بہاؤ (Gravity Flow) سے تمام پانی اجیکٹر کے پاس جمع ہوجاتا تھا جہاں سے اجیکٹر ہوا کے پریشر سے اس پانی کو پمپنگ اسٹیشن تک پہنچا دیتے تھے۔ پمپنگ اسٹیشن ہارس اسٹریٹ پر ایک اونچی جگہ واقع تھا۔ دوسرے مرحلے میں تمام پانی پمپ کے ذریعے ''سیوریج فارم'' میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ یہ فارم لیاری ندی کے دائیں جانب منگھوپیر روڈ پر واقع ہے۔

مندرجہ بالا طریقہ قدرے دشوار تھا اس لئے ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۹ء) میں ''ٹرنک سیور'' پر کام شروع ہوا۔ 20MGD کی استعداد کے دو ''ٹریٹمنٹ پلانٹس'' [Treatment Plants] کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ پرانے نظام کو بدلا جاسکے۔ بعد میں "Greater Karachi Sewerage Plan" (GKSP) کے تحت مزید Gravity سیور لائنس [Sewer Lines] ڈالی گئیں۔ اس طرح شہر کی یہ گندگی ٹی۔پی۔ون [T.P i] اور ٹی۔پی۔ٹو [T.P ii] آنے لگی جس کو پمپ کرکے ''ٹریٹمنٹ پلانٹ'' میں ٹریٹ [Treat] کیا جانے لگا۔ لیکن کراچی کی آبادی کچھ اس برق رفتاری سے بڑھی کہ ٹریٹمنٹ [Treatment] کا یہ نظام پیچھے رہ گیا۔

ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت تقریباً ۴۰ فی صد لوگوں کو ہی سیوریج [Sewerage] نظام کی سہولت حاصل ہے۔ روزانہ تقریباً ۲۹۵ سے ۳۵۰ ملین گیلن Waste water پیدا ہوتا ہے جس میں سے سرکاری نظام کے ذریعہ مشکل سے ۲۰ سے ۴۰ ملین گیلن ہی ٹریٹ [Treat] ہو پاتا ہے۔ باقی نالوں کے ذریعہ سمندر میں چلا جاتا ہے۔ ویسے "Karachi Water & Sewerage Board" (KWSB) نے ۱۵۱،۵۰ ملین گیلن یومیہ صلاحیت کا ''ٹریٹمنٹ پلانٹ'' نصب کیا ہوا ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔۔۔۔

Treatment Plant (TP)	Installed Capacity (MGD)	Actual treatment (MGD)
TP I	51.00	7.00
TP II	45.50	15.00
TP III	54.00	5.00
Total	**151.50**	**27.00**

بجلی کا نظام [۷]

(Electric Supply System)

کراچی روشنیوں کا شہر کہلاتا ہے۔ اس میں ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۳ء) تک بجلی نہیں تھی۔ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں سڑکوں کو رات کے وقت روشن رکھنے کی غرض سے ناریل اور تِل کے تیل سے لیمپ روشن کئے گئے۔ اس کے بعد مٹی کے تیل کا استعمال ہونے لگا۔ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء) میں شہر کے بڑے چوراہوں پر گیس کے لیمپ لگائے گئے۔ (۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں کچھ صورت حال اس طرح سے تھی —

۱۳۴۲عدد تیل سے روشن ہونے والے لیمپ،

۳۵۳عدد پیٹرول سے روشن ہونے والے لیمپ،

۲۱۱عدد کلسن لیمپ،

۱۷۶عدد بجلی کے بلب (۱۰۰ کینڈل پاور کے)،

۲۰۵عدد بجلی کے بلب (۴۰ کینڈل پاور کے) اور

۸عدد بجلی کے بلب، (۴۰۰ کینڈل پاور کے)

اس وقت جو صورتِ حال ہے وہ مندرجہ ذیل ٹیبل سے عیاں ہو جاتی ہے:—

Actual Distribution From KESC	1,217 MW
Borrowing from WAPDA	250 MW
Total Supply	**1,467 MW**
Power Lossess and Pilferage	30%
Actual Demand	**1,500 MW**

اس طرح "Karachi Electric Supply Corporation" (KESC) جو بجلی Supply کرتی ہے وہ ضرورت سے بہت کم ہے۔ اس لئے اس وقتی سیکٹر (Private Sector) اور "KANUP" سے بھی بجلی خریدنی پڑتی ہے۔

بجلی کی کمی کا زیادہ تر احساس گرمیوں میں ہوتا ہے کیوں کہ اس موسم میں کافی تعداد میں پنکھے Air Conditioners, Refrigerators, اور Coolers استعمال کئے جاتے ہیں۔ بار بار بھی تو کافی وقفہ کے لئے بجلی کی Supply منقطع ہو جاتی ہے۔

بجلی کی کمی کی وجہ سے تقریباً ۲۰ فی صد خاندان بغیر بجلی کے گزارا کرنے پر مجبور ہیں لیکن رات کو بازار کی روشنیاں نگاہوں کو خیرہ کئے رہتی ہیں۔ طرح طرح سے مختلف انداز میں انہیں روشنی سے سجائے رکھا جاتا ہے۔ میں نے "KDA" کے ایک ذمہ دار افسر سے یہ سوال کیا کہ جب بجلی کی ضرورت سے بہت کم پیداوار ہے اور شہر کی کافی کچھ آبادی بنا بجلی کے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، تو پھر رات کی اس نمائشی روشنی پر پابندی لگاتے ہوئے ضرورت مندوں کو کیوں نہیں بجلی مہیا کرادی جاتی؟۔ وہ اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔

ذرائع نقل و حمل [۸]

(Transportation)

۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) تک کراچی میں کوئی سڑک پختہ نہیں تھی۔ اس کے بعد ہی پختہ سڑکیں تعمیر کی گئیں اور ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) تک تقریباً ایک ہزار سڑکیں پختہ ہوئیں۔

ابتدائی دور میں مختلف اقسام کی گاڑیں استعمال کی جاتی تھیں جیسے: بیل گاڑیں، اونٹ گاڑیاں، گدھا گاڑیں، بگھیاں اور ہاتھ گاڑیاں۔ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء) میں اسٹیم سے چلنے والی ''ٹرام وے'' کا استعمال ہونے لگا جو "East India Tramway Co" کی ملکیت تھی۔ لیکن اس کے شور کی وجہ سے جلد ہی اس کو بند کر کے ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) میں اس کی جگہ چھوٹی ور ہلکی کار نما ٹرام جو گھوڑوں سے کھینچی جاتی تھی، سڑکوں پر آگئی۔ ان میں محدود گنجائش ہوتی تھی؛ اس لئے ان کو بھی بند کرنا پڑا۔ بعد ازاں ٹرام ہی جو ڈیزل سے چلتی تھی، رائج ہوئی لیکن چند وجوہات سے یہ بھی بند ہوگئی۔ پھر ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں بس سروس شروع ہوئی جو پرائیویٹ کمپنیوں کی ملکیت تھی۔

پہلے کچھ عرصہ "Karachi Transport Corporation" (KTC) نے اپنی بسیں چلائیں لیکن خسارہ کی وجہ سے ان کو بند کرنا پڑا۔ تبھی سے کراچی میں کوئی مربوط نظام Transportation کا نہیں ہے۔ مختلف سائز اور ڈیزائن کی بسیں سڑکوں پر دوڑا کرتی ہیں جو تمام کی تمام پرائیویٹ ملکیت میں ہیں۔ جہاں چاہو، جب چاہو، ان کو روکا جا سکتا ہے۔ ان کے باضابطہ کوئی اسٹینڈ نہیں ہیں۔ جب اسٹینڈ ہی نہیں ہیں تو شیڈ کی تو بات ہی کرنا فضول ہے۔ Private Sector میں ہونے کی وجہ سے Centralized Depot اور Workshop بھی نہیں ہیں۔ ہر Transporter اپنی سہولت کے مطابق ان کو کھڑا کرتا ہے اور ہر / Workshop

Garrage Owner اپنی مرضی کا مالک ہے۔ جہاں چاہتا ہے مرمت کرنی شروع کر دیتا ہے۔ اس سے Smooth Traffic Running میں رخنہ اندازی ہوتی ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ ایک ایک بس کا ایک ایک مالک اور بعض بعض بس کے تو کئی کئی مالک ہوتے ہیں۔ یعنی ہر شخص ''اپنی ڈفلی اپنا راگ'' کے مقولے کا مصداق ہے۔

کراچی کی سڑکوں پر قدم رکھتے ہی جس چیز نے مجھے سب سے پہلے اپنی طرف راغب کیا وہ دلہن کی طرح سجی ہوئی، درمیانی سائز کی بسیں تھیں۔ یہ بسیں تقریباً سبھی کی سبھی پٹھانوں کی ملکیت ہیں۔ ان کے آگے کا بمپر اوپر سے نیچے کو اور سامنے کا نوں بوس نیچے سے اوپر کی طرف Vertically سیدھے سیدھے اور Horizontally ایک Curvature لئے Slope میں ہوتے ہیں۔ چھت پر کنارے کنارے زیادہ تر آگے اور پیچھے کی جانب مور کے پر اور دیگر مصنوعی جہاز لگے رہتے ہیں اور ساتھ ہی مختلف رنگوں میں کپڑے جھالر کی شکل میں لہراتے رہتے ہیں۔ بسوں کے سامنے اور پیچھے، بالخصوص سامنے کی جانب Count less بتیاں لگی ہوتی ہیں جن میں سے زیادہ تر مصنوعی ہوتی ہیں۔ بس کے چاروں جانب، معہ کھڑکیوں کے گلاس کے، لیکن Wind Glass کو چھوڑ کر، مختلف خوشنما رنگوں میں نقش و نگار Paint کئے ہوتے ہیں۔ میری تو ان پر کچھ اس طرح نگاہ تھی جیسے کسی نادیدہ نیل پر ہاتھ کر کے جائے اور پھر دل اس کا تفصیلی اور بغور جائزہ لینے پر مجبور کر دے۔ میرے خیال میں تو اگر مالکان کا بس چلے تو ان بسوں کے Wind Glass پر بھی پینٹ کرا دیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ تمام رنگوں میں کالا رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور کپڑوں کی پٹیاں بھی زیادہ تر کالی ہوتی ہیں۔

ویسے تو سبھی جگہ بجی Vehicle مالکان، ڈرائیور اور کنڈکٹر صاحبان اپنے ذوق کے اعتبار سے Vehicle کے اندر اور باہر مختلف اشعار اور نعرے لکھواتے رہتے ہیں جیسے بری نظر والے تیرا منہ کالا'' لیکن جو شغف میں نے یہاں بسوں میں لکھے ہوئے شعر

سے محسوس کیا وہ دیگر جگہ نصیب نہیں ہوا۔ ایک شعر بالکل آگے کی سیٹ کے سامنے، ڈرائیو کی پشت پر لکھا تھا۔ (جہاں خواتین بیٹھتی ہیں) آپ بھی اس شعر سے لطف اندوز ہوں۔

بلبلو غل نہ کرو مرا محبوب سوتی ہے
تم تو چلی جاتی ہے وہ خفا ہم پہ ہوتی ہے

تقریباً سبھی بسوں میں آگے مستورات بیٹھتی ہیں اور پیچھے مرد۔

اب لمبے سائز کی بہت آرام دہ بسیں بھی چل گئی ہیں اور اُن میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں اب جو نئی بسیں سڑکوں پر آ رہی ہیں وہ سب لمبی بسیں ہیں جن میں سے کچھ تو Air Conditioned ہیں۔

ٹرکوں کا سائز بھی ان کے پٹھان مالکان اور ڈرائیوروں کی ہی طرح تندرست ہے۔ ان ٹرکوں کے آگے کے بمپر اور دل بوکس کے ڈیزائن بھی مذکورہ بالا بسوں کی طرح ہیں۔ جو ٹیکسیاں چلتی ہیں وہ دو رنگوں میں دستیاب ہیں۔ ایک پورے پیلے رنگ میں جو "Yellow Cap" کہلاتی ہیں اور دوسرے پیلے اور کالے مشترک رنگ میں۔ یہ "Black Cap" کہلاتی ہیں۔ ان میں سے یلو کیپ ٹیکسیاں نئی حالت اور قدرے زیادہ گنجائش والی ہوتی ہیں۔ جبکہ بلیک کیپ ٹیکسیاں زیادہ تر پرانی اور محدود گنجائش والی ہوتی ہیں۔ بعض بلیک کیپ تو اتنی پرانی ہیں کہ اُن میں ہارن کی بھی ضرورت نہیں۔ انگریزوں کو "اینٹیکس" (Antiques) کا بہت شوق ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ اُن کی نگاہِ جوہر شناس سے ابھی تک یہ ٹیکسیاں بچی ہوئی ہیں!!۔ اگر اُن کو پتہ چل جائے تو ان ٹیکسیوں کے مالکان عیش کریں۔ یہ ایک ریسرچ کا موضوع ہے کہ کیا حضرت آدمؑ کے وقت میں بھی ٹیکسیاں چلا کرتی تھیں؟۔ اگر نتیجہ ہاں میں نکلتا ہے تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بلیک کیپ ہی رہی ہوں گی اور پھر اس کے بعد میوزیم والوں کو بھی حرکت میں آ جانا چاہئے۔

تقریباً سبھی گاڑیاں گیس سے چلتی ہیں۔ [کراچی میں "سوئی گیس" کی

فراوانی ہے۔] اس سے پیٹرول اور ڈیزل بھی بچتا ہے اور Running Cost بھی کم آتی ہے۔ ساتھ ہی Air Pollution بھی کم ہوتا ہے۔ دہلی کے مقابلے کراچی میں ٹیکسیوں کا کرایہ کافی کم ہے۔

ایک اور چیز جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا وہ گدھوں سے کھینچی جانے والی گاڑیاں ہیں۔ یہ گاڑیاں کافی چھوٹی حد تک بھی ہوتی ہیں جن میں (خدا جھوٹ نہ بلائے) دہلی کی سیور لائن میں رہنے والے چوہے (گھونس) نما چھوٹے چھوٹے دو گدھے مشقت کرتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر بعض مرتبہ تو آنکھیں پھٹی پڑ جاتی ہیں۔ زیادہ تر گاڑیوں پر اردو کے ساتھ ساتھ چینی رسم الخط بھی ہوتا ہے۔ جس سے پاکستان اور چین کے درمیان تعلقات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ایک معلومات کے مطابق اس وقت کراچی میں کم وبیش تیرہ لاکھ ایسی گاڑیاں ہیں۔

[۹] مذہبی بیداری
(Religious Awareness)

پاکستان مملکتِ خداداد کہا جاتا ہے۔ کراچی کی خوشنما، کئی کئی منزلہ مساجد اور ان کے بلند و بالا مینار اس بات کی منہ بولتی تصاویر ہیں۔ اب جو مساجد تعمیر ہو رہی ہیں ان کے گنبد اور مینار، بالخصوص مینار پرانی طرز سے ہٹ کر نئی طرز کے، ایک جداگانہ انداز میں تعمیر کئے جا رہے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، کراچی میں ''فلیٹس'' کے ''بلاکس'' کا کلچر ترقی پر ہے۔ ہر بلاک کے Ground Floor پر مسجد کے لئے ایک ہال ضرور بنایا جاتا ہے۔

سڑکوں کے کنارے کنارے، Main شاہراہوں کے Central Island پر، کچھ کچھ فاصلے سے بورڈ لگے ہیں جن پر قرآنِ حکیم کی آیتیں اور کلمات لکھے ہوئے

ہیں۔ مکانات کے Front Face پر کلمات لکھنے کا بھی کافی شوق دیکھنے میں آیا۔ خواہ ہاتھ کی صفائی (ناجائز طریقوں) سے ہی کیوں نہ مکان تعمیر کرایا گیا ہو لیکن اُس کے باہر "ھذامِن فضلِ ربّی" لکھا ہوا ضرور ہوگا۔

نماز کے وقت فٹ پاتھ اور خالی جگہوں پر بھی لوگوں کو نماز پڑھتے دیکھا۔

تقریباً سبھی ٹیکسیوں میں آگے کی سیٹ کے سامنے سفر کی دعا بہت عمدگی سے لگی رہتی ہے۔

کراچی میں الحمد للہ ہر قسم کی شراب پر سختی سے پابندی ہے۔ صرف غیر مسلم پرمٹ سے اور بیمار مسلمان، ڈاکٹر کے نسخے پر ہی شراب حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک بات جو میری سمجھ میں نہیں آئی، وہ یہ کہ اسلام میں ہر جاندار کی تصویر بنانا یا اپنے پاس رکھنا ممنوع ہے لیکن پھر کیوں ایک اسلامی مملکت میں کرنسی نوٹوں پر قائد اعظم کا فوٹو Print کیا ہوا ہے؟۔ کیا ایسے نوٹوں کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنا جائز ہے؟؟ (معذرت کے ساتھ)

کہتے ہیں کہ اگر کوئی بے قصور مسلمان کسی غیر مسلم کے ہاتھوں محض مسلمان سمجھ کر مارا جائے تو وہ مسلمان سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ لیکن اگر مسلمان مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو کس کا کیا ٹھکانہ ہوگا؟، یہ ایک قابلِ غور بات ہے۔ کراچی میں ہر طبقۂ فکر کے مسلمان رہتے ہیں۔ ایک عقیدے والا دوسرے عقیدے والے پر خوب خوب کھلے بندوں قہر برپا کرتا ہے۔ (میری مراد "سپاہِ صحابہ" اور "تحریکِ جعفریہ" سے ہے۔) یہاں تک کہ مساجد میں نمازیوں اور میتوں تک کو بھی نہیں بخشا جاتا۔ یہ ایک اور تلخ حقیقت ہے کہ ایسا کرنے والے خود کو اپنے فرقے کا علمبردار اور صوم وصلوٰۃ کا پابند گردانتے ہیں۔ اس سے اسلام دشمن قوتوں کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ہم جلد اس حقیقت کو سمجھ جائیں کہ صیہونی طاقتیں ہمہ وقت عالمگیر سطح پر ہمارا چہرہ مسخ کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ وہ

نہیں چاہتیں کہ مسلمانانِ عالم خوشحال اور متمول ہوں، سائنسی اور عسکری میدان میں ترقی یافتہ اور طاقتور بنیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اگر آپ آہ بھی کریں تو دہشت گردوں کے زمرے میں شامل کردیے جائیں اور اگر وہ بستیوں کو بموں اور راکٹوں سے بھی اڑا دیں تو حقوق انسانی کے علمبردار کہلائیں۔ اسی کا نام "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" ہے۔ پھر کراچی میں تو باہمی دست وگریباں سے ان کے منصوبوں کو ہی عملی جامہ پہنایا جارہا ہے۔

[۱۰] صحتِ عامہ
(Health)

شہر میں علاج و معالجہ کے لئے اسپتال تو کافی ہیں لیکن زیادہ تر پرائیویٹ اور Costly ہیں۔ سرکاری شفاخانے ضرورت کے اعتبار سے بہت کم ہیں اور ان کی جغرافیائی تقسیم بھی نہایت غیر مناسب ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں "Apollo" اور "Escorts" جیسے معیاری اسپتال کراچی میں ہی نہیں بلکہ غالباً پاکستان کے کسی دوسرے شہر میں بھی نہیں ہوں گے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امراضِ قلب، گردہ اور دماغ جیسے پیچیدہ امراض کے مریض Heart Surgery، Kidney Transplantation اور Neuro Surgery وغیرہ کے لئے ہندوستان آنا ہی زیادہ پسند کرتے ہیں۔

شہر میں جو نالے ہیں ان کا تذکرہ پہلے کیا ہی جاچکا ہے۔ نیو کراچی کے علاقے میں میں نے دیکھا کہ کافی کچھ گلیاں پکی ہیں۔ ان میں نالیاں بھی پکی ہیں۔ ان نالیوں میں پلاسٹک کی تھیلیاں پڑی رہتی ہیں اور نالیوں کی کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ مختصر ان علاقوں سے تو ہمارے دیہات کی گلیاں زیادہ صحت مند ہیں جہاں ہر گلی کم سے کم اینٹوں سے تو پختہ ہے اور نالیاں بھی پختہ ہیں۔ جگہ جگہ خالی Plots پر گندگی کے ڈھیر لگے ہیں جن کی کبھی

کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ جب کراچی جیسے اہم شہر کا یہ عالم ہے تو اندرونِ ملک مواضعات کا کیا حشر ہوگا ؟

بقر اعید کو میں وہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ تقریباً سبھی اپنے اپنے گھروں میں، حتی کہ بڑے جانوروں تک کی قربانی خود ہی کرتے ہیں۔ عورتیں بھی جانوروں کی تکا بوٹی کرنے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ بڑے جانوروں میں گائے، بیل، اونٹ کی قربانی کی جاتی ہے۔ اونٹ کی قربانی کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لئے زیادہ جانکاری اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اونٹ کا گوشت قدرے جلد تقسیم ہو جاتا ہے۔ کافی کچھ خواہشمند حضرات تو قربان گاہ پر ہی جمع ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے کچھ مخصوص عضو مخصوص امراض میں کام آتے ہیں۔

گوشت کو Deep Freezer میں رکھ کر عرصہ تک استعمال کرنے کا رواج غالباً عام ہے۔ قربانی کے پیٹوں اور دیگر الائش کا سڑکوں کے کنارے، Central Island پر ڈھیر لگا دیا جاتا ہے۔ وہاں افغانی پٹھان بیٹھے رہتے ہیں جو ان کے کارآمد Parts، جیسے ہڈیاں، آنتیں وغیرہ الگ کر لیتے ہیں، اور اس طرح یہ کارآمد Parts اور بچی الائش ٹرکوں میں بھر کر باہر لے جائی جاتی ہے۔ اس سے گندگی بھی صاف ہو جاتی ہے اور کارآمد Parts سے مزید فائدہ بھی حاصل کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے۔

گھر گھر ناریل کے پیڑ کھڑے ہیں لیکن ان کا ڈل ہندوستانی ناریل کے ڈل سے پتلا ہوتا ہے۔ Main شاہراہوں پر One way traffic ہے۔ ایسی شاہراہوں کے بیچ Islands چھوڑے ہوئے ہیں جن پر Plantation کیا ہوا ہے۔ کافی تعداد میں یوکلپٹس کے پیڑ لگائے گئے ہیں۔ [یوکلپٹس کے پیڑ دلدلی علاقوں کے لئے ہی مناسب ہوتے ہیں کیوں کہ یہ Water Table کو Down کر دیتے ہیں جو آج کل ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ اس لئے ان کا Plantation اب متروک ہو گیا ہے۔] اگر ان کی جگہ

ناریل یا دوسری قسم کے پھول دار جیسے کیر، گولڈ مہر، املتاس، کچنار، جگر یندا وغیرہ سے پیڑ یا مناسب سائے دار پیڑ لگا دیئے جائیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ دہلی کے مقابلے میں کراچی میں ہریالی کم دیکھنے کو ملی جس کی وجہ غالباً پانی کی قلت ہے۔

نظم و نسق [۱۱]

(Law & Order)

کراچی میں Law & Order کی صورتِ حال تسلی بخش نہیں کہی جا سکتی۔ (یہ تاثرات ۲۰۰۱ء کے ہیں۔) ہاں البتہ جیسا کہ بتایا گیا، پہلے سے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ [خدا کرے کہ اب مزید بہتر حالات ہو گئے ہوں۔] لیکن ابھی بھی سیاسی چپقلش اور باہمی رنجش و رقابت کا لاوا قتل و غارت گری کی شکل میں کبھی بھی پھوٹ پڑتا ہے۔ گاڑیاں جلا دی جاتی ہیں۔ [اب یہ وباء عام ہے۔] سڑکیں ویران اور چہل پہل ندارد ہو جاتی ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جب بھی کوئی فتنہ یا فساد پھوٹ پڑتا ہے یا کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو سربراہانِ مملکتوں کو غیر ملکی ہاتھ نظر آنے لگتے ہیں۔ خدا کرے کہ عوام کو بھی وہ ہاتھ نظر آنے لگیں اور وہ خود ہی ان کو قلم کر دیں یا پھر یہ طلسم جلد ہی ٹوٹ جائے۔

پہلے، جیسا بتاتے ہیں، کراچی میں امن و امان تھا لیکن بعد میں کچھ ناعاقبت اندیش سیاست دانوں اور حکمرانوں نے اپنی سیاسی کھچڑی پکانے کی غرض سے دانستہ طور پر حالات کو بگاڑا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، جنرل ایوب خان کے دور میں Ethnic دوریاں بڑھیں۔ بعد میں ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ اقتدار میں بھی اس کو بڑھاوا ملا۔ "MQM" کے دور میں تو یہ دوریاں ندی کے دو کنارے بن گئے۔ پھر ریشہ دوانیوں کا دور

چلا اور "MQM" کے بھی دو دھڑے ہو گئے۔ ایک کی باگ ڈور جناب الطاف کے ہاتھ میں رہی تو دوسرے کی قیادت جناب آفاق نے سنبھال لی۔ ایک کا انتخابی نشان پتنگ ہوا تو دوسرے کا موم بتی۔ خوب خوب داؤں پیچ چلے۔ ایک دوسرے کی ڈور کاٹنے کی پوری کوشش کی گئی۔ موم بتی بھی ویسے تو بظاہر موم کی بنی ہوتی ہے لیکن اس کا رشتہ شعلہ سے جڑا ہوا تھا، صحبت کا اثر قبول کرنا ایک لازمی بات ہے۔ پہلے تو دونوں دھڑوں کے بیچ جم کر رن پڑا لیکن بعد میں قدرے ٹھنڈا پڑ گیا۔ دونوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اجارہ داری قائم کر لی۔ حد تو یہ ہے کہ عید الضحیٰ کے دن دونوں دھڑوں کے نمائندے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے علاقے میں چرم قربانی ان کو ملے۔ اس کے لئے وہ پہلے سے ہی رسید دے جاتے ہیں۔ لوگ ڈر کر انہیں کو کھال دے دیتے ہیں۔ اب وہ اس کھال کا کیا کرتے ہیں، یہ خدا جانے یا وہ جانیں۔

یہ بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ یہ بدنظمی انھیں علاقوں میں پھیلتی ہے جہاں So called مہاجرین رہتے ہیں۔ جہاں دیگر Ethnic Groups رہتے ہیں یا ان کی اکثریت ہے وہاں ماحول پُرسکون یا قدرے پُرسکون رہتا ہے۔ مجھے تو تعجب ہے کہ پاکستان کو وجود میں آئے ایک عرصہ ہو گیا لیکن ابھی بھی جو لوگ ہجرت کر کے وہاں گئے تھے، حتیٰ کہ وہیں پیدا ہوئے، وہ خود کو ابھی تک مہاجر کہتے ہیں!! ہندوستان میں بھی پاکستانی علاقوں سے شرنارتھی آئے تھے لیکن وہ تو اب شرنارتھی نہیں کہلاتے اور نہ ہی انھوں نے الگ سے اس نام سے کوئی سیاسی پارٹی ہی تشکیل دی ہوئی ہے۔ اگر سوچا جائے تو مہاجرین تو سبھی ہیں۔ ہندوؤں میں بھی ''شیڈولڈ کاسٹ'' (Scheduled Caste) اور ''شیڈولڈ ٹرائب'' (Scheduled Tribe) کے علاوہ سبھی ہندوستان کے باہری علاقوں سے یہاں ہجرت کر کے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ پنڈت، مصر سے؛ جاٹ، کردستان سے؛ گوجر، چیچنیا سے اور لالہ، افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ اسی طرح ہندوستان یا

پاکستان میں مسلمان بھی زیادہ تر ہجرت کر کے آئے۔ ویسے بھی اسلام میں وطن پرستی کا تصور نہیں ہے۔ مسلمان جہاں رہتا ہے وہی اس کا وطن ہے۔ اسی لئے اسلام ''بندے ماترم'' [اے ماں میں تیری بندنا (بندگی)، یعنی عبادت کرتا ہوں] کی نفی کرتا ہے۔ اسی طرح ''نمسکار'' یا ''نمشکار'' جو سنسکرت کے لفظ ''نت مستشک سویکارم'' (سر جھکانا قبول فرمائیں) کی بگڑی ہوئی شکل ہے، کی بھی اسلام میں ممانعت ہے کیوں کہ مومن غیر اللہ کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔ بقول علامہ اقبال ؒ

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

دراصل اقتدار کے کچھ بھوکوں نے Masses کو گمراہ کر کے اور اشتعال پھیلا کر ان کا استحصال کیا۔ اب یہی دیکھ لیجئے، پہلے "MQM" سے ''مہاجر قومی موومنٹ'' ہو کرتا تھا اور جب سے غیر مہاجر سے شادی ہوئی، "MQM" سے ''متحدہ قومی موومنٹ'' ہو گیا۔ ویسے ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ پہلے یو۔پی سے ''یونائیٹڈ پروونسز'' (U.P.) ہو کرتا تھا اور اب آزادی کے بعد ہم نے اسے اتر پردیش (U P.) کر دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اب لوگ زیادہ سمجھدار ہو رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ تو خود کو اس سحر سے بالکل آزاد کر چکا ہے۔ اُن کو احساس ہو چلا ہے کہ اس زہر سے اُن کی آنے والی نسلیں متاثر ہو سکتی ہیں۔

مساجد اور میتوں پر گولی چلنے کے واقعات پر تو میں پہلے ہی روشنی ڈال چکا ہوں۔ کراچی میں قتل و غارت گری کو شہ عوام میں غیر قانونی، جدید اور سستے داموں پر دستیاب اسلحہ سے بھی ملی ہے۔ یہ اسلحہ افغانستان کی خانہ جنگی کی بدولت پاکستان میں اسمگل ہوتا ہے۔

میں نے کراچی میں خوف و ہراس کا ماحول دیکھا۔ تقریباً سبھی Blocks میں

داخل ہونے سے پہلے اس کے ایک صدر دروازے سے گزرنا پڑتا ہے جہاں اُس ''بلاک''
میں رہنے والے مکینوں نے نجی مسلح ''گارڈس'' (Guards) رکھے ہوئے ہیں۔ پہلے یہ
''گارڈس'' تفصیل سے معلومات کرتے ہیں اور کہیں کہیں تو آنے والے کو اپنا نام، پتہ اور
کس سے اور کیوں ملنا ہے وغیرہ وغیرہ تک رجسٹر پر لکھنا پڑتا ہے۔ کہیں کہیں ''انٹرکوم'' کا
بھی نظام قائم کیا ہوا ہے۔ غرضیکہ ''گارڈس'' مطمئن ہونے کی صورت میں ہی کسی کو اندر
جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ اسی طرح جہاں کوٹھیاں ہیں وہاں کالونی میں سڑکوں پر
Barriers لگاتے ہوئے نجی مسلح ''گارڈس'' بٹھائے ہوئے ہیں۔ [اب یہ نظام
ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں جہاں سرمایہ دار رہتے ہیں، میں بھی عام ہو چلا ہے]
رات کو Barrier گرادیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ رہائش کے باہر، صدر دروازوں
پر Telephonic System کے ساتھ بجلی سے گیٹ Lock ہونے کا نظام لگایا ہوا
ہے۔ جب کوئی شخص باہر گیٹ پر گھنٹی کا Switch دباتا ہے تو صاحب خانہ اندر ہی سے
ٹیلیفون یا ''انٹرکام'' کے ذریعہ پہلے آنے والے سے بات کر کے مانوس ہوتا ہے پھر مطمئن
ہو جانے کی صورت میں اندر ہی سے گیٹ کے Electric تالے کا Switch دباتا ہے
جس سے تالا کھلنے سے گیٹ کھولا جا سکتا ہے۔

عورتیں زیورات پہن کر باہر نہیں نکلتیں اور بچوں کو بھی تنہا باہر نہیں نکلنے دیا جاتا۔
[یہ احتیاط اب یہاں بھی برتی جاتی ہے۔] جیسا کہ مجھے بتایا گیا، لٹیرے بہت ڈرامائی انداز
میں ایک موٹر سائیکل پر کم سے کم دو کی تعداد میں آتے ہیں۔ اگر کسی گھر میں گھسنے کا موقع مل
جائے تو گھر میں گھس کر مکینوں کو یرغمال بنالیتے ہیں اور پھر زیورات و نقد روپیہ لے کر فرار
ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ مل جائے تو اسے اغوا کر کے ''پھروتی'' طلب کرتے ہیں۔ اگر
کوئی عورت زیورات پہنے باہر مل جائے تو زیورات چھین کر فرار ہو جاتے ہیں۔ کبھی تو ایسا
بھی ہوتا ہے کہ عورتوں سے کوئی بھی نام بتا کر اس کا پتہ پوچھتے ہیں اور پھر اس کو بے خبر پا کر

اس کی کنپٹی پر پستول رکھ کر اس کی سونے کی انگوٹھیاں، چین یا بندے، جو بھی وہ پہنے ہوئے، لے کر فرار ہو جاتے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ کوئی مدد کو نہیں آتا [روحانی قدروں کے پامال ہونے اور مادہ پرستی کے سبب اب ہر شہر میں نفسا نفسی کا عالم ہے۔] اور زیورات یا نقدی خاموشی سے دے دی جاتی ہے۔ پولس میں FIR تک نہیں لکھائی جاتی۔ اُن کا کہنا ہے کہ پولس خود اس میں ملوث ہوتی ہے۔ اور اس کو بھی رہزنوں سے ''بھتہ'' ملتا ہے۔ اگر FIR کرا دی گئے تو نہ تو گئی ہوئی چیز واپس آئے گی اور نہ ہی رہزنوں کو پکڑا جائے گا بلکہ اس کے برعکس رہزن مزید دشمن ہو جائیں گے اور پولس بھی بار بار تھانے بلوائے گی اور پریشان کرے گی۔ اس سے لگتا ہے کہ عوام کو پولس پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ [یہی سوچ اب یہاں بھی پروان چڑھ چکی ہے۔]

پولس فورس کو زیادہ فعال بنانے اور عوام میں اس کا اعتماد بحال کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عوامی سطح پر امن کمیٹیاں قائم ہوں جن میں پولس اہلکار بھی شامل ہوں اور کسی بھی بدامنی کی صورت میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ذمہ دار گردانا جائے۔

ایک دن میرے سامنے ہی ایک ایسا حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔ میری یا ان رہزنوں کی قسمت اچھی تھی۔ ہوا یہ کہ ایک دن میں اپنی ہمشیرہ، بھانجے اور ایک دوسرے شخص کے ہمراہ بھانجے کی سسرال گیا جہاں ہماری دوپہر کی دعوت تھی۔ جب ہم واپس چلے تو بھانجے کی بیوی ہمیں چھوڑنے کے لئے دوسری منزل سے نیچے تک آئی۔ اس کا بچہ اس کے ساتھ تھا۔ اچانک ایک موٹر سائیکل پر دو نوجوان بظاہر Criminal چہرے مہرے کے ہماری طرف تیزی سے لپکے۔ انھیں دیکھ کر بھانجے کی بیوی تو اپنے بچے کو کھینچتی ہوئی اوپر کو بھاگ گئی۔ میری ہمشیرہ، بھانجہ اور دوسرا شخص فوراً پھرتی سے کار میں بیٹھ گئے۔ ہمشیرہ نے مجھے بھی جلدی سے کار میں بیٹھنے کو کہا لیکن میں سینہ سپر ہو گیا۔ جس سختی سے ان لوگوں نے مجھ سے کسی کا پتہ پوچھا اسی سختی سے میں نے بھی جواب دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ مجھے

گھورتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک کا ہاتھ جیب میں تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کی جیب میں کچھ اور بھی ہے۔ میں آیۃ الکرسی پڑھتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ مجھے گھورتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں کار میں بیٹھ گیا اور ہم کار اسٹارٹ کر کے چل دئے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ دونوں پھر سے واپس آئے اور جہاں ہم گئے تھے وہاں زینہ کے سامنے جا کر رک گئے ہیں۔ ہم نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ بہو اور بچہ ابھی تک اوپر نہ گئے ہوں اور یہ بدمعاش اوپر چڑھ جائیں۔ یہ سوچ کر ہم نے کچھ ہی فاصلہ پر پھر سے کار روک دی۔ جب ہمیں رکا ہوا دیکھا تو وہ دونوں پھر پلٹے اور ہمارے پاس آکر قدرے زیادہ تلخ لہجہ میں کہا کہ تم نے پتہ نہ بتا کر اچھا نہیں کیا۔ میں بھی ان سے دو دو ہاتھ ہونے کے موڈ میں تھا۔ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے دوسری جانب نکل گئے۔ اگر انھیں واقعی کسی کا پتہ پوچھنا ہوتا تو وہ گلی میں کسی اور سے بھی پوچھنے کی کوشش کرتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ دراصل اگر حوصلہ رکھیں، ہمت کریں اور یکجہتی کا ثبوت دیں تو خود بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ میرے ایک عزیز کے ساتھ پیش آیا۔ رات کو جب وہ عزیز تہجد کی نماز کے لئے اٹھے تو تین آدمی گھر کے اندر آگئے اور ان سے کہا کہ چچا میاں! ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے لیکن جو روپیہ، پیسہ، زیورات ہیں وہ ہمارے سپرد کر دو۔ عزیز سن رسیدہ، پنشن یافتہ اور اللہ والے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ بیٹا! چابیاں یہ رکھی ہیں تم خود دیکھ لو، مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میرے پاس کوئی ایسی قیمتی شے ہے، بجز دعاؤں کے، جو میں تمھیں دے سکوں۔ ہاں! البتہ اگر کچھ تمھارے پاس ہے تو دیتے جاؤ۔ یہ سن کر وہ خاموشی سے اسی مکان کے دوسرے حصے میں رہ رہے ایک کرایے دار کے یہاں گھس گئے۔ کرایے دار حوصلہ مند تھا۔ اس کی اس رہزن سے ہاتھا پائی ہوگئی جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اسی ہاتھا پائی میں پستول زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔ بدمعاش فوراً فرار ہو گئے۔ بعد میں جب پستول

کو دیکھا تو وہ پلاسٹک کا تھا۔ مجھے بھی میرے عزیز نے اس پستول کی زیارت کرائی۔

ایک اور واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ ایک دن شام کو میں اپنے ایک ایسے عزیز سے ملنے کے لئے گھر سے روانہ ہوا جن کو میں تو جانتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر میں نے سوچا کہ پہلے ٹیلی فون پر ان سے رابطہ قائم کر لیا جائے۔ چنانچہ ایک نزدیکی PCO سے میں نے انھیں ٹیلی فون کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے مجھ سے صاف الفاظ میں ملنے سے انکار کر دیا۔ اب ان کے نہ ملنے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ بداخلاق رہے ہوں گے، یا پھر ڈر کی وجہ سے وہ کسی ایسے شخص سے نہ ملنا چاہتے ہوں گے جسے شکل و صورت سے وہ نہ پہچانتے ہوں۔ انھیں بداخلاق تو میں اس لئے نہیں کہہ سکتا کیوں کہ وہاں ہر وہ شخص جو خود کو مہاجر کہتا ہے ہندوستان سے آنے والے مہمان کا پرتپاک خیر مقدم کرتا ہے حتی کہ اسے کھانے پر ضرور مدعو کرتا ہے خواہ اس سے کوئی عزیزداری ہو یا نہ ہو۔ اس سلسلے میں محض دو مثالیں پیش کروں گا۔ میں بال کٹوانے کی غرض سے ایک حجام کی دکان پر گیا۔ حجام باتیں بہت زیادہ کرتے ہیں، یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اس کو یہ پتہ چل گیا کہ میں بجنور کا رہنے والا ہوں، ور علی گڑھ سے آیا ہوں۔ بس پھر کیا تھا، اس نے اپنے تمام گراہکوں کی چھٹی کر دی اور لگا اپنے اور اپنے خاندان والوں نیز دیگر بستی والوں کے حالات بتانے۔ وہ سہارنپور سے پاکستان گیا تھا۔ اس نے نہ صرف بال کاٹنے کی اجرت میرے ازحد اصرار کے باوجود بھی نہ لی بلکہ اپنے گھر پر کھانے کی دعوت بھی کر دی حالانکہ میں نے معذرت چاہ لی۔ اسی طرح ایک دن جب میں ٹیکسی سے اپنی ہمشیرہ کے گھر سے بڑے بھائی (نمبر۱) کے یہاں آیا تو پتہ چلا کہ ٹیکسی والا بھی مظفر نگر (یو۔پی) کا رہنے والا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بجنور کا رہنے والا ہوں۔ اتنا سنتے ہی اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر لگا مظفر نگر سے متعلق اپنے بچپن کی یادوں کو دہرانے۔ منزل پر پہنچنے کے بعد

55391

ں نے مجھ سے ٹیکسی کا کرایہ نہیں لیا ہر چند کہ میں نے بہت ضد کی۔ ساتھ ہی مجھے دعوت دی کہ ایک دن ضرور اس کے ساتھ کھانا کھاؤں اور اس کی ٹیکسی سے بنا کسی اجرت کے کراچی کی سیر کروں۔ اب آپ ہی بتائیں، جہاں غیروں کا بھی یہ حال ہو وہاں اپنوں کے جذبات کا کیا عالم ہوگا!! مختصراً میں ان عزیز کے رات کے وقت ملاقات نہ کرنے کی وجہ یہی سمجھتا ہوں کہ حالات نے انھیں ایسا برتاؤ کرنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس فیملی سے میری ملاقات نہیں ہو سکی کیوں کہ پھر میں نے بھی ان سے دوبارہ کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔

مندرجہ بالا بدامنی کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ صنعت کار اپنے کارخانے کراچی سے دیگر مقامات پر منتقل کر رہے ہیں۔ بالآخر اس سے کراچی کی معیشت بھی متاثر ہوگی اور بے روزگاری بھی مزید بڑھے گی۔ تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کراچی چھوڑ کر باہر جا رہا ہے۔ اس سے Brain Drain ہوگا۔ اس روشن شہر کے گلی کوچے شام ہی سے سنسان ہونے لگے ہیں۔

کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر ایک قلی نے اپنے تاثرات کچھ اس طرح بیان کیے۔ ''بھائی جی! جب فوجی حکومت آئی تو سب ٹرینیں اپنے صحیح وقت سے چلنے لگی تھیں۔ ہم نے، مسافروں نے، غرضیکہ سبھی نے راحت محسوس کی لیکن آہستہ آہستہ جہاں سے چلے تھے ہم سب پھر وہیں لوٹ آئے ہیں۔'' وہ اور بھی نہ جانے کیا کیا حالات بیان کرتا رہا اور میں اپنے وطن کے ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا رہا۔ ۱۹۷۵ء میں جب ہمارے یہاں بھی ہنگامی حالات کا اعلان کیا گیا تھا تو تقریباً سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ (۱) ٹرینیں تو اس حد تک اپنے صحیح وقت پر چلنے لگی تھیں کہ ان سے گھڑی ملائی جا سکتی تھی لیکن پھر کیا ہوا! عوام نے اس کا کیا انعام دیا!! یہی نہ کہ ۱۹۷۷ء میں عام انتخابات کے وقت ہم نے ان کی ضمانتیں تک ضبط کرا دیں، حتی کہ اندرا جی جیسی کرشمہ ساز شخصیت

بھی شکست سے دوچار ہوئی۔ کسی بھی سیاسی شخصیت کو اس سے زیادہ اور کیا سزا دی جا سکتی ہے؟ دراصل ڈسپلن دو صورتوں میں قائم ہو سکتی ہے' یا تو ڈنڈے کے زور سے یا پھر ضمیر کی آواز پر۔ فرق یہ ہے کہ ڈنڈے کا زور تو عارضی ہوتا ہے اور ضمیر کی آواز مستقل ہوتی ہے۔ ڈنڈے سے بچا جا سکتا ہے لیکن ضمیر کی آواز سے مفر نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارا ضمیر مردہ ہے اس لئے جب ڈنڈا آتا ہے تو سر بچانے کی فکر کر لیتے ہیں اور ڈنڈا ہٹتے ہی سب حیا کی چادر تان کر خواب خرگوش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اب حال ہی کے واقعہ کو لے لیجئے، مسٹر بش نے اپنی ہٹ دھرمی سے جس طرح عراق کو تباہ کیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ پہلے تو کہا گیا کہ صدام حسین کے پاس Mass destruction کے اسلحہ کا ذخیرہ ہے اور پھر اس پر حملہ کر کے، صدام حسین کو پھانسی پر لٹکا کر نیز عراق کی معیشت کو تباہ کر کے وہاں کی عوام کو یرغمال بنا لیا گیا، اور اب مطلب حاصل کرنے کے بعد کہا جا رہا ہے کہ وہ معلومات غلط تھیں۔ مسٹر بش کا یہ عجب انداز دلربائی ہے!! تعجب تو اس بات کا ہے کہ پوری مہذب دنیا تب بھی گاندھی جی کے ''تین بندروں'' کے اصول (بری چیز نہ دیکھو، بری بات نہ بولو اور بری بات نہ سنو) کی منکر رہی [عراق پر حملے ہونے سے پہلے]، اور ابھی بھی کچھ کہنے کو تیار نہیں ہے۔ ڈر ہے تو بس اتنا کہ منتظر الزیدی کی دہشت گرد ہے۔ [۱۴ر دسمبر ۲۰۰۸ کو جس وقت جیورج ڈبلو بش عراقی وزیر اعظم، نور المالکی کی موجودگی میں عراق میں الوداعی پریس کانفرنس کر رہا تھا تو قاہرہ میں ''البغدادیہ'' ٹیلی ویژن کے ایک ۲۹ سالہ غیر معروف صحافی، منتظر الزیدی نے یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں جوتے یکے بعد دیگرے بش کو پھینک کر مارنے چاہے، "It is the farewell kiss you dog" (کتے! یہ الوداعی بوسہ ہے۔) (ایسا لگتا ہے کہ منتظر پہلے سے اس کے لئے تیار نہیں تھا ورنہ نشانہ خطا نہ ہوتا۔)] دنیا غریب بھی کیا کرے!، جب اس کے چراغوں میں روشنی ہی نہ رہی ہو جو وہ یہ دیکھ سکے کہ کس طرح منظم طریقے

سے استبدادی اور صیہونی طاقتیں کسی قوم کی بیخکنی اور نسل کشی پر کمربستہ وعمل پیرا ہیں۔ کس طرح سے خودساختہ امن کے پیامبر، مہذب دنیا کے قائد عراق، افغانستان اور فلسطین وغیرہ میں انسانیت کا دامن تار تار کر رہے ہیں! کتنے ہی حسین حق وصداقت کی قربان گاہ پر شہید ہو چکے ہیں!! لیکن کیا کبھی یزید وقت اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو سکا ہے، جواب ہوگا؟ یہ وقتی بات ہے کہ وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیں کہ منتظر الزیدی ایک دہشت گرد ہے۔ بہر حال وقتی طور سے اب ایک طرف تو منتظر کو گرفتار کر کے عراقی حکومت اس پر مقدمہ چلانے کی تیاری کر رہی ہے اور دوسری طرف مظلوم اقوام میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اور جس طرح صدام حسین پھانسی پر چڑھنے کے بعد شہید کہلائے، اسی طرح منتظر بھی اب ایک ہیرو بن گئے ہیں۔ [لوگ اتنے جذباتی ہو رہے ہیں کہ کوئی کہتا ہے کہ میں اپنی ساری زندگی کا سرمایہ اُن جوتوں کے عوض دینے کو تیار ہوں، تو کوئی اپنی ۲۰ سالہ حسین دختر کی اس سے شادی کرنے کو تیار ہے اور وہ لڑکی بھی اس پر فخر محسوس کر رہی ہے، تو کوئی اپنی چوڑی بیش بہا سرمایہ کاران جوتوں کے بدلے عراق ہی میں جا کر منتظر کو نذر کرنے کا متمنی ہے۔ غرضیکہ بغداد کے مشہور بازار، خیام اسٹریٹ سے خریدے گئے بھورے رنگ کے تسموں والے ان جوتوں کی کروڑوں میں بولی لگ چکی ہے، اور اب تک جس طرح سے صیہونی طاقتوں کے ذریعہ جوتوں کے بل پر تاریخ کو اغوا کیا جا رہا تھا وہی جوتے ان کا مقدر بن چکے ہیں اور ایک نئی تاریخ رقم کرنے کے دہانے پر ہیں۔] مسٹر بش کا یہ دورہ بحیثیت ایک امریکن صدر کے تھا۔ اگر سوچیں اور محسوس کریں، تو اس واقعہ سے نہ صرف مسٹر بش بلکہ پوری امریکی عوام کی بے عزتی ہوئی ہے۔ (مسٹر بش نے تو حسب عادت اسے محسوس کیا نہیں) غیرتمندی کا تقاضہ ہے کہ مقدمہ چلنا چاہئے، لیکن کس پر؟، جز پر، یا پھونگل پر؟؟، یہ ایک سوچنے کی بات ہے۔ آج اگر دنیا ہمت کر کے دہشت گردی کے اسباب کی بیخکنی پر آمادہ ہو جائے تو دہشت گردی اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ مگر ہم ہیں کہ

بھوت پرواہ نہ کر کے اس کے سائے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ سوتے ہوئے کو جگایا جا سکتا ہے لیکن سوتا ہوا بننے والے کے سرہانے آپ نقارے بجائیے، اس کا جاگنا تو کجا، وہ کروٹ بھی نہ لے گا۔ ایسا ہی کچھ حال ہمارا بھی ہے۔ ہم دیتے ہیں کہ کیا کریں! ہماری کچھ مصلحتیں ہیں، ہماری کچھ مجبوریاں ہیں!!۔ درصل ہمارے علاقے میں مثل مشہور ہے ''غریب کی بیوی، سب کی ونڈی اور امیر کی بیوی سب کی بھابی''۔ یہی حال ہمارا بھی ہے!!!

حواشی

(۱) یہ صحیح ہے کہ اس دوران کچھ زیادتیاں بھی ہوئیں۔ جیسے ٹرینوں اور بسوں کو بیچ ہی میں روک کر جبراً مسافروں کی نس بندیاں کر دی گئیں۔ Population Control کا ہدف حل وعقد پر کچھ اس درجہ بھوت سوار تھا کہ بعض مرتبہ تو عمر رسیدہ اور غیر شادی شدہ نوجوانوں تک کو بھی نہیں بخشا گیا۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں روک دی گئیں۔ ہر محکمے کا ہدف مقرر کر دیا گیا۔ خفیہ ہر شعبہ ہائے زندگی و نس بندی (Sterilisation) سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ لوگ وقت بے وقت گھروں سے باہر نکلنے میں ڈرنے لگے تھے۔ اور کچھ دھاندلیاں بھی خوب خوب ہوئیں۔ بہتوں کی تو چاندی ہوئی، ایک ایک کیس کی کئی جگہ رپورٹ کیا گیا اور فرضی آپریشن سرٹیفکیٹ بھی خوب جاری کیے گئے وغیرہ وغیرہ۔ اگر یہ چھوڑ دیتے اور یہ سلسلہ جاری رہتا تو بقول شخصیہ ہندوستان میں سینکڑوں قصبے سے چراغ گم ہوتے اور پھر کھجوراہو کے مندروں کی افادیت کا اندازہ ہوتا۔ [کھجوراہو مدھیہ پردیش میں مہوبا (یو۔پی) سے تقریباً پچاس کلومیٹر فاصلے سے بندیلکھنڈ کے علاقے میں اب خود ایک ضلع ہیڈکوارٹر ہے۔ یہ اپنے انوکھے مندروں کے سبب دنیا بھر میں مشہور ایک سیاحتی مرکز ہے۔ اسی وجہ سے یہاں ہوائی پٹی بھی ہے۔ یہ مندر جن میں مرد و زن کی مادرزاد برہنہ تصاویر مختلف آسنوں میں پتھروں پر تراشی ہوئی ہیں، ''چندیل'' خاندان کے راجہ دھنگ دیو (۹۵۰ء تا ۱۰۰۲ء)

(تجروا حتری کی کتاب "سلطان الشہداء" میں ملاحظہ فرمائیں۔) نے بنوائے تھے۔ "چندیل"
راجپوتوں کا قلعہ تھا ۱۲۰۲ء میں قطب الدین ایبک نے لیا۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء کے
درمیان جب میں مدھیہ پردیش میں تعینات تھا تو مجھے بھی ایک وفد کے ہمراہ (ماہ رمضان المبارک
میں) اس جگہ کا اتفاق ہوا۔ جس کا ایک ایک کی تعجب۔ یہ بہت بڑا جمیلہ اور پھر وہیں الان پر
ہندی نذرانہ کرنے چاہئیں] مستحکم جمہوریت کا کہ وقت سے عام انتخابات ہوتے
رہے مگر نے اپنے کا مہرہ کاٹ ہوتے چت کرایا جس کی اندرا جی بھی اپنی زندگی نہ
بچ سکیں۔

دراصل خاندانی منصوبہ بندی اندرا جی کے چھوٹے صاحبزادے اور اس وقت کے
ابھرتے ہوئے نوجوان کانگریسی لیڈر سنجے گاندھی کے دماغ کی اپج تھی۔ کہتے ہیں کہ "باقی
کے بچ میں سے کا بچہ" کی مثل کے مصداق ہمارے تمام کانگریسی لیڈر ہو گئے تھے اور پھر
زبانی طور سے ان میں دوڑ شروع ہو گئی تھی گویا کہ Race تھی کہ کون کس سے آگے
نکل کر کس سے ہمت لے جائے اور کون کس کا منظور نظر بن جائے۔ ایسے حالات میں
عوام کا پسنا قدرتی ہو جاتا ہے۔

یہاں تھے جی کے حوالے سے میں ایک راز پر سے پردہ اٹھانا ضروری سمجھتا ہوں۔ مذکورہ
انتخابات ۱۹۷۷ء میں ہوئے تھے جس میں کانگریس کے تقریباً سبھی Stalwarts
چت ہوئے تھے جن کے اندرا جی جیسی پرکشش ہستی بھی راج نرائن جی سے مات کھا گئی تھی۔
بات یہ ہوئی تھی کہ کانگریس خود وہ کانگریسی نہ کرتے ہوئے بھی گھبرانے لگے تھے۔ ایسے
حالات میں جنوری ۱۹۷۰ء کے دوسرے ہفتے میں ایک دن جب اندرا جی بلند شہر
تشریف لائیں تو میرے سب سے چھوٹے بچے، محمد کامران سعید جواب
L L M کرنے کے بعد MBA کر رہا ہے، گود میں لے کر بھوڑ چوراہے پر کھڑا
ہوا۔ [یہ اشد ان دنوں بھوڑ چوراہے پر واقع ایک کوٹھی میں کرائے پر رہتا تھا۔ اس کے
ٹھیک سامنے ایک ... جوں ہو گئی تھی جواب تمام ہو گئی ہے لیکن وہ کوٹھی مسمار کر کے
عالیشان عمارتوں میں تبدیل کر دی گئی ہے۔] اس وقت اندرا جی کو خوش آمدید کہنے کے لئے
وہاں بمشکل تمام تین یا چار کانگریسی ہی موجود رہے ہوں گے۔ جب اندرا جی وہاں سے

گزریں تو میرے ملازم نے آگے بڑھ کر کامران کا ہاتھ ہوا میں ہلا دیا جس پر اندرا جی نے
جب کارروائی تو ملازم نے کامران کے ہاتھوں سے ایک پھولوں کا ہار اندرا جی کے گلے
میں ڈلوا دیا۔ اندرا جی نے کامران کے گال کا بوسہ لیا اور چلی گئیں۔ میں ان دنوں
بلند شہر کے ایک تحصیل صدر مقام، سکندر آباد میں تعینات تھا۔ اس دن نہروں کا دورہ کرنے
کے بعد جب شام کو بچوں کے پاس آیا تو پوری بات کا پتہ چلا۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی
طوفان آنے والا ہے۔ [سکندر آباد کا M.L.A. جو برسرِ اقتدار جنتا پارٹی سے تھا،
میرے خلاف چل رہا تھا (مجھ سے پہلے اسے کچھ ناجائز فوائد حاصل ہوتے رہتے تھے جو
میرے وہاں جوائن کرنے سے بند ہو گئے تھے۔ میری مخالفت میں میرے چند ماتحت بھی اس
کے ساتھ تھے۔) وہ میرے وہاں سے تبادلے کی کوشش بھی کر چکا تھا لیکن کامیابی
حاصل نہ ہو سکی تھی۔ (چیف انجینئر نے میرا یہ کہہ کر تبادلہ کیا تھا کہ تم نے وہاں ایک
Challenge پر فتح حاصل کر لینے کے بعد میں تمہیں ایک دوسرے چیلنج پر تعینات کر رہا
ہوں جہاں نہریں ناموں سے بھی بدتر حالت میں ہیں۔ تمہیں بھیجا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے
وہ میرے وہاں سے تبادلے ہونے میں ناکام تھے۔)] میرا اندازہ صحیح نکلا اور میرا تبادلہ کر دیا
گیا۔ (Order No रगी-34-ड-1/171 सिंचित 1980, dated 16-1-80)
[MLA کو یہ سنہرا موقع ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے فوراً دہلی جا کر نمک مرچ لگاتے ہوئے
چیف منسٹر (ان دنوں چیف منسٹر دہلی آئے ہوئے تھے) سے شکایت کی کہ میں "کانگریس
پارٹی" سے ہمدردی رکھتا ہوں لہٰذا میرا ضلع سے فوراً ہٹایا جانا بہت ضروری ہے۔ (بابو
بنارسی داس جی کا تعلق بلند شہر ضلع سے تھا)] جب کانگریسیوں کو پتہ چلا تو انھوں نے سنجے جی
سے پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے یہ بتایا کہ اس تبادلے سے کانگریس، بالخصوص اندرا جی کی
بے عزتی ہوئی ہے۔ چنانچہ سنجے جی نے دو بار شری مرکی سنگھ بالیان جو بلند شہر سے ایم۔ پی رہ
چکے تھے، کے ذریعہ مجھے بلوایا لیکن میں نے یہ کہتے ہوئے معذرت چاہی کہ میں کسی
سیاست میں نہیں پڑنا چاہتا، تبادلہ کوئی Punishment نہیں ہے۔ اس پر سنجے جی نے
تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہلوایا کہ اسی سال فروری کے تیسرے ہفتے تک بابو بنارسی داس
جی کی منسٹری گر جائے گی اور Governor Rule ہو جائے گا۔ [ان دنوں سنجے جی اور

راج نرائن جی کے درمیان موہن نگر کے ''موہن میکن'' ڈاک بنگلے میں خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔] چنانچہ ۱۷ر فروری ۱۹۸۰ء کو بابو بنارسی داس جی کی سرکار گر گئی اور یو۔پی میں Governor Rule نافذ ہو گیا اور اسلام صاحب (Retd I G Police) کو گورنر کا صلاح کار مقرر کر دیا گیا۔ [بابو بنارسی داس جی ۲۸ر فروری ۱۹۷۹ء سے ۱۷ر فروری ۱۹۸۰ء تک یو۔پی کے وزیر اعلی رہے اور ۱۹۸۹ء میں انتقال کر گئے۔] اس کے بعد میرا ابھی تبادلہ روک دیا گیا۔ [Cancellation Order No. C-178इ-1/171 विविध/80, dated 14-3-80]

[۱۲] معاشی حالات

(Economical Conditions)

اگر کسی ایک ہی منقسم خاندان کے ہندوستانی اور پاکستانی افراد کا موازنہ کیا جائے تو میرے تجزیے کے مطابق پاکستانی تعلیمی اور معاشی، دونوں میدانوں میں، ہندوستانیوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال اور متمول ہیں۔ وہاں زیادہ مواقع ہیں، البتہ ہندوستان کا تعلیمی معیار پاکستان کے مقابلے میں قدرِ بہتر ہے۔ پاکستان میں ہندوستانی مصنفین (Writers) کی کتابوں، بالخصوص Technical Books کی بہت مانگ ہے۔

پاکستان میں ایک متوسط خاندان کے گھر میں بھی Deep Freezer, Deep Geezer، رنگین ٹی۔وی، Cable Network Connection ضرور ہوگا۔ اگر کچھ اور زیادہ خوشحال خاندان ہے تو اس کے گھر میں Air Conditioner, Computer، ٹیلی فون، کمروں میں فرشی قالین ضرور ہوں گے۔ گیس کا کنکشن تو وہاں تقریباً ہر گھر میں ہے۔ باورچی خانے کے ساتھ ساتھ کمروں میں بھی

بجلی کی طرح گیس کی، پَن کے کنکشن ہیں۔ ہر کمرے میں گیس سے جلنے والی لائٹیں لگی ہوتی ہیں۔ بجلی جانے کی صورت میں فوراً ان لالٹینوں کو روشن کردیا جاتا ہے۔

''مارکیٹس'' ملکی نیز غیر ملکی سامان سے بھری ہوئی ہیں۔ غیر ملکی سامان میں چین اور کوریا سرِ فہرست ہیں، اگر ایک چھوٹا سا کھلونا، ٹین کی کار بھی خریدیں تو وہ بھی چین کی بنی ہوگی۔ اب تو یہاں بھی چینی کھلونوں اور دیگر اشیاء کی بھرمار ہے۔ بلکہ دنیا کے ہر خطے میں چینی مصنوعات، خاص کر کھلونے چھا چکے ہیں۔

وہ "Multi-National Companies" جو ہندوستان اور پاکستان، دونوں میں مال تیار کرتی ہیں، ان کے ایک ہی برانڈ کے پروڈکٹ پاکستان میں قدرے Superior کوالٹی کے ہیں۔ جیسے Cosmetics، شیونگ بلیڈ وغیرہ جس کا میں نے خود تجربہ کیا۔

سوکھی اور خشک میوہ نیز پھلوں کی تو بہت افراط ہے۔ سوکھی میوہ میں چلغوزے [ہمارے یہاں اکثریت اس میوہ کے نام سے بھی ناآشنا ہے جب کہ وہاں یہ مونگ پھلی کے انداز میں استعمال ہوتی ہے۔] بادام، چھوارے اور آخروٹ، خشک میوہ میں منقہ، کشمش اور پھلوں میں کینو، سردا، گرما، انگور [چمن کا انگور مشہور ہوتا ہے جو پاکستان میں واقع ہے۔] انار [قندھار، جو افغانستان میں واقع ہے کا انار مشہور ہوتا ہے۔] چینی سیب اور آم اچھے معیار کے، وافر مقدار میں اور سستے داموں پر دستیاب ہیں۔ چینی سیب کا رنگ کچھ پیلا پن لئے (چینی عوام کی طرح) ہوتا ہے اور یہ بہت خوش ذائقہ ہوتا ہے۔

عوام کی خوشحالی کا یہ عالم ہے کہ ایک اوسط درجے کا خاندان بھی مرغی کا گوشت استعمال کرتا ہے۔ گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں جن کو ''ماسی'' کہتے ہیں، ۲۵۰ سے ۳۰۰ روپیہ کے درمیان فی کام ماہانہ اجرت لیتی ہیں۔ یہ ''ماسیاں'' پنجابی، بنگلہ دیشی یا South Indian مہاجر ہوتی ہیں۔ پٹھان اور بلوچی اپنی

عورتوں کو باہر نہیں نکلنے دیتے۔

پاکستان میں معیارِ زندگی بلند ہونے یا معاشی خوشحالی کی ایک خاص وجہ اس کے برادر عرب ممالک سے خصوصی تعلقات ہیں جس کی وجہ سے ہر خاندان کا ایک نہ ایک فرد خواہ وہ وہاں مزدوری یا صفائی کا کام ہی کرتا ہو، ضرور مشرقِ وسطیٰ میں خدمات انجام دے رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہاں سے یورپین ممالک اور امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا جانا قدرے آسان ہے۔ اس سے ملک میں زرِ مبادلہ آتا ہے اور عوام کی قوتِ خرید بڑھتی ہے۔

جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں عوام خوشحال ہیں وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی حکومت کی معاشی حالت ہندوستانی حکومت کے مقابلے میں بہت خستہ ہے لیکن دونوں حکومتوں کے معاشی حالات کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آزادی سے پہلے انگریزوں نے اُن علاقوں کا Industrialization نہیں کیا یا ان علاقوں میں Developmental Work نہیں کرایا اور نہ ہی Educational Institutes ہی کھولے جہاں سے انھیں سپاہی ملتے تھے۔ آج پاکستان ان علاقوں کا نام ہے جہاں سے انگریزوں کو سپاہی دستیاب ہوتے تھے۔

۲۶ راپریل کو میں نے انڈین چیک پوسٹ، اٹاری پر پاکستانی کرنسی کے پانچ سو روپیہ ''اسٹیٹ بینک آف انڈیا'' کے کاؤنٹر پر بدلے۔ اس کے بدلے میں مجھے انڈین کرنسی کے محض تین سو پچیس روپیہ ہی ملے۔ یعنی پاکستانی کرنسی انڈین کرنسی کے مقابلے میں ۵۶ فی صدی تھی۔ [سنہ ۲۰۰۱ء میں]

حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں عوام خوشحال اور حکومت کنگال ہے۔ جب کہ ہندوستان میں حکومت خوشحال اور عوام کنگال ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں Tax Payees کی شرح پاکستان سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی استحکام کا بھی اس میں بہت دخل ہے۔ پھر پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ وہاں

شراب پر پابندی ہے جب کہ ہندوستان میں جمہوریت ہے اور یہاں قدم قدم پر نیز تقریباً ہر گاؤں میں شراب کی دکانیں ہیں۔ اس سے حکومت کو زر کثیر ملتا ہے۔

دونوں حکومتوں کے مندرجہ بالا معاشی فرق کی ہی وجہ سے پاکستان میں حکومتی اداروں کی حالت خستہ ہے جب کہ ہندوستان میں سرکاری ادارے اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑے ہیں۔ محکمۂ ریلوے ہو یا Industrial Sector محکمہ ٹرانسپورٹ ہو یا Agriculture Sector، Film Industry ہو یا Information & Technology Sector، ہندوستان پاکستان سے بہت آگے ہے اور یہ بات پاکستانی عوام بھی تسلیم کرتے ہیں مگر یہ کہہ کر کہ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور اس کے Resources بھی بہت زیادہ ہیں، جو کسی حد تک صحیح بھی ہے۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کا تو یہ عالم ہے کہ اس کے سامنے پاکستانی فلم انڈسٹری طفلِ مکتب جان پڑتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری میں جو صف اول کی ہستیاں ہیں ان میں سے زیادہ تر کے خاندان کا تعلق انھیں علاقوں سے ہے جو اب پاکستان میں ہیں۔ مثال کے طور پر ''کپور خاندان''، ''پٹھان خاندان'' (شہنشاہ جذبات یوسف خاں المشہور بہ دلیپ کمار اور رنگ خان، شاہ رخ خان وغیرہ) اور ''بھٹ خاندان'' وغیرہ وغیرہ۔ گھروں میں، ریستوراں میں، دوکانوں پر، ٹیکسیوں اور بسوں میں حتیٰ کہ محفلوں تک میں انڈین گانے (خاص کر 'برسات'، 'آوارہ'، 'مغلِ اعظم'، 'آہ'، 'پاکیزہ'، 'انارکلی' وغیرہ فلموں کے۔) ہی سنے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، تقریباً ہر گھر میں Cable Network کنکشن ہے۔ پاکستانی شائقین زیادہ تر انڈین چینلس پر انڈین فلمیں (خاص کر 'مغلِ اعظم'، 'شعلے'، 'انارکلی'، 'صاحب بی بی اور غلام' وغیرہ) اور ڈرامے ہی دیکھا کرتے ہیں۔ انھیں انڈین فلم انڈسٹری سے جُڑے ہر اداکار اور اداکارہ کے بارے میں خوب خوب جانکاری ہے، حتیٰ کہ ان کی نجی زندگی کے بارے میں بھی۔ حد یہ ہے کہ

نوجوان نسل نے تو انڈین فلم اداکاراؤں اور اداکاروں کے فوٹو تک Computers میں Feed کئے ہوئے ہیں اور جب جی چاہتا ہے درشن کر لیتے ہیں۔ البتہ غزل گائیکی اور اردو شعر و شاعری کے معاملے میں حالات مختلف ہیں۔ اس میدان میں پاکستان، ہندوستان سے صدیوں آگے ہے۔ پاکستانی ڈرامے حقیقت کے بہت قریب محسوس ہوتے ہیں اور ان میں اداکاری Natural دکھائی دیتی ہے۔ ان میں مکالمے جاندار اور گیت یہ نغمے بامعنی ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہندی غیر مسلم پڑھے لکھے گھرانوں میں بھی پاکستانی ڈراموں کا بہت craze ہے۔ لب ولہجہ کا بھی عوام میں مقبولیت سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ چونکہ پاکستانی فلم انڈسٹری میں زیادہ تر پنجابی نژاد ہیں جن کا اپنا ایک منفرد لب ولہجہ ہوتا ہے، اس لئے ہوسکتا ہے کہ کراچی میں جو اردو بولنے والے ہیں وہ بمبئی کا اور ہندوستان میں جو پنجابی بولنے والے ہیں وہ لاہور [پاکستانی پنجاب میں لاہور کی فلم انڈسٹری اپنے ملک میں سب سے پرانی ہے۔] کا لب ولہجہ زیادہ پسند کرتے ہوں۔

پاکستانی ریلوے اور ہندوستانی ریلوے کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں جہاں ریلوے اسٹیشنوں کا Renovation اور ان کا Extension کیا گیا ہے وہیں ٹرینوں کی رفتار اور ان میں مزید بوگیوں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ بوگیوں کو آرام دہ اور جدید بنایا گیا ہے۔ Railway Track کی Maintenance بھی اتنی عمدہ ہے کہ ٹرین کی رفتار بڑھا دیے جانے کے باوجود بھی زیادہ کچھ جھٹکے محسوس نہیں ہوتے، کافی کچھ لمبائی میں Track ڈبل اور Electrified بھی کر دیے گئے ہیں۔ اُدھر پاکستان ریلوے کی حالت خستہ ہے۔ زیادہ تر بوگیاں بہت پرانی اور تکلیف دہ ہیں۔ ان میں خستگی کا تو یہ عالم ہے کہ اندر سے جگہ جگہ فرش اور Sides سے Covers اُدھڑ گئے ہیں، گدیاں پھٹ گئی ہیں اور اُن میں سے Cushion نکلنے لگا ہے۔ زیادہ تر کھڑکیوں میں گلاس ندارد ہیں، بلکہ اپنی مرضی کی وہ خود مختار ہو گئی ہیں۔ اگر

آپ کھڑکی اٹھائیں تو وہ خود بخود نیچے گر جائے گی اور اگر نیچے گرائیں تو جھٹکے سے خود بخود اوپر اُٹھ جائے گی۔ کراچی سے واپسی پر ایک پُر لطف منظر دیکھنے کو ملا۔ ایک پنجابی مسلم فیملی کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ کھڑکی کچھ مذکورہ خودمختاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ پہلے تو بار بار اس فیملی کا ایک سن رسیدہ شخص اُس کو اوپر اٹھاتا رہا لیکن بعد میں اس نے قدرِ غصہ میں آ کر ایک کھڑکی کو تو ایک کمربند کے ذریعہ کھڑکی میں لگی Horizontal bars سے باندھ دیا اور دوسرے کے نیچے سوراخ میں پتھر سے ایک لکڑی ٹھوک دی۔ تب جا کر اس بندھن اور ٹھوکا پیٹی سے کھڑکی باز آئی۔

Railway Track کے Maintenance کا تو یہ عالم ہے کہ جب ٹرین کچھ رفتار پکڑتی ہے تو مسافر جھولا جھولنے لگتے ہیں۔ ڈر اس بات کا ہے کہ اگر حکومت اور ریلوے ڈپارٹمنٹ کے اس جھولے کا پتہ چل گیا تو کہیں وہ ٹکٹ کی قیمت میں اضافہ نہ کر دے۔

''سمجھوتہ ایکسپریس'' میں، میں نے دیکھا کہ پاکستانی ریل میں مال گاڑیوں کی بوگیوں کا اضافہ کیا جاتا ہے جن میں مسافر بھی بیٹھتے ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ پاکستان ریلوے کے پاس بوگیوں کی ازحد کمی ہے۔ ٹرین میں Reservation کرانے کے لئے Reservation Slip کی ضرورت نہیں پڑتی۔ Reserved Bogies میں عام مسافر بنا روک ٹوک سفر کرتے ہیں۔ [اب یہ مرض یہاں بھی عام ہو چلا ہے۔]

آزادی کے بعد سے ریلوے اسٹیشنوں کی حالت میں تو شاید کوئی سدھار ہی نہیں گیا۔ Platforms پر جو شیڈ آزادی کے وقت رہے ہوں گے وہ بدستور موجود ہیں۔ اگر فرق آیا ہے تو محض اتنا کہ اُن کی Sheets خستہ ہو گئی ہیں۔ اس سے حکومت کے آثارِ قدیمہ سے لگاؤ کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ ابھی بھی بہت عمدگی سے پرانی یادوں کو

سینہ سے لگائے ہیں۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ ہم نے پرانی یادوں کو بھلانا شروع کر دیا ہے، حتیٰ کہ شہروں اور شاہراہوں کے ناموں کو بھی تبدیل کر دیا ہے۔ بس اب مقبروں، مزارات اور خانقاہوں کے نام تبدیل کرنے کے سفر پر نکلنا باقی ہے۔ ویسے اس سمت میں بھی شروعات ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو کی جا چکی ہے۔(۱) یاد پڑتا ہے کہ جب شروع شروع میں شاہراہوں کے نام تبدیل کئے گئے تو ماسٹر تارا سنگھ جی نے قدرے طنزیہ لہجہ میں چٹکی لیتے ہوئے جواہر لعل جی سے کہا تھا کہ کیوں نہ ہمایوں کے مقبرہ کا بھی نام تبدیل کر کے جواہر لال جی کا مقبرہ قرار دیا جائے۔

حواشی

(۱) ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء ہندوستان کی تاریخ کا وہ سیاہ دن ہے جس دن ایک منظم طریقے سے "ہندو دہشت گردوں" [خود ساختہ "رام بھگتوں"] نے تاریخی "بابری مسجد" کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا تاکہ وہاں رام مندر تعمیر کیا جا سکے۔ ویسے تو رام رتھ یاترا کے بانی اور سابق ہندوستانی وزیر داخلہ جناب مسٹر جناح کے قصیدے پڑھ رہے ہیں، ایک انکوائری کمیشن کے سامنے یہ بیان دے چکے ہیں کہ مذکورہ مسجد کو شہید کرنے کا پہلے سے کوئی پلان نہیں تھا بلکہ وہ خود ساختہ "رام بھگتوں" کے جوش کی نذر ہوگئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں پہلے سے بخوبی مشقیں کی جا چکی تھیں اور یہ معاملہ ضرور ہماری سرکاری خفیہ تنظیموں کے علم میں بھی رہا ہوگا۔ مجھے خود میرے ایک دوست جو "وشو ہندو پریشد" سے ہیں نے کافی عرصہ پہلے وہ سب بتا دیا تھا جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو رونما ہوا۔ [تفصیل کے لئے احقر کی کتاب "سید عبدالرحمن بن فضل اللہ" ملاحظہ فرمائیں۔] ان دنوں احقر دیوریا میں تعینات تھا۔ اگرچہ مجھے اس وقت اس دوست کے کہنے پر یقین نہیں آیا تھا [جس کی مناسب وجوہات تھیں] پھر بھی میں دیوریا سے فوراً گھر آ گیا [جہاں میرے بچے رہتے تھے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر واقعی ایسا سانحہ ہو گیا تو ضرور کشیدگی پیدا ہوگی، اور ہو سکتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات بھی پھوٹ نکلیں۔ ویسے

بھی علی گڑھ ایک Volcanic شہر ہے۔] میں نے احتیاط کی کہ یہ بات کسی کو نہ بتاؤں [اس دوست نے مجھ سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ میں کسی کو یہ بات پہلے سے نہ بتاؤں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ ہضم بھی نہیں ہو رہی تھی۔] میں نے اپنے محلے کا خاموشی سے سروے کرا کر ان خاندانوں کی ایک فہرست مرتب کر لی تھی جو مزدور پیشہ تھے۔ پھر وہاں گیہوں کی پسوا کر، وافر مقدار میں نمک، مرچ وغیرہ اسٹور کر لیا تھا۔ مکان کی چھت پر بڑی تعداد میں کنڈوں کا ڈھیر لگوا لیا تھا۔ غرضیکہ جب ۶ دسمبر آیا اور کچھ سیاسی قاتلوں نے اس کالے کارنامے کی وجہ سے ماحول گرمایا اور علی گڑھ میں کرفیو لگا تو میں نے ترتیب سے ایک مدت تک مذکورہ خاندانوں کو کرفیو کے دوران مستقل راشن، دودھ وقت کے مطابق مہیا کر کے ان کے غم کو کم کرتا رہا۔

اب آگرہ کے تاج محل، دلی کے قطب مینار وغیرہ کے بارے میں بھی یہ متعصب طاقتیں تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہی ہیں۔ [خدا خیر کرے] ان کا تو یہاں تک کہنا ہے۔ جودھا بائی نامی اکبر کی کوئی راجپوت رانی تھی ہی نہیں۔ دراصل جس کی بھی اس کی 'ہینس' ہو رہا ہے۔

[۱۳] قابلِ دید چند یادگاریں

(Worth Seeing Few Monuments)

۱۔ "<u>مزارِ مبارک حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ</u>": حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ سیدنا حضرت امام حسنؓ [م ۵۰ھ (۶۷۰ء)] کے پڑپوتے بتائے جاتے ہیں، اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آپ کا سنہ ولادت ۹۸ھ (۷۱۶ء) اور سنہ شہادت ۱۵۱ھ (۷۶۸ء) ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آپ نے محمد بن قاسم [عامل بصرہ و حجاز کا بھتیجا نسب

نے خلیفہ ولید کے زمانے میں ۹۲ھ (۷۰۱ء) میں ساحلِ سندھ سے ملتان تک کے علاقے کو فتح کر کے اس میں اسلامی پرچم لہرایا اور ۹۷ھ (۷۱۵ء) میں اپنوں ہی کے ہاتھوں شہید کر دیا گیا۔] کو سندھ پر حملہ کرنے کی بشارت دی تھی۔ ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ آپ محمد بن قاسم کے لشکر کے ساتھ وارد ہو کر شہید ہوئے۔ سیدنا حضرت حسنؓ کے سنہ شہادت کے حوالے اور ''علم الانساب'' کی رو سے یہ تو صحیح ہو سکتا ہے کہ آپ سیدنا کے پڑپوتے رہے ہوں اور آپ کا سنہ شہادت ۱۵۱ھ رہا ہو' لیکن آپ کے سنہ شہادت اور محمد بن قاسم کے سنہ شہادت نیز اس کے سندھ کو فتح کرنے کی رو سے یہ صحیح معلوم نہیں دیتا کہ آپ محمد بن قاسم کے لشکر کے ساتھ وارد ہوئے یا آپ نے محمد بن قاسم کو حملہ کرنے کی بشارت دی تھی۔ [خدا ہی بہتر جانتا ہے۔]

یہ مزار شریف کلفٹن میں باغ ابنِ قاسم کے نزدیک، سطح زمین سے تقریباً ۸۰ میٹر اونچی ایک پہاڑی پر واقع اور تقریباً ایک ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر ۹۱۸ء میں ہوئی۔ مزار کے گنبد اور دیواروں پر سفید اور ہرے رنگ سے دھاریاں پینٹ کی ہوئی ہیں جو بہت خوشنما اور جاذب نظر دکھائی دیتی ہیں۔ پورے مزار کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور جھنڈوں سے سجایا ہوا ہے۔

مزار شریف پر ہر وقت زائرین کا مجمع لگا رہتا ہے۔ آپ کے توسط سے منت مانگنے والے مزار کے چاروں جانب والی نقرئی ریلنگ کو چومنے اور اس پر پھولوں کے ہار چڑھانے کے لئے گھمسٹ کر

چلتے ہیں۔

۲۔ "مزارِ قائداعظم": یہ نوے فٹ اونچے پلیٹ فارم پر اور کراچی کی مصروف ترین شاہراہ، ایم۔اے۔ جناح روڈ پر واقع ہے۔ پلیٹ فارم کی لمبائی ۳۰۰ فٹ اور چوڑائی ۲۷۵ فٹ ہے۔ پلیٹ فارم سے مزار کے گنبد تک اونچائی ۱۰۶ فٹ اور ۱۶ انچ ہے۔ اس کی تکمیل ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں ہوئی۔ [مسٹر جناح کا انتقال ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوا۔] مزار کا ڈیزائن ماہر تعمیرات (Architect)، یحییٰ مرچنٹ نے تیار کیا تھا۔ یہ ایک Massive Structure ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صاحب مزار کی شخصیت کو ذہن میں رکھ کر اس کو ڈیزائن کیا گیا ہو۔ ویسے بحیثیت ایک انجینیر مجھے اس کا Elevation پسند نہیں آیا۔ البتہ Location بہت عمدہ ہے۔ مزار کے نزدیک ہی پاکستان کے پہلے وزیر اعظم، نواب زادہ لیاقت علی خان، قائد اعظم کی ہمشیرہ، محترمہ فاطمہ جناح، سردار عبدالرب نشتر وغیرہ، میں سے بھی مزارات ہیں۔

۳۔ "تین تلواریں" یہ Monument کلفٹن میں واقع ہے جو سنگ مرمر کا بنا ہے۔ کہتے ہیں کہ تین تلواروں سے مراد قائد اعظم کے تین اصول اتحاد، یقین محکم اور نظم و ضبط سے ہے۔ اس کو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی "پاکستان پیپلز پارٹی" کے منشور بطور تعمیر کروایا تھا۔ پہلے ان کو P P P [Pakistan People's Party]

کے پرچم کے تین رنگوں۔ کالا، ہرا اور لال میں پینٹ کرانے کی تجویز تھی لیکن بعد میں ان کو سفید ہی رہنے دیا گیا۔

۴۔ **"گورنر ہاؤس":** یہ تقریباً ۱۴۰ ایکڑ کے وسیع و عریض رقبہ پر سول لائن میں واقع ہے۔ اس کے اطراف کمشنر سیکریٹریٹ، کراچی جمخانہ، باغ قائد اعظم (پولو گراؤنڈ) اور شمال مغرب میں ہیولاک روڈ واقع ہے جس پر اس کا مین گیٹ ہے۔ اس کو سر چارلس نیپئر، کمشنر سندھ نے بطور اپنی رہائش گاہ تعمیر کرایا تھا۔ پہلے یہ ایک منزلہ تھی لیکن بعد میں، (۱۸۵۶ء میں) اس میں بالائی منزل کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔

۵۔ **"چیمبر آف کامرس":** یہ سندھ مدرسہ کے قریب فریئر روڈ پر واقع ہے۔ اس کی تعمیر کے لئے ۱۸۲۳ء میں قطعہ اراضی الاٹ کی گئی تھی۔ ۱۸۶۵ء میں اس کی افتتاحی تقریب انجام پائی۔

۶۔ **"میونسپل کارپوریشن":** یہ بندر روڈ پر واقع ہے۔ اس کا سنگِ بنیاد ۴ر دسمبر ۱۸۹۵ء کو بمبئی کے گورنر، لارڈ سینڈ ہرسٹ نے رکھا تھا۔ یہ مصری، اسلامی اور ہسپانوی فنِ تعمیر کے ملے جلے طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی چھت پر چار خوشنما گنبد اور درمیان میں، سامنے کی جانب مرکزی دروازہ پر ۱۶۲ فٹ اونچا ٹاور ہے جس کے چاروں اطراف میں چار گھنٹے نصب ہیں۔ ۷ر جنوری ۱۹۳۲ء کو اس کی افتتاحی تقریب ہوئی تھی۔

۷۔ "**کراچی پورٹ ٹرسٹ**": یہ عمارت ۱۹۱۶ء میں تعمیر ہوئی۔ اس کا افتتاح تقریب ۵ جنوری ۱۹۱۶ء کو بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اس کو اسپتال میں تبدیل کردیا گیا تھا لیکن پھر مئی ۱۹۱۹ء میں اسپتال کو ختم کردیا گیا۔

۸۔ "**سندھ ہائی کورٹ**": یہ سندھ اسمبلی کے سامنے واقع ہے اور سندھ کی مقامی اور رومن طرزِ تعمیر کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی تعمیر ۱۹۲۹ء میں مکمل ہوا اور اس پر اس وقت تین لاکھ روپیہ لاگت آئی تھی۔

۹۔ "**فلیگ اسٹاف ہاؤس**": یہ فاطمہ جناح روڈ پر واقع ہے۔ ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) میں اس عمارت کو قائداعظم محمد علی جناح نے اس کے مالک سہراب کٹرک سے خرید لیا تھا۔ اب حکومت نے اس کو قائداعظم کی یادگار بطور اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

۱۰۔ "**ہندو جمخانہ**": اس عمارت کو آرکیٹیکٹ آغا احمد حسین نے ڈیزائن کیا تھا۔ اس کا طرزِ تعمیر راجستھان کے شاندار محلات سے ملتا جلتا ہے جس میں مغل اور ہندو، دونوں کی ثقافت کی جھلک ملتی ہے۔ یہ [illegible] گارڈن" کے سامنے واقع ہے۔

۱۱۔ "**پارسیوں کی عبادت گاہ**": یہ فریئر اسٹریٹ صدر میں واقع ہے۔ اس کے آرکیٹیکٹ مسٹر مستری تھے۔ یہ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں تیار ہوئی۔

۱۲۔ "موہاٹا پیلیس": سنگ سرخ کی یہ خوشنما عمارت کلفٹن کے پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس کو کراچی کے ممتاز تاجر مسٹر شورتن موہاٹا نے تعمیر کرایا تھا۔ طرزِ تعمیر ہندو جمخانہ جیسی ہے۔ اس کے آرکیٹیکٹ بھی آغا احمد حسین تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی زندگی کے آخری ایام اسی بلڈنگ میں گزارے۔ اسی لئے اس کا نام قصرِ فاطمہ بھی رکھ دیا گیا تھا۔ یہ عمارت کچھ عرصہ تک پاکستان کے دفتر خارجہ کے تصرف میں بھی رہی۔

۱۳۔ "وکٹوریہ میوزیم": یہ عمارت بطور میوزیم بنائی گئی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس کو بطور "اسٹیٹ بینک آف پاکستان" کے استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد اس میں کئی دیگر دفاتر رہے۔ اب پھر سے اس کو بطور میوزیم استعمال کرنے کے لئے خالی کرالیا گیا ہے۔

[۱۴] مختصراً کراچی میں ترقیاتی کام

۱۔ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں کراچی سے پہلا سرکاری اخبار شائع ہوا۔

۲۔ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں کراچی میونسپلٹی وجود میں آئی۔

۳۔ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں ریلوے اسٹیشن کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

۴۔ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں امریکہ میں خانہ جنگی کی وجہ سے ہندوستانی کپاس کی بیرونی منڈیوں میں مانگ بڑھ گئی جس کی وجہ سے کراچی بندرگاہ سے

Export ہونے والے مال کی مالیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

۵۔ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں کینٹ ریلوے اسٹیشن تعمیر ہوا۔

۶۔ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں کراچی گیہوں اور کپاس کی Export کرنے والا ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ ہوگیا۔

۷۔ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں ٹیلیفون سروس شروع ہوئی۔

۸۔ ۱۲۸۴ھ (۱۸۷۷ء) میں دنیا کا پہلا بیلنس شیٹ یہیں کیا گیا۔

۹۔ ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں کراچی پورٹ ٹرسٹ قائم ہوا۔

۱۰۔ ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۷ء) میں کراچی پورٹ پر ایک مینار تعمیر کیا گیا جس کی روشنی ۲۹ کلومیٹر دور تک سمندر میں دیکھی جاسکتی تھی۔ ابتداء میں اس مینار کو ناریل کے تیل سے روشن کیا گیا تھا۔

۱۱۔ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں پہلا پوسٹ آفس کھولا گیا۔

۱۲۔ ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں کراچی پورٹ پر انتہائی طاقتور روشنی والا مینار تعمیر ہوا جس کی روشنی ۱۱۲ سے ۱۲۸ کلومیٹر دور تک سمندر میں دیکھی جاسکتی تھی۔ اس وقت یہ دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور روشنی کا مینار تھا۔

۱۳۔ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں کراچی میں بجلی کی ترسیل شروع ہوئی۔

۱۴۔ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں پہلی جنگ عظیم کے دوران کراچی کو فوجی چھاؤنی بنایا گیا۔

۱۵۔ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں بس سروس شروع ہوئی۔

۱۶۔ ۱۳۷۰ھ (۱۹۵۰ء) میں موجودہ جگہ پر ریڈیو پاکستان منتقل ہوا۔

۱۷۔ ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی۔

۱۸۔ ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴ء) میں لوکل ٹرین چلائی گئیں۔

۱۹۔ ۱۳۸۶ھ (۱۹۶۷ء) میں پاکستان ٹیلی ویژن کراچی سینٹر شروع ہوا۔

۲۰۔ ۱۴۱۰ھ (۱۹۹۰ء) میں برِّاعظم ایشیا میں مصنوعی گھاس کا پہلا میدان ''کلب آف پاکستان اسٹیڈیم'' کراچی گراؤنڈ میں لگایا گیا۔

۲۱۔ ۱۴۰۳ھ (۱۹۸۳ء) میں مدینۃ الحکمت کی تعمیر کا کام شروع ہوا جسے جناب حکیم محمد سعید، مالک ''ہمدرد دواخانہ'' پاکستان نے بنکاکی میں آباد کیا۔

۲۲۔ ۱۴۱۲ھ (۱۹۹۱ء) میں ''علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن'' نے ''سر سید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی'' کی بنیاد رکھی۔

۲۳۔ ۱۴۱۴ھ (۱۹۹۳ء) میں کراچی کے جدید ''قائداعظم انٹرنیشنل ایرپورٹ'' کا افتتاح ہوا۔

[۱۵] مختصراً کراچی کی اہمیت

۱۔ سکندرِ اعظم کے بحری کمانڈر، نیارکس کے بحری بیڑے نے ۱۸؍اکتوبر ۳۲۶ قبل مسیح کراچی کی بندرگاہ پر چوبیس گھنٹے کا قیام کیا تھا۔ اس وقت کراچی کو کروکالا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

۲۔ موجودہ کراچی کے قریب ہی ہندو و مسلمان، دونوں مذاہب کے اہم اور متبرک مقامات ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس مہادیو کے مندر کا ذکر رامائن میں ہے وہ یہیں تھا۔ رام باغ جہاں رام چندر جی اور سیتا جی نے بلوچستان میں واقع ہنگلاج جاتے ہوئے ایک رات بسر کی تھی، وہ بھی یہیں تھا۔ دسویں صدی کے صوفی بزرگ، عبداللہ شاہؒ اور ان کے بھائی یوسف شاہؒ کے مزارات اور بارہویں صدی کے منگھوپیر کا مزار یہیں واقع ہیں۔ اس کے علاوہ بابھ جزیرے پر،

گورنمنٹ عمارات کے نیچے راجہ دیورائے کی سولہویں صدی کے دار الخلافہ کے کھنڈرات (Remains) بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔

۳۔ مغل شہنشاہ، جلال الدین محمد اکبر اور اس کے جنرل عبدالرحیم خان خاناں نے ٹھٹھہ کے بعد یہیں منوڑا میں قیام کیا تھا۔

۴۔ مولانا محمد علی جوہر، ان کے بھائی مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کو خلافت تحریک کی پاداش میں ستمبر ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) میں گرفتار کرکے یہیں ان پر خالق دینا ہال میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔

۵۔ یہیں "آل انڈیا مسلم لیگ" کا ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں پہلا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔

۶۔ ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں نادر شاہ درانی کے ایک اعلیٰ فوجی کمانڈر مظفر علی خان نے یہیں سے ٹھٹھہ کا سفر کیا تھا۔

۷۔ یہ ہندوستان کا وہ پہلا شہر ہے جس پر ملکہ وکٹوریہ کے دورِ حکومت کے ساتھ ہی قبضہ ہوا۔

۸۔ خطوط غالب میں بھی اس شہر کا تذکرہ ہے اور مولانا الطاف حسین حالی بھی یہاں تشریف لا چکے ہیں۔

۹۔ یہیں پاکستان کے بانی، قائد اعظم محمد علی جناح ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ یہیں انھوں نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدہ کا حلف اٹھایا اور یہیں ۱۱ ستمبر ۱۳۶۸ھ (۱۹۴۸ء) کو سپرد خاک کئے گئے۔

۱۰۔ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں یہاں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی لیکن وہ کچل دی گئی اور آزادی کے متوالوں کو توپوں سے اڑا دیا گیا۔

[۱۶] کراچی میں میری مصروفیات

مجھے پاکستان میں محض ایک ماہ قیام کا ویزا منظور ہوا تھا لیکن اُسی ماہ کے عرصہ میں ۱۳؍ مارچ (صبح کے دو بجے) کو میرے ایک نوجوان (سنہ پیدائش ۱۹۴۷ء) بھتیجے کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے کراچی میں ہی انتقال ہو گیا۔ ہوا یہ کہ اس کی لڑکی کی رخصتی تھی۔ ہم سب خوشی خوشی اس میں شریک ہوئے۔ لڑکی رخصت کردی گئی۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہی جب وہ اپنے فلیٹ پر چڑھ رہا تھا تو گر گیا۔ فوراً اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اس سانحہ کی وجہ سے مجھے ایک ماہ مزید اپنے ویزے میں توسیع کرانی پڑی۔

میں کراچی میں حالانکہ دو مہینے رہا لیکن اس تیزی سے دن گزرے کہ پتہ ہی نہ چلا۔ ایک تشنگی رہی۔ نہ تو میرا جی بھر سکا اور نہ ہی عزیز واقارب کی تشفی ہو سکی۔ وہاں جانکار، عزیزوں کے علاوہ متعدد گم گشتہ اعزاء، دیرینہ ہم وطنوں، بچپن کے ساتھیوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ الحمد للہ سب خوشحال ہیں۔ خوب ہنسی مذاق رہی، بچپن کی یادوں کے تذکرے رہے، بزرگوں کے قصّے کہانیاں سنیں، گاؤں بستی کے واقعات دہرائے، ادبی محفلیں سجیں وغیرہ وغیرہ۔ دعوتوں کا تو یہ عالم تھا کہ ایک ایک وقت میں کئی کئی جگہوں سے اصرار ہوتا۔ کبھی کبھی تو قرعہ اندازی تک کی نوبت آجاتی۔ افسوس کہ اگر دعوتیں بیچی جا سکتیں تو زرِ مبادلہ کمانے کا یہ سنہرا موقع تھا۔

یہ قابلِ ذکر ہے کہ نہ معلوم کیوں، جمعرات کی شب کی کوئی دعوت نہیں کر رہا تھا۔ مجھے ایک دن ایک تقریب میں باآوازِ بلند یہ اعلان کرنا پڑا: ’’ہے کوئی خدا کا بندہ جو جمعرات کی شب میں اس غریب الوطن اور تعلیم یافتہ فقیر کی دعوت کرے اور ثوابِ دارین حاصل کرے۔‘‘ یہ سُن کر تمام مجمع زعفران زار ہو اٹھا اور اس دن کے بعد سے جمعراتوں کا بھی وہی عالم ہو گیا جو دیگر دنوں کا تھا۔ جب دعوتوں کا یہ عالم ہو تو بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا

ہے کہ پیٹ غریب پر کیا گزری ہوگی۔ آخر کار وہ بیچارہ جواب دے ہی گیا اور پھر ہم آ گئے اپنی اصلیت پر، یعنی مونگ کی دال کی کھچڑی پر اور ہوگئے Non-vegetarian سے پکے Vegetarian۔ یہاں اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہاں کھایا جاتا ہے مرغا اور وہاں کھائے کوئی مرغی۔ ویسے بھی ہم عادی تھے روٹی کے اور وہاں ملا کھانا، وہ بھی مرغن، تو پھر پیٹ کا یہ انجام تو ہونا ہی تھا۔

میں نے ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' کے نام سے تصوف پر ایک کتاب لکھی ہے جو تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اپنے خانوادے کا شجرہ بھی شامل کیا ہے۔ پاکستان کے سفر سے شجرے کی متعدد کڑیوں کو جوڑنے میں بھی بے حد مدد ملی۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروّت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی انکی تقصیریں
(علامہ اقبالؔ)

[۱۷]

مزار مبارک حضرت شیخ عبداللہ شاہ غازی، کراچی

مزار قائداعظم محمد علی جناح، کراچی

سپریم کورٹ کی کراچی بینچ، کراچی

تین تلواریں، کراچی

جناح ایئر پورٹ، کراچی

کراچی پورٹ ٹرسٹ بلڈنگ، کراچی

کراچی میونسپل کارپوریشن
بلڈنگ، کراچی

سجی، دھجی اور دلکش پٹھانی بس
کے سامنے کا منظر، کراچی

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہیں وہ صاحبِ اسرار

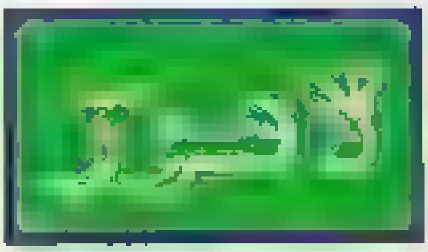

ریلوے اسٹیشن، لاہور

[۱] حقیقت کے آئینہ میں

لاہور دریائے راوی کے بائیں کنارے پر واقع، انڈیا۔ پاکستان سرحد سے متصل نیز پاکستان کا دوسرا (کراچی کے بعد)، جنوبی ایشیا کا پانچواں اور دنیا کا ۲۳واں سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے (۱)۔ اس کا عرض البلد ۳۱ درجہ ۵۰ دقیقہ شمال اور طول البلد ۷۴ درجہ ۲۲ دقیقہ مشرق ہے۔

کہتے ہیں کہ اس کو رام چندر جی کے بڑے بیٹے، لو (Lao) (۲) نے آباد کیا تھا اور انہیں کے نام پر اس کا نام بگڑتے بگڑتے لاہور ہو گیا۔ امیر خسرو نے اس کو لہانور لکھا ہے۔

ایک ماہر فلکیات (Astronomer) اور جغرافیہ داں، بطلیموس (Ptolemy) نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں لکھا ہے "ایک شہر لاہوکلا (Lahokla) جو دریائے سندھ اور پالیبوتھرا (Palibothra) یا پاٹلی پتر (Pataliputra) (پٹنہ) کے بیچ واقع کاسپیریہ (کشمیر) کے علاقے [جو دریائے Pidastes یا Vitasta (جہلم)، دریائے سنڈابل یا چندر ابھاگا (چناب) اور دریائے ادریس یا اراوتی (راوی) کے سہارے پھیلا ہے] میں واقع ہے، ہی قدیم لاہور ہو سکتا ہے۔"

"حدود عالم" جو ۹۸۲ء میں لکھی گئی اور جس کا انگریزی میں ولادیمیر فیدروویچ مینورسکی (Vladimir Fedorovich Minorsky) نے ترجمہ کیا اور جو ۱۹۲۷ء میں لاہور میں شائع ہوا، میں لکھا ہے "لاہور ایک چھوٹا سا شہر ہے جس میں بہت خوبصورت مندر، بڑے بڑے بازار اور لمبے چوڑے باغات ہیں۔" مزید لکھا ہے "دو بازاروں کے اطراف میں مکان واقع ہیں جن کو کچی دیواروں سے گھیر کر ایک کیا ہوا ہے۔" کہتے ہیں کہ

اس کتاب کا اصل نسخہ ''برٹش میوزیم'' میں محفوظ ہے۔

اس کے علاوہ مختلف ادوار میں اس کو مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ کچھ محققین اس شہر کی ابتداء چار ہزار سال تک پرانی بتاتے ہیں (واللہ عالم بالصواب)۔ غرضیکہ لاہور کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جو بھی ہو، یہ ایک قدیم، تاریخی اور اہم شہر رہا ہے۔ ماضی میں افغانستان کی سمت سے دلّی کی طرف جو بھی لشکر آئے [مغل، ترک، پٹھان وغیرہ۔] ان میں سے زیادہ تر لاہور کو روندتے ہوئے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ اسی طرح کابل کو دلّی کے زیرِ نگیں رکھنے کے لئے بھی عسکری اعتبار سے لاہور کی اپنی ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ ویسے دلّی کی بنسبت اس کا زیادہ تر تعلق کابل سے رہا ہے۔ موجودہ دور میں بھی سرحد سے لگا شہر ہونے کی وجہ سے اس کی ایک خاص اہمیت ہے۔ غرضیکہ لاہور کی پوری تاریخ نشیب و فراز سے پُر ہے۔

چنگیزی بربریت اور ہند میں مسلم حکمرانوں، بالخصوص مغل بادشاہوں کی قدردانی کے سبب جو بھی علماء، فضلاء، صوفیٔ کرام، دانشور، ماہر ہنرمند، نامور شجاع اسلامی دنیا کے گوشے گوشے سے کھنچ کر ہندوستان وارد ہوئے ان میں سے زیادہ تر کا پڑاؤ پہلے یا آخر کار لاہور میں رہا۔

موجودہ عہد میں اس کو اس کی تاریخی، ثقافتی، تعلیمی، عسکری اور سیاسی حیثیت کی بنا پر ''پاکستان کا دل'' کہا جاتا ہے۔ یہیں ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس میں سب سے پہلے تاریخ ساز ''قراردادِ پاکستان'' اور ۹/اپریل ۱۹۴۶ء کو اس قرارداد کا متن منظور کیا گیا۔

برِصغیر میں ملتان اور سندھ کے بعد سب سے پہلے یہیں ہدایت کا سرچشمہ پھوٹا، بلکہ سندھ اور ملتان پر ''قرامطہ'' (۳) کے قابض ہو جانے اور کئی صدیوں تک ان کا وہاں اثر باقی رہنے کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ لاہور کو سندھ اور ملتان پر بھی فوقیت حاصل رہی ہے،

تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی لیے لاہور کو "دارالسلام" کا نام دیا گیا ہے۔

۴۱۲ھ (۱۰۲۱ء) اور ۴۱۴ھ (۱۰۲۳ء) میں سلطان محمود غزنوی نے لاہور کا محاصرہ کر کے ایک خونریز جنگ کے بعد اس کو فتح کیا اور اس کو سلطنت غزنویہ میں شامل کرتے ہوئے ملک ایاز کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔ جنگ کی وجہ سے شہر کی آبادی بہت کم ہو گئی تھی۔ ایاز نے اس کو پھر سے آباد کیا اور تباہ شدہ قلعہ کی جگہ پر دوبارہ قلعہ تعمیر کرایا۔ موجودہ قلعہ اسی جگہ پر واقع بتایا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں لاہور ایک ثقافتی اور تعلیمی مرکز بن کر ابھرا۔

۵۴۷ھ (۱۱۵۲ء) میں معزالدولہ خسرو شاہ نے لاہور کو خاندان غزنویہ کا دارالخلافہ بنایا لیکن ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں شہاب الدین محمد غوری نے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح لاہور ۱۱۸۶ء میں خاندانِ غزنویہ سے خاندانِ غور کے قبضے میں چلا گیا۔

خاندانِ غور کے بعد اس پر سلاطینِ دلّی کے کئی مسلم خاندانوں، جیسے مملوک سلاطین [غلام سلاطین]، خلجی، تغلق، سید، لودی اور سوری وغیرہ بادشاہوں نے حکومت کی۔ قطب الدین ایبک کے ۱۲۰۶ء میں تخت نشیں ہونے کے بعد سے یہ پہلی بار اس برصغیر کے کسی مسلم حکمراں کے زیر نگیں ہوا۔

۹۳۱ھ (۱۵۲۴ء) میں بابر نے لاہور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ۱۵۲۴ء سے ۱۷۵۲ء تک یہ مغل سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء، یعنی دورِ اکبری اور دورِ جہانگیری میں یہ مغل سلطنت کا دارالخلافہ بھی رہا۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں Architecturally اور ثقافتی اعتبار سے یہ عروج پر رہا۔ اس میں متعدد عمدہ قسم کے باغات لگائے گئے اور کئی عظیم الشان اور یادگاری عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اس دور کی اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر انگلش شاعر، جون ملٹن نے ۱۶۷۰ء میں "Agra & Lahore the Seat of Great Mughals" کے نام سے ایک نظم

بھی لکھی۔

مغل دورِ حکومت میں پنجاب، بالخصوص اس کے شہر لاہور نے جو ترقی کی اس کی حیثیت اور خوشحالی کی بابت ایک انگریز محقق، ٹیری نے لکھا ہے "یہ ایک بہت بڑا اور زرخیز صوبہ ہے۔ لاہور اس کا خاص شہر ہے۔ اس شہر میں آدمیوں اور دولت، دونوں کی فراوانی ہے۔ یہ پورے ہندوستان میں تجارت کے لحاظ سے اہم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔"

اکبر کے عہد [۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء] میں غلیچے اور شال بننے کے کاروبار نے لاہور میں بہت ترقی کی۔ ایک انگریز محقق، مونسٹر کے بقول "۱۵۸۱ء میں لاہور ایشیا، یورپ کے کسی بھی اہم شہر سے کسی بھی معنی میں کم نہیں تھا۔"

اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغل سلطنت کی اس پر سے گرفت کمزور پڑ گئی۔ اس پر متعدد حملے ہوئے ۱۷۵۱ء میں والیِ کابل، احمد شاہ ابدالی نے حملہ کر کے اس کو اپنی سلطنت کے زیرِ نگیں کر لیا۔ ۱۷۴۷ء سے ۱۷۵۶ء کے عرصے میں یہ زبردست بحران سے دوچار رہا۔ اس پر مختلف صوبیداروں نے حکومت کی۔ اس کا بھرپور فائدہ جنگجو سکھ قوم نے اٹھایا اور اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۹۹ء میں تمام سکھ "مثلوں" (۴) نے متحد ہو کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں اس پر قبضہ کرتے ہوئے ایک آزاد سکھ ریاست قائم کر لی۔

کیوں کہ ۱۰۲۱ء سے ۱۷۹۹ء تک لاہور پر مسلمان حکمران قابض رہے تھے اور سکھوں نے انھیں سے جنگ کر کے حکومت حاصل کی تھی، اس لیے سکھوں کے عہد حکومت میں، خاص کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں پوری مسلمان قوم کو نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ یہاں یہ ذکر کر دینا نہایت اہم ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ۱۷۹۸ء میں احمد شاہ ابدالی کے پوتے، سلطان زماں شاہ [ص۱۵۸ ملاحظہ فرمائیں]، والیِ کابل نے ہی راجہ کے خطاب سے نوازتے ہوئے صوبیدارِ لاہور مقرر کیا تھا۔ پھر بھی مسلمانوں کی جانیں

تلف ہوئیں، املاک لوٹی گئیں، حتیٰ کہ مزارات، خانقاہیں، مقابر اور مساجد کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ ان کی بے حرمتی کی گئی۔ ان پر سے قیمتی پتھر اور زر و جواہرات اتار کر امرتسر بھیج دیے گئے۔ منقول ہے کہ ایک دن جب مہاراجہ رنجیت سنگھ حسب عادت پتھر اتروانے کے لئے میاں میر [تفصیلات ص ۲۰۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔] کے مزار پر گیا اور معماروں کو حکم دیا تو دفعتاً مزار سے ایک شعلہ نکلا جس سے مہاراجہ زمین پر گر پڑا۔ وہ ڈر گیا اور اس نے کہا کہ یہ بادشاہوں کے پیر (۵) کا مقبرہ ہے، اسے نہ چھیڑو۔

"ہر کمالے را زوالے" کے مقولے کے مصداق مہاراجہ رنجیت سنگھ (م ۱۸۳۹ء) کے بعد سکھوں کی حکومت بھی خلفشار کا شکار ہوگئی۔ ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۹ء تک پانچ سکھ حکمران برسرِ اقتدار رہے۔ [تفصیل ص ۱۱۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔] بالآخر ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لڑکے، راجہ دلیپ سنگھ کو تخت و تاج سے محروم کر کے لاہور پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔(۶)

انگریزی دورِ حکومت، یعنی صد سالہ (۱۸۴۹ء تا ۱۹۴۷ء) میں لاہور کو کسی قدر سکون نصیب ہوا۔ اس عرصے میں شہر میں کئی اہم تعمیراتی کام کرائے گئے، جیسے جنرل پوسٹ آفس، ہائی کورٹ، گورنمنٹ کالج، عجائب گھر، نیشنل کالج آف آرٹ، منٹگمری ہال، پنجاب یونیورسٹی، صوبائی اسمبلی وغیرہ وغیرہ کی عمارتیں۔ مال روڈ پر جو گوتھک (Gothic) اور وکٹورین (Victorian) طرزِ تعمیر کی عمارتیں تعمیر کرائی گئی تھیں، وہ ابھی تک موجود ہیں۔ اسی مال روڈ کے ایک کنارے پر پنجاب یونیورسٹی کی عمارت واقع ہے۔ انگریزی دورِ حکومت میں ہی ۱۹۲۴ء میں "لاہور ریس کلب" عالمِ وجود میں آیا تھا۔

یہیں سنہ ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء) میں "انجمن حمایت اسلام" کے سالانہ جلسے میں "نالہ یتیم" کے نام سے نظم پڑھنے پر علامہ اقبال کی شہرت کی ابتدا ہوئی۔

آزادی کی لڑائی میں بھی یہ شہر ملک کے کسی دوسرے شہر سے پیچھے نہیں رہا۔

۱۹۲۹ء میں یہاں ''کانگریس'' سیشن کا انعقاد ہوا۔ اسی سیشن میں پنڈت جواہر لال نہرو نے آزادی سے متعلق ایک قرارداد پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔ اسی جلاس کے موقع پر ترنگا جھنڈا لہرایا گیا جس کو ہزاروں لوگوں نے سلامی دی۔ یہیں کی جیل میں آزادی کے متوالے جتن داس نے سیاسی قیدیوں کے ساتھ انگریزوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے ۶۳ دنوں تک بھوک ہڑتال کی۔ یہیں کی جیل میں مجاہد آزادی، سردار بھگت سنگھ کو تختہ دار پر چڑھایا گیا۔

یہیں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' (بعد میں ''پاکستان مسلم لیگ'') کا ۱۹۴۰ء میں ایک اہم اجلاس ہوا جس میں قائد اعظم محمد علی جناح کی سربراہی میں برصغیر کے مسلمانوں (''مسلم لیگ'' کے بقول) کے لئے ایک علیحدہ، آزاد مملکت کی مانگ کی گئی۔ یہ ''لاہور قرارداد'' یا ''پاکستان قرارداد'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اسی جلاس میں ''مسلم لیگ'' کے قائد، جناب محمد علی جناح نے پہلی بار ''دو قومی نظریہ'' (Two Nation Theory) پیش کیا۔

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد ایک بار پھر سے لاہور نے تباہی کا منظر دیکھا۔ ہندو۔ مسلم۔ سکھ فسادات کی آگ نے شہر کو اپنے نرغے میں لے لیا جس سے لاہور کے قلعہ، بادشاہی مسجد، دیگر سرکاری عمارتوں، نجی املاک اور انسانی جانوں کو سخت نقصان پہونچا۔ کتنے ہی بوڑھے، بے سہارا، بچے، یتیم، عورتیں، بیوہ، نیز کھاتے پیتے، دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔

۱۹۶۵ء میں بدقسمتی سے دونوں ممالک [ہندوستان اور پاکستان] میں جنگ چھڑ گئی۔ (۷) ان دنوں پاکستان کے صدر، جناب جنرل ایوب خاں [۱۹۵۸ء سے فوج برسر اقتدار تھی۔] اور ہندوستان کے وزیر اعظم، جناب لال بہادر شاستری جی تھے۔ پاکستان نے جب ستمبر میں ''لائن آف کنٹرول'' سے اس پار جموں کے اکھنور سیکٹر میں دباؤ

بڑھا دیا تو ہندوستان کو بھی مجبوراً دیگر محاذ کھولنے پڑے۔ ۶ ستمبر کو ہندوستانی فوج نے لاہور سیکٹر میں بین الاقوامی سرحد کو عبور کر کے پیش قدمی کرتے ہوئے لاہور کے ٹھیک مشرق میں واقع موضع برکی کے پاس سے اچھوگل کینال (B R.B. Canal) کو پار کر لیا۔ اس وقت لاہور کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہندوستانی فوج کی Range میں تھا۔ بظاہر سقوطِ لاہور یقینی ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جناب حافظ محمد ابراہیم (۸)، گورنر پنجاب کو لاہور کا بھی گورنر مقرر کر دیے جانے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ کراچی کے بعد لاہور پاکستان کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔ اگر لاہور پر ہندوستانی فوج کا قبضہ ہو جاتا تو ہندوستان، پاکستان سے اپنی شرائط منوا سکتا تھا لیکن یہ نہیں ہوا۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ دارالاسباب ہے۔ جو بھی واقعہ رونما ہوتا ہے اس کے دنیاوی اسباب ضرور ہوتے ہیں۔ لاہور پر ہندوستان کا قبضہ کیوں نہیں ہو سکا اس کے بھی کچھ نہ کچھ دنیاوی اسباب ضرور رہے ہوں گے جس کی تفصیل میں جانا تو ہر کسی کے بس کی بات ہے [یہ ایک دفاعی معاملہ ہے جس کو دفاعی امور سے وابستہ تجزیہ نگار ہی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔] اور نہ ہی یہ ہمارے احاطہ تحریر میں شامل ہے۔ اگر "رجال الغیب" کے نظریہ (۹) سے سوچیں تو ایک دھندلی سی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے غالباً مندرجہ ذیل مثالیں کافی ہوں گی —

اورنگ زیب جیسا تجربہ کار جرنل آٹھ ماہ [فروری ۱۶۸۷ء سے ستمبر ۱۶۸۷ء] تک مسلسل گولکنڈہ جیسے چھوٹے سے قلعہ کا محاصرہ کئے رہا لیکن تب تک اس کو فتح نہ کر سکا جب تک قلعہ کی حفاظت پر مامور قطب الارض وہاں سے اللہ کے حکم پر چلے نہ گئے۔ (۱۰)

سلطان فیروز شاہ تغلق تب تک ٹھٹھہ کو فتح نہ کر سکا جب تک کہ اس کی حفاظت پر مامور ایک ولیہ حیات رہیں۔ (۱۱)

پنجاب (غیر منقسم) کا علاقہ جب مغل حملوں کی زد میں آنے کے سبب تباہ و

برباد ہوتا ہوا تو وہاں سے اللہ کے حکم پر پہلے ہی سے اولیاء اللہ چلے گئے تھے۔(۱۲)

۱۹۹۸ء میں ایٹمی دھماکوں کے بعد جب فروری ۱۹۹۹ء میں ہندوستان کے وزیر اعظم، جناب اٹل بہاری واجپائی جی خیر سگالی مشن پر لاہور تشریف لے گئے تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ ۲۱ فروری کو ایک دوستانہ معاہدے ("Lahore Declaration") پر دستخط کیے بلکہ "مینارِ پاکستان" پر بھی تشریف لے جا کر رجسٹر میں اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ [واجپائی جی وہ پہلے ہندوستانی وزیر اعظم ہیں جو "مینارِ پاکستان" پر تشریف لے گئے۔] یہ واجپائی جی کا ایک بہت مدبرانہ، تاریخ ساز اور جرأت مندانہ (۱۳) اقدام تھا۔ اس سے پاکستان کے ان سب حلقوں کی اس غلط فہمی اور غلط بیانی کا سدِ باب ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی حکمرانوں نے ابھی تک دل سے پاکستان کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ ویسے تو اس میں کوئی سچائی نہیں ہے، کیونکہ بقول مولانا آزاد پاکستان کے قیام میں کانگریس کے بھی چند صفِ اول کے لیڈران کی مرضی کا دخل تھا [تفصیلات کے لیے ص ۳۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔] اور اگر ہے، تو وہ اس سخت گیر تنظیم (۱۴) کی طرف سے رہی ہوگی جس کا منشور بالکل واضح ہے اور جس کے واجپائی جی بھی ایک سینیئر رکن ہیں۔ اب واجپائی جی کے "مینارِ پاکستان" پر تشریف لے جانے سے اس کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شری لال کرشن اڈوانی، جو "بھارتیہ جنتا پارٹی" (ہندووادی تنظیم، "R.S.S." کی ایک ذیلی سیاسی پارٹی) میں شری اٹل بہاری واجپائی سے بھی زیادہ سخت گیر موقف والے لیڈر مانے جاتے ہیں، انھوں نے تو واجپائی جی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر کارنامہ انجام دیا۔ ۳۰ مئی ۲۰۰۵ء کو جب موصوف اپنے ایک ہفتہ کے پاکستانی دورے پر اسلام آباد، لاہور اور کراچی پہنچے تو کراچی میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ بابائے پاکستانی قوم، مسٹر محمد علی جناح کے مزار پر حاضری دی اور گلپوشی کی بلکہ ان کی تعریف میں قصیدے بھی پڑھے، اور جب ان کے بیان کو ہندوستان میں ہدفِ تنقید بنایا گیا تو بھی وہ اپنے موقف پر بدستور قائم رہے۔ سیاسی حلقوں میں

مسٹر جناح کی تعریف کرنے سے یہ تاثر لیا گیا کہ اڈوانی جی بھی ماضی میں سردار پٹیل کی طرح مسٹر جناح کے نظریات سے اتفاق کرنے لگے ہیں۔ [''دو قومی نظریہ'' جو پاکستان کی بنیاد بنا، مسٹر جناح ہی نے تو پیش کیا تھا۔] پہلے باجپئی جی کا ''مینار پاکستان'' [''قرار داد پاکستان'' کی یاد میں تعمیر کرایا گیا۔] پر جانا اور پھر اڈوانی جی کا مسٹر جناح کے مزار پر جانا، ایسا لگتا ہے کہ شاید سخت گیر ہندو تنظیمیں اب اپنی Strategy تبدیل کر رہی ہیں۔ باجپئی جی کے اس عمل کو دونوں ملک کے عوام نے ستائش کی نگاہ سے دیکھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر دو جانب کے چند سر پھروں نے اس پر نکتہ چینی بھی کی۔ چند تنگ نظر پاکستانیوں نے تو اس مقام کو عرق گلاب سے دھو یا تک بھی۔

حواشی

(۱) ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے لحاظ سے اُس وقت اس کی آبادی تقریباً ۵ ملین تھی۔ [One million = ten lakhs]

(۲) سیتا جی کے بطن سے رام چندر جی کے دو بیٹے لوو (Lao) اور کش (Kush) پیدا ہوئے بتائے جاتے ہیں۔ لاہور کے قلعہ میں کہتے ہیں کہ آج بھی لوو کے نام پر ایک مندر موجود ہے۔ لوو (Lao/Lava) کا تلفظ لوح (Loh) بتایا جاتا ہے اور ''لوح کا قلعہ'' (Awar) کے حوالے سے آبادی کا نام ''لوح۔اوَر'' (Loh-Awar) بتایا گیا ہے جو بگڑتے بگڑتے کہتے ہیں کہ موجودہ نام، لاہور (Lahore) ہو گیا۔

(۳) ''قرامطہ'' = ''قرامطہ'' کے بارے میں جاننے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ملتان کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح ہوتے ہی ملتان عربوں کے قبضے میں آ گیا اور پھر غزنوی دور تک اس پر مسلمانوں کا مسلسل قبضہ رہا لیکن ۱۱۱ھ (۷۲۹ء) میں ملتان سندھ سے الگ ہو گیا۔ نتیجتاً ملتانی زبان بھی سندھی زبان سے علیحدہ ہو کر آزادانہ طور پر

ارتقاء پذیر تھی۔

ملتان پر پہلے ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) تک "بنی امیہ" کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد یہ عباسیوں کی حکومت کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ بعد ازاں صورتِ حال تقریباً غیر واضح رہی۔ کبھی یہ مرکزی حکومت کے تحت رہا تو کبھی مقامی خود مختار حکمرانوں کے قبضے میں۔ ۲۹۰ھ (۹۰۲ء) میں اس کے "سوسامہ" کے زیرِ اقتدار رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ ["سوسامہ" قریشی عرب النسل تھے جن کا سلسلۂ نسب لوئی بن غالب سے ملتا ہے جو قریش کے اجداد میں سے تھے۔ ان کی اولاد میں سے ایک شخص سامہ تھا۔ چنانچہ اسی کی نسبت سے اس کی اولاد "بنو سامہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ سنی العقیدہ تھے۔] "بنو سامہ" کے بعد ۳۷۳ھ (۹۸۳ء) میں یہاں کا حاکم جلم بن شیبان ہوا جو اسماعیلیہ فرقے سے تعلق رکھنے کے سبب شیعہ العقیدہ تھا۔ [جلم بن شیبان کو اسماعیلی امام العزیز باللہ (سنہ ۳۶۵ھ تا ۳۸۶ھ / ۹۷۵ تا ۹۹۶ء، قاہرہ) نے ۳۷۲ھ (۹۸۲ء) میں فوجی مدد کے ساتھ سندھ بھیجا تھا۔ کہتے ہیں کہ جلم بن شیبان نامی سپہ سالار حملہ آور نہ ہو کر اندرون شہر بغاوت کرا کر برسرِ اقتدار آیا تھا۔] جلم بن شیبان نے ملتان پر قبضہ ہوتے ہی سب سے پہلے وہاں فاطمی اقتدار رائج کرانے کے ساتھ ساتھ ان کے نام کا خطبہ جاری کرایا اور محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کو "بنو امیہ" کی یادگار سمجھ کر بند کرا دیا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے عقائد (**قرامطی** عقائد) کی بھرپور طریقے سے تبلیغ کرتے ہوئے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی غرض سے مقامی ہندو راجاؤں سے معاہدے بھی کئے۔ جلم بن شیبان کے بعد شیخ حمید ملتان کا حاکم ہوا۔ وہ بھی اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب ۳۸۱ھ (۹۹۱ء) میں امیر ناصر الدین سبکتگین نے سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد ملتان کی جانب پیش قدمی کی تو شیخ حمید نے اس سے صلح کر کے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ۳۸۷ھ (۹۹۷ء) میں امیر سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا لڑکا محمود تخت نشین ہوا۔ ۳۹۵ھ (۱۰۰۴ء) میں محمود نے ملتان سے متصل ایک مضبوط قلعہ بھاٹیہ (موجودہ نام بھیرہ) کے حاکم بجے رائے کو سبق سکھانے کے ارادہ سے اس پر حملہ کیا۔ [مذکورہ قلعہ لاہور کے تابع تھا لیکن بجے رائے اپنی فوج کی کثرت، ہاتھیوں کی تعداد پر اس درجہ مغرور تھا کہ خود کو خود مختار سمجھ کر لاہور کے حاکم، جے پال اور سبکتگین کے ہندوستانی نائبین کی کوئی پرواہ

نہیں کرتا تھا۔ بجے رائے نے اس حملے کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لی تھی۔] ان دنوں ملتان کا حاکم شیخ حمید کا پوتا، شیخ ابوالفتح داؤد بن نصر تھا۔ اس نے محمود کی کوئی مدد نہیں کی جس سے محمود اس سے ناراض ہو گیا۔ چنانچہ محمود نے ۳۹۶ھ (۱۰۰۵ء) میں اس پر حملہ کر دیا۔ شیخ ابوالفتح داؤد نے مجبور ہو کر محمود سے صلح کر لی لیکن جب ۳۹۹ھ (۱۰۰۸ء) میں محمود نے آنند پال پر حملہ کیا تو ابوالفتح نے غداری کرتے ہوئے آنند پال کا ساتھ دیا۔ اس سے محمود نے ۴۰۱ھ (۱۰۱۰ء) میں ملتان پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور ابوالفتح کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا جہاں غور کے قلعہ میں دورانِ اسیری وہ مر گیا۔ اس طرح ملتان پر سلاطین غزنویہ کا کلی طور سے قبضہ ہو جانے کے ساتھ ساتھ "قرامطیہ" دور کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ جلم بن شیبان نے جو مسجد تعمیر کرائی تھی اس کو محمود نے بند کراتے ہوئے محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد جس کو جلم نے بند کرا دیا تھا، کو پھر سے کھلوا دیا گیا۔

حسن رضا گردیزی نے اپنی کتاب "شاہ یوسف گردیز" میں ملتان میں "قرامطیوں" کے ظلم وستم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "اس فرقے کی بدولت ہر طرف لوٹ کھسوٹ اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ بیچارے مسلمان جائے امن کی تلاش کرتے پھرتے تھے۔ "قرامطی" یوں تو خود کو مسلمان ظاہر کرتے تھے لیکن انہیں اسلامی عقائد سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ نہ فقط اسلامی عبادات کے منکر تھے بلکہ ان کی تمام تر سرگرمیاں عباسی حکومت کے خلاف ہوتے ہوئے ہر اس سلطنت کے خلاف ہوئیں جو بنی فاطمی کے حق میں نہیں تھے۔"

"خطۂ پاک اوچ" میں "الدولت العربیہ الکبری لحود کامل المحاصی" کے حوالے سے لکھا ہے "قرامطہ فرقہ باطنیہ ہی کی ایک شاخ تھی جن کا بانی مبانی عبداللہ بن سبا نام کا ایک یہودی تھا جو بظاہر مسلمان اور بباطن اسلام کا زبردست دشمن تھا۔ اس کی شورش انگیزیوں نے خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفانؓ کے خلاف لوگوں کو ابھارا۔

اس کی تمام ہنگامہ آرائیوں کا مقصد اسلام کو سبوتاژ کرنا تھا۔ "قرامطہ" کا ہیڈ کوارٹر کوفے کے نواح میں ایک بستی تھی جس کا نام انھوں نے "دارالہجرت" رکھا ہوا تھا۔ یہیں سے ان کی جماعتیں قتل و غارت گری کے منظم منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نکلتیں اور سلطنت اسلامیہ کے مختلف علاقوں کو تاخت و تاراج کرتیں۔"

''فرشتہ'' نے ''قرامطیوں'' کو بے دین لکھا ہے۔ الغرض ''قرامطیوں'' کے نظریات کی تبلیغ و ترویج کی وجہ سے لوگوں کے عقائد راسخ العقیدہ مسلمانوں جیسے نہ رہے تھے۔ ایک طرف تو داخلی طور پر لوگ ان نظریات کی یلغار کے سبب گم کردہ راہ ہو رہے تھے اور دوسری طرف ملتان بیرونی حملہ آوروں کی مسلسل فوج کشی اور کشت و خون کی بدولت بے چینی اور بے سکونی کی زد میں تھا۔ [''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اول ص ۹۸ ـ ۱۱۳

''ملتان کی ادبی و تہذیبی زندگی میں صوفیائے کرام کا حصہ'' ص ۲۰۳ ـ ۲۰۹]

(۴) **مِثْل** = یہ فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی ایک جیسے کے ہیں [جو سب سکھوں میں مشابہ ہو][Equrvalent]۔File کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ سکھوں نے اس کو آخر الذکر کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء کے درمیانی عرصے میں احمد شاہ ابدالی کے پے در پے سات حملوں کی وجہ سے اس سے مغل بادشاہ اس قابل نہ رہے تھے کہ وہ سلطنت میں ہونے والی بغاوتوں کا قلع قمع کر سکیں۔ چنانچہ پنجاب میں اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنگجو سکھوں نے بھی مختلف سرداروں کی سربراہی میں جتھے بنانے شروع کر دیئے تھے۔ ان جتھوں کو ''مثل'' کا نام دیا گیا تھا۔ ''مثلوں'' کے نام کسی خاص مقام، موضع یا سربراہ کے نام پر ہوتے تھے اور ان کے الگ الگ نام، نشان اور پرچم ہوتے تھے۔ شروع میں ان کی تعداد ۶۵ تھی جو آہستہ آہستہ آپس میں ضم ہو کر بارہ رہ گئی تھی۔ ۱۷۶۲ء سے ۱۷۹۹ء تک پنجاب ان ''مثلوں'' میں بٹا رہا۔ رنجیت سنگھ کے برسر اقتدار آنے پر یہ سب ایک ہو گئے تھے۔

(۵) "Sikhism" میں حضرت میاں میرؒ کا بہت بلند مقام ہے۔ جب امرتسر میں سکھوں کے پانچویں گرو، گرو ارجن سنگھ جی [۱۵۸۱ء ـ ۱۶۰۶ء] نے ''ہرمندر صاحب'' کا سنگ بنیاد رکھا تو میاں میرؒ ان کی دعوت پر وہیں موجود تھے۔ گرو جی جب بھی اپنے دادا اور چوتھے گرو، گرو رام داس جی کی جائے پیدائش، لاہور آتے تو وہ میاں میرؒ سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ ۱۶۰۶ء میں گرو جی نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں میاں میرؒ سے اپنے فرزند، گرو ہرگوبند سنگھ جی کے حق میں دعا کرنے کو کہا۔ گرو ارجن سنگھ جی کی وفات کے چند سالوں بعد، ان کے صاحبزادے اور چھٹے گرو، گرو ہرگوبند سنگھ جی [۱۶۰۶ء ـ ۱۶۴۴ء] نے جب

ان کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی، تو لاہور میں میاں میرؒ سے ملاقات بھی کی۔

(۶) ۲۷ر جون ۱۸۳۹ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ [۱۷۷۹ء میں سکھوں کے لیڈر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ زمان شاہ، والیٔ کابل نے ۱۷۹۹ء میں لاہور کا حکمران بنایا۔ اس کی چار رانیاں اور سات کنیزیں اس کی چتا پر جل کر مریں۔] کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا لڑکا، کھڑک سنگھ جانشین ہوا، وہ ایک سال چار ماہ حکومت کرنے کے بعد ۳۶ سال کی عمر میں ۵ر نومبر ۱۸۴۰ء کو فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا، نونہال سنگھ تخت نشین ہوا۔ نونہال سنگھ اپنے باپ کی آخری رسومات ادا کر کے واپس لوٹ رہا تھا کہ اتفاقاً ۷ار نومبر ۱۸۴۰ء کو لاہوری دروازہ کے قریب ایک عمارت پھٹ کر اس پر گر گئی جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد ریاست کا انتظام رانی چند کور نے اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن دو ماہ بعد ہی اس کے دوسرے لڑکے، شیر سنگھ نے اسے معزول کر کے خود راجہ بن بیٹھا۔ شیر سنگھ کو حکمران ہوئے ابھی پورے تین سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ۱۵ر ستمبر ۱۸۴۳ء کو سردار اجیت سنگھ [ایک سکھ سردار اور مہاراجہ شیر سنگھ کا قاتل جس نے سردار دھیان سنگھ کو بھی قتل کیا تھا نتیجۃً بعد میں اس کو بھی دھیان سنگھ کے لڑکے، ہیرا سنگھ نے مع اس کے گروہ کے ہلاک کر دیا تھا۔] کی فوج نے شاہی محل پر قبضہ کر لیا اور زبردست لڑائی کے بعد شیر سنگھ اور اس کے لڑکے، پرتاپ سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، حتیٰ کہ محل کی عورتوں اور ان کے نوزائیدہ بچوں تک کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا بیٹا، دلیپ سنگھ جو اس وقت دو سال کا تھا، تخت نشین ہوا۔ سکھوں کے اس اندرونی خلفشار کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا۔ سکھوں نے انگریزوں سے چار مقابلے کیے لیکن ہر بار ہزیمت اٹھانی پڑی۔ مجبوراً ۱۸۴۶ء کے عہد نامے کی رو سے دریائے بیاس تک کا علاقہ انگریزوں کو دے دیا گیا اور اسی عہد نامے کی رو سے پہلی بار انگریزی ریزیڈنٹ اور فوج لاہور میں رہنے لگی اور پھر بالآخر لارڈ ڈلہوزی کے آخری فیصلہ کن جنگ کے بعد، ۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزی مقبوضات میں شامل ہو گیا اور دس سالہ راجہ دلیپ سنگھ کو تخت سے اتار کر اور ۱۲ ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کرتے ہوئے اس کو ولایت بھیج دیا گیا اور اس کی تمام ذاتی املاک، محلات و قیمتی ساز و سامان وغیرہ سب کچھ ضبط کر لیا گیا۔ [اس میں ''کوہ نور'' ہیرا بھی شامل تھا۔] دلیپ سنگھ نے انگلستان کے ماحول سے متاثر ہو کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور وہیں شادی بھی کر لی تھی جسکے بطن سے ایک لڑکا، وکٹر دلیپ سنگھ اور دو لڑکیاں، صوفیا اور ریبا پیدا ہوئیں۔ لڑکیاں تو پنجاب آ گئی تھیں جن میں سے ایک کی شادی انگریز سے ہو گئی تھی جبکہ دوسری کنواری ہی رہی لیکن لڑکا جون ۱۹۱۸ء میں جزیرہ مانٹی کارلوس میں مرا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد اوّل و دوم ص ۲۴۷]

(۷) ۱۹۶۵ء کی لڑائی کی شروعات "رن آف کچھ" کے اس علاقے سے ہوئی جو ریت جو گجرات کی سرحد کے مغرب میں واقع اور وسیع تھی۔ ۲۰ مارچ اور اس کے بعد اپریل ۱۹۶۵ء میں پہلے تو دونوں ممالک کی سرحدی پولس کے درمیان کا دکا جھڑپیں ہوئیں جو بعد میں دونوں کی افواج کے مابین جھڑپوں میں تبدیل ہوگئیں۔ تب جون ۱۹۶۵ء میں برٹش وزیراعظم، جناب ہیرالڈ ولسن نے مصالحتی کوششوں سے فریقین کو ایک ٹریبونل (Tribunal) کے سپرد معاملہ کردینے پر راضی کرلیا۔ [اس ٹریبونل کا فیصلہ ۱۹۶۸ء میں آیا جس کی رو سے "رن آف کچھ" کا ۳۵۰ مربع میل (۹۰۰ مربع کلومیٹر) کا علاقہ پاکستان کو Award ہوگیا جب کہ اس کا Claim ۳،۵۰۰ مربع میل کا تھا۔]

"رن آف کچھ" کے بعد پاکستان نے "آپریشن جبرالٹر" (Operation Gibraltor) کے نام سے کشمیر میں "لائن آف کنٹرول" کے اس پار infiltrators بھیجے۔ ان کا خیال تھا کہ کشمیری عوام ہندوستان سے برگشتہ ہیں اور وہ infiltrators کا ساتھ دیں گے ہیں۔

جو کچھ کہ دیکھا خواب تھا
اور جو سنا افسانہ تھا

نتیجتاً مذکورہ آپریشن ناکام رہا۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۵ء کو ہندوستانی فوج نے Ceasefire Line عبور کرکے کشمیر کے اس طرف کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ شروع میں تو ہندوستانی فوج کو کامیابی ملی اور اس نے تین اہم پہاڑی چوٹیوں پر قبضہ کرلیا لیکن اس کے بعد پاکستانی فوج نے بھی پیش قدمی کرتے ہوئے ٹیتھوال، اوڑی (Uri) اور پونچھ کے چند علاقوں پر قبضہ کرلیا جب کہ ہندوستانی فوج نے "لائن آف کنٹرول" سے آٹھ کلومیٹر اندر واقع درۂ حاجی پیر پر قبضہ کرلیا۔ اس کے جواب میں یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کو "Operation Grand Slam" کے نام سے پاکستان نے چھمب سیکٹر میں واقع اکھنور پر قبضہ کرنے کے لئے حملہ کیا تاکہ ہندوستانی فوج کی لائن آف Communication & Supply کو مفلوج کیا جاسکے لیکن وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ہندوستان نے کشمیر کے محاذ پر دباؤ کم کرنے کی غرض سے ۶ ستمبر کو بین الاقوامی سرحد کو عبور کرکے پنجاب کے بارڈر پر حملہ

کر دیا اور لاہور کے مشرق میں واقع برکی کے قریب سے اچھوگل کینال کو بھی پار کر لیا۔ یہاں سے لاہور کا ہوائی اڈہ ہندوستانی گولہ باری کی range میں تھا۔ باٹاپور بھی ہندوستانی فوج کے کنٹرول میں چلا گیا تھا لیکن بعد میں اس کو خالی کرنا پڑا۔ اس کے بعد سیالکوٹ سیکٹر میں ٹینکوں کی زبردست لڑائی ہوئی۔ غرضیکہ ہندوستانی فوج نے پاکستان کے ۷۱۰ مربع میل (۱۸۴۰ مربع کلومیٹر) علاقے پر اور پاکستانی فوج نے ہندوستان کے ۲۱۰ مربع میل (۵۴۵ مربع کلومیٹر) علاقے پر قبضہ کر لیا۔

۲۲ ستمبر کو قوم متحدہ کی Security Council نے متفقہ طور سے ایک قرارداد منظور کی جس کے ذریعہ فریقین سے غیر مشروط جنگ بندی کی اپیل کی گئی تھی۔ چنانچہ اگلے ہی دن سے جنگ بند ہو گئی۔

اس کے بعد سوویت یونین (اس وقت کے) کے وزیر اعظم، جناب الیکزی کوسیجن کی دعوت پر ہندوستانی وزیر اعظم، جناب لال بہادر شاستری اور پاکستانی صدر، جناب جنرل ایوب خاں نے تاشقند (جو اب ازبکستان میں ہے) میں ملاقات کی اور ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کو "تاشقند معاہدہ" ("Tashkent Declaration") کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی رو سے فریقین کو ۲۵ فروری ۱۹۶۶ء تک اپنی افواج اگست سے پہلے کی پوزیشن تک ہٹا لینی تھیں۔ اس پر عمل تو کیا گیا لیکن ہندوستان کو اس کی قیمت اپنے ہر دلعزیز، پستہ قد مگر بلند ارادوں والے، معصوم صورت مگر بہنی دل والے اور قوم کو "جے جوان۔ جے کسان" کا نعرہ دینے والے وزیر اعظم کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ ۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو ہندوستانی وقت کے مطابق شب کے ایک بج کر بیس منٹ پر تاشقند میں شاستری جی کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ جنرل ایوب خاں جو کچھ دنوں پہلے تک برسرِ پیکار تھے، نے شاستری جی کی میت کو کاندھا دیا اور پھر بالآخر میت دہلی لا کر اس کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔ اُدھر پاکستان میں بھی جنرل ایوب خاں کو پی کرسی سے ۱۹۶۹ء میں دست بردار ہونا پڑا۔

(۸) حافظ محمد ابراہیمؒ = سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد سے، قصبہ نگینہ (بجنور) کے رہنے والے اور ضلع کے نامور وکلاء میں سے تھے۔ ابتداً ۱۹۳۷/۳۸ء میں "مسلم لیگ" کے تحت

پراسمبلی کا الیکشن جیتا تھا۔ بعد میں مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی جو آپ کے حقیقی خالہ زاد بھائی اور برادر نسبتی ہوتے تھے [احقر کی حقیقی نانی مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی کے خاندان سے تھیں۔ اس کے علاوہ حافظ محمد ابراہیم یہ مولانا حفظ الرحمن کے ایک اور خالہ زاد بھائی، ڈاکٹر عبدالقدیر کے احقر کی نانے زاد بہن منسوب ہوئیں۔] کے اثر سے "کانگریس" میں آ گئے تھے۔

[۱۸۸۹ – ۱۹۶۸] ⑤

ابتدا ہی سے آپ یو۔پی کابینہ میں اہم وزارتوں کے وزیر رہے۔ پنڈت گووند بلبھ پنت آپ کے بہت مداحوں میں سے تھے۔ چنانچہ جب پنڈت جی صوبے سے مرکز میں بحیثیت وزیر داخلہ ہوئے تو آپ کو مرکزی کابینہ میں لیتے ہوئے وزیر برائے آبپاشی و بجلی بنایا گیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دریاؤں کے پانی کی تقسیم سے متعلق ۱۹۶۰ء میں "سندھ طاس آبی معاہدہ" کرانے کا سہرا دراصل آپ ہی کے سر ہے۔ مرکز میں آنے کے بعد جب آپ نے ۶۳/۱۹۶۲ء میں امروہہ (مرادآباد) پارلیمنٹری سیٹ سے ضمنی انتخاب لڑا تو آچاریہ کرپلانی کے مقابلے میں ہار گئے۔ [اس سیٹ سے مولانا حفظ الرحمن منتخب ہوئے تھے جن کا کینسر کے موذی مرض میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس الیکشن میں آپ کو ہرانے میں درپردہ "کانگریس پارٹی" کا بھی ہاتھ رہا تھا۔ (ان دنوں صوبے میں "کانگریس پارٹی" کی حکومت تھی اور وزیر اعلیٰ آچاریہ کرپلانی کی اہلیہ سچیتا کرپلانی تھیں)] مذکورہ الیکشن ہار جانے کے بعد آپ کو پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے دوران آپ پنجاب کے گورنر تھے۔

آپ ایک مثالی ایماندار (خاص کر آج کل کے سیاستدانوں کے لیے) اور سادہ لوح انسان تھے۔ آپ کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ کھانے کے وقت کوئی بھی شخص آپ کے یہاں سے بنا کھائے نہیں جا سکتا تھا۔ ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ جب انتقال ہوا تو مقروض تھے۔ ["All India Institute of Medical Sciences"، نئی دہلی میں انتقال ہوا۔ جب وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی آپ کی وفات کی خبر سن کر انسٹی ٹیوٹ پہنچیں تو آپ کے پسماندگان نے ان سے درخواست کی کہ یہاں سے جسد میت لے جانے کے لیے ایک گاڑی کا بندوبست کرا دیں لیکن محترمہ ان سنی کر کے وہاں سے چلی آئیں تب وہاں موجود سعودی عربیہ کے سفیر نے گاڑی کا انتظام کرایا۔]

آخر عمر میں آپ کو مالیخولیا کا مرض ہو گیا تھا۔ لکھنؤ میں MLAs کی رہائش گاہ کا نام "دارالشفاء" آپ ہی کا تجویز کردہ ہے۔

آج بھی ضلع کی سیاست میں آپ کے خاندان کو عزت و احترام کا مقام حاصل ہے۔

(۹) ہر بستی، ہر قریہ (خواہ اس میں آبادی کتنی ہی لوگوں کی کیوں نہ ہو۔) کی حفاظت پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر شہر کے لئے ایک ولی اللہ تعینات کیا ہوا ہے۔ بنا اس کی مرضی کے اس بستی یا علاقے میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب اللہ بزرگ و برتر کی مرضی سے کسی علاقے یا بستی میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آنا ہوتا ہے تو وہ (اللہ) متعلقہ ولی اللہ یا اولیاء اللہ کو وہاں سے ہٹا دیتا ہے۔ [اس کا وصال ہو جاتا ہے یا وہ کہیں اور چلے جاتے ہیں۔]

(۱۰) جب ۱۶۹۱ء میں آٹھ ماہ مسلسل شہنشاہ اورنگ زیب گولکنڈہ کے قلعہ کا محاصرہ کئے رہا تو اس کو تشویش ہوئی۔ اسی دوران بارش سے موسی ندی میں زبردست طغیانی بھی آگئی جس سے فوج منتشر اور اس کے مورچے منہدم ہو گئے۔ ان شدید نامساعد حالات میں ایک رات اورنگ زیب نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا جو فرما رہے تھے "اے بادشاہ! تیری فوج میں دو بزرگ ہیں، جب تک وہ نہ چاہیں گے تجھے فتح نصیب نہیں ہو سکتی اور ان کی شناخت یہ ہے کہ طوفان نہ تو ان کے خیموں کو اکھاڑ سکتا ہے اور نہ ہی ان کے چراغ گل کر سکتا ہے۔" (۱۵) آنکھ کھلی تو اورنگ زیب نے دیکھا کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے، ہر جانب طوفان برپا ہے اور چاروں سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے لیکن دور ایک مقام سے چراغ کی مدھم سی روشنی آ رہی ہے۔ وہ فوراً اس سمت لپکا۔ دیکھا کہ دو سپاہی قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ اورنگ زیب کو دیکھتے ہی وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ اورنگ زیب نے ان سے کہا کہ آپ جیسے بزرگ لشکر میں موجود ہوں اور فتح نصیب نہ ہو، یہ تو تعجب کی بات ہے! ان دونوں بزرگوں نے یک زبان ہو کر فرمایا کہ خلق سوئی، جہاں فریقین مسلمان ہوں وہاں سکوت ہی بہتر ہے۔ لیکن ان کے اس جواب سے بادشاہ مطمئن نہیں ہوا۔ تب ان میں سے ایک نے ایک ٹھیکری پر کچھ لکھ کر بادشاہ کو دیتے ہوئے فرمایا کہ لشکر حوض کے کنارے ایک موچی مقیم ہے، یہ ٹھیکری اس کو دے کر جواب لے آئیں۔ بادشاہ جب اس موچی تک پہنچا تو موچی نے ٹھیکری لے کر بادشاہ کو قہر

آلود نگاہوں سے دیکھا اور پھر اس ٹھیکری کے دوسری جانب کچھ لکھ کر وہ بادشاہ کو دے دی۔ جب بادشاہ نے وہ ٹھیکری ان دونوں بزرگوں کو واپس لا کر دی تو انھوں نے تحریر پڑھ کر کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ قلعہ کی تسخیر مشکل ہے، بڑی بڑی ہستیاں سلطان ابوالحسن (والیٔ قلعہ) کی طرفدار ہیں۔ بادشاہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا کہ کیا میری طرف کوئی بزرگ نہیں؟۔ اور پھر ان بزرگوں کو دوبارہ کوشش کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجبوراً ان دونوں بزرگوں نے اسی ٹھیکری پر دوبارہ کچھ لکھ کر بادشاہ کے ذریعہ اسی موچی کے پاس بھیج دی۔ اسی دوران دھوپ میں سحر کے آثار نمودار ہو چلے تھے۔ اس بار موچی اس ٹھیکری کو بہت دیر تک گھورتا رہا۔ بادشاہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چلا تھا۔ اس نے کہا کہ حضرت! جلدی بتائیے مجھے واپس جا کر فجر کی نماز بھی ادا کرنی ہے۔ غیظ و غضب کے عالم میں موچی کے ہاتھ سے ٹھیکری نیچے گر گئی۔ اس نے اپنے جسم پر پڑے ہوئے چمڑے اور اطراف میں پڑے ہوئے جوتے بٹورے اور دامن جھٹک کر کھڑا ہو گیا اور ایک سرد آہ بھر کر فرمایا "مشیت ایزدی یہی تھی، میں پچاس سال سے اس قلعہ کے دامن میں گوشہ گیر تھا، آخر جیتے جی یہاں سے اٹھنا پڑا، جاؤ ان سے کہہ دینا کہ وہ چلا گیا۔"

جب اورنگ زیب نے واپس جا کر ان بزرگوں کو حالات سے آگاہ کیا تو انھوں نے فتح کی مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ اب ہماری فوجیں قلعہ میں داخل ہو سکتی ہیں، اور پوچھنے پر یہ بھی بتایا کہ وہ حقیقت میں موچی نہیں بلکہ اس خطۂ ارض کے قطب تھے جو پچاس سال سے اس قلعہ کے معاون و محافظ تھے۔ اس طرح ۲۱؍ستمبر کو مذکورہ قلعہ ایک ہی یلغار میں فتح ہو گیا۔ وہ دونوں بزرگ حضرت سید یوسفؒ اور حضرت سید شریفؒ تھے جو دونوں اپنے وقت کے قطب ہوئے ہیں۔ [تفصیلات احقر کی کتاب "تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ" کی جلد چہارم "تذکرۂ جہانیاں" میں ملاحظہ فرمائیں۔]

(۱۱) منقول ہے کہ ۷۶۳ھ (۱۳۶۲ء) میں سلطان فیروز شاہ تغلق (م ۱۳۸۸ء) نے دوسری بار ٹھٹھہ پر حملہ کیا اور پل توڑ کر مع لشکر سندھ میں داخل ہو گیا۔ ٹھٹھہ کا حکمراں، جام بابینہ قلعہ بند ہو گیا اور سندھی فوجیں قلعہ سے باہر نکل کر بڑی بہادری سے فیروز شاہی لشکر کا مقابلہ کرتی رہیں بالآخر فیروز شاہ کو یہ یقین ہو چلا کہ اس کی فتح ناممکن ہے۔ اسی اثناء میں مخدوم جہانیاں

جہاں گشتؒ (م ۱۳۸۳ء) بھی اوچ سے ٹھٹھہ کے قریب آپہنچے۔ فیروز شاہ معہ لشکر ان سے استقبال کے لئے حاضر ہوا اور دعا کی درخواست کی۔ [سلطان فیروز شاہ تغلق، مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے بیعت تھا۔] انھوں نے فرمایا کہ عنقریب تمھاری فتح ہو جائے گی کیوں کہ ٹھٹھہ میں جو ولیہ رہتی تھیں اور جن کی وجہ سے ٹھٹھہ فتح نہیں ہو پا رہا تھا، اب چھ ہی روز پہلے ان کا وصال ہو چکا ہے۔ چنانچہ جب فیروز شاہ نے حملہ کیا تو اس بار قلعہ بآسانی فتح ہو گیا۔

(۱۲) ایک بار حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ [م ۱۴۳۲ء] قصبہ سنام [صوبہ پنجاب میں سرہند کے قریب واقع ہے] میں ایک ضعیفہ، فاطمہؒ کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں ان کی ایک مجذوب سے بھی دوستی ہو گئی جو مسجد میں پڑے رہتے تھے۔ بہت سے مجاذیب اور بے شمار لوگ ان سے نیازمندی کرتے تھے۔ ایک دن ایک دراز قد مجذوب ولایت خراسان سے آیا اور سنامی مجذوب سے کہنے لگا کہ تم میری ولایت خراب کر کے آئے ہو، اب میں تمھاری ولایت خراب کر دوں گا۔ دوسرے دن فاطمہؒ جو بہت صالح اور ولیہ صفت خاتون تھیں، نے خواب میں دیکھا کہ حوض میں سے کچھ لوگ مچھلیاں مار رہے ہیں۔ انھوں نے صبح کو حضرت شیخ احمد عبدالحق سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے، اور پھر فرمایا کہ تمہارے خواب کی تعبیر تو یہ ہے کہ سنام خراب ہو جائے گا، اور میرے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ دلّی تباہ ہو جائے گی۔ [ان ہی ایام میں مغلوں کا لشکر حملہ آور ہوا جس سے علاقہ تہ و بالا ہو گیا۔] شیخ عبدالحق نے جب سنامی مجذوب کے پاس جا کر پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے تو انھوں نے فرمایا کہ قہر حق نازل ہو چکا ہے، یہاں سے چلے جاؤ، ہم بھی یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد شیخ عبدالحق اپنے پیر مرشد، شیخ جلال الدین کبیر اولیاءؒ (م ۱۳۶۳ء) کے پاس پانی پت چلے گئے۔ وہاں بھی دیکھا کہ شیخ جلالؒ کو شمال کی جانب جانے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ انھوں نے شیخ عبدالحق کو دیکھ کر فرمایا "بابا احمد! قہر حق نازل ہو چکا ہے، جاؤ تمہیں اللہ کے سپرد کیا"۔ اس کے بعد شیخ عبدالحق، بدایوں کی طرف تشریف لے گئے۔

["مرآۃ الاسرار" (اردو ترجمہ) ص ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، "تذکرہ اولیائے پاک و ہند"، ص ۱۹۰، ۱۹۱]

اسی طرح جب اللہ تبارک وتعالیٰ کو گولکنڈہ کا قلعہ تسخیر کرنا منظور ہوا (ظاہر ہے کہ جب بھی مخالف فوجیں کسی بھی علاقے میں داخل ہوتی ہیں تو علاقے میں قتل و غارت گری اور تباہی مچتی ہی ہے۔) تو اس نے پچیس سال سے قلعہ کی محافظت کرنے والے قطب الارض کو وہاں سے ہٹا دیا۔ [تفصیل (۱۰) میں ملاحظہ فرمائیں۔]

(۱۴) آر جی کا "مینار پاکستان" پر جانا اس لئے ان کا ایک جرأت مندانہ فعل اور حیرت انگیز کارنامہ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ان کا تعلق ایک ایسی تنظیم کی شاخ سے ہے جس کا منشور جنگ، روشن اور انداز فکر بالکل واضح ہے اور جو اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کی سخت بلندہ مخالف رہی ہے۔ جس کا اقلیتی افراد، بالخصوص مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی اور انہیں مسمار کرنے سے سیدھا تعلق رہا ہے۔ جس کا مسلم کش فسادات سے دامن تار تار اور خوں آلود رہا ہے۔

ماضی میں انھوں نے مسلم کش فسادات کرا کر دیکھ لئے۔ [یہ قابل ذکر ہے کہ یہ فسادات انہیں شہروں میں کرائے گئے جہاں مسلمانوں کی Small Scale Industries قائم تھیں۔] مقصد صرف تھا مسلمانوں کو بے دست و پا اور اقتصادی اعتبار سے مفلوج کر کے رکھ دینا نیز ان کی آبادی پر روک لگا دینا یا پھر ان کے دماغ (پڑھا لکھا اور سرمایہ دار طبقہ) کو اسپین کی طرح نقل مکانی کرنے پر مجبور کر دینا وگرنہ ان کو اس مقام پر لے آنا جہاں انھوں نے ماضی میں دوسرے طبقات کو رکھا اور جن کو اب سرکار دبانے کی کوشش کر رہی ہے۔ [سوسائٹی کا کوئی کام بند نہیں ہوتا، خدمتی کام کمزور طبقہ ہی انجام دیتا ہے۔] لیکن مسلم نئی نسل نے انہیں ان کے ان مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

[نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمان غیور　　　موت کیا شے ہے، فقط عالم معنی کا سفر!]

پاکستان کے بننے سے ہندی مسلمانوں کا جو Brain Drain ہو گیا تھا، اس کو نئی نسل نے بخوبی پُر کرنے کی سعی کی۔ جب ان (R.S.S اور اس کی ذیلی تنظیموں) کی پہلی حکمت عملی کارگر نہ ہوئی تو اب انھوں نے اسرائیل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی Strategy تبدیل کر دی ہے۔ اب ان کے نشانے پر تعلیم یافتہ مسلم نوجوان ہیں جنھیں منظم اور دہشت گردانہ طریقے سے اغوا کر کے اور مبینہ طور پر دہشت گرد قرار دیتے ہوئے ان کا فرضی

Encounter کیا جا رہا ہے۔[کیوں کہ جن بے قصور مسلم نوجوانوں کو وہ پکڑتے ہیں انھیں عدالت سے انصاف مل جاتا ہے۔] ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ کام اس ایجنسی سے انجام دلایا جا رہا ہے جس سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی کیوں کہ ان کا بنیادی مقصد ظلم و زیادتی کا سدِ باب کرنا ہے، نہ کہ اس میں ملوث ہو جانا۔(۱۶) شاید سرکاری مشینری میں یہ وہی پرزے ہیں جن کو فٹ (Fit) مذکورہ تنظیم نے اپنے دورِ اقتدار میں کیا تھا۔ پہلے سہارا "لشکر طیبہ" کے نام کا لیا جاتا تھا، اب سیمی (SIMI) اور "انڈین مجاہدین" سے نام لیے جا رہے ہیں۔[حالانکہ ۲۵ راگست ۲۰۰۸ء کو کانپور (بھوپیندر چوپڑا اور راجیو مشرا) اور اپریل ۲۰۰۶ء میں ناندیڑ (نریش اور ہمانشو پانڈے) میں بم بناتے ہوئے ہر دو جگہوں پر جو دو دو اشخاص ہلاک ہوئے تھے، ان سب کا تعلق "بجرنگ دل" سے تھا۔ اسی طرح ۲۰۰۳ء میں پربھنی کی مسجد میں جو بم پھٹا اس میں بھی اسی تنظیم کا ہاتھ بتایا گیا ہے۔(بشکریہ "ہندوستان ٹائمس"، مورخہ ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۸ء ص ۹)] دراصل صیہونی طاقتوں کے مقاصد تین ہیں اول یہ کہ مسلم Community کو اتنا خوف زدہ کر دیا جائے [تو پھر وہشت گرد کون ہوا؟] کہ والدین اپنے بچوں کو اعلیٰ اور مناسب تعلیم دلانے کی غرض سے باہر کی معیاری درسگاہ میں نہ بھیجیں، دوم یہ کہ نجی ادارے، بالخصوص Multinational Companies ان کے لئے اپنے دروازے بند کر دیں [سرکاری ملازمتوں میں تو ان کا تناسب لگ بھگ صفر کیا ہی جا چکا ہے] سوئم یہ کہ کھلے ذہن، انصاف پسند غیر مسلموں کے ذہنوں کو پراگندہ کرتے ہوئے انھیں ان کے ان اوصاف سے محروم کر دیا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کو اچھوت سمجھنے لگیں۔ لیکن انشاءاللہ ان کا یہ حربہ بھی کارگر نہ ہو سکے گا کیوں کہ اس نانک، چشتی اور گاندھی کے دیش میں ابھی انصاف پسند اور سلجھے ذہن برادرانِ وطن اتنے بھی بے وزن نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اب ستم زدوں نے بھی آنسوئی بجائے پسینہ بہانا سیکھ لیا ہے۔ ہر تاریکی میں صبح کا راز مضمر ہے۔ ہر خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے   کاروانِ بہار دیکھا ہے

ویسے بھی یہ قدرت کا نظام ہے کہ جس قوم کو جتنا دبایا جاتا ہے، اس کی تخلیقی صلاحیت میں اتنا ہی اضافہ بھی ہوتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پاسباں مل جائیں کعبہ کو صنم خانے سے۔

لیکن اس آزمائش کی گھڑی میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بھی اپنا محاسبہ کریں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اس دور میں اس ملک میں جب کہ گاؤں گاؤں میں مدن موہن مالویہ پیدا ہو رہے ہیں اور جگہ جگہ نجی سیکٹر میں MBA انجینئرنگ اور میڈیکل کالج کھل رہے ہیں تو ہمارے یہاں سرسید احمد خاں کیوں نہیں پیدا ہو رہے؟ آخر ہم کب تک تعلیم سے بھاگتے رہیں گے؟۔ ایک بار مدن موہن جی نے فرمایا کہ سرسید کو مجمع جمع کرنے کی ضرورت ہی نہیں، مسجد میں ہی سب مل جاتے ہیں۔ لیکن اب بقول اکبر الہ آبادی حال یہ ہے ؎

گرجا میں "ات" صاحب مسجد میں فقط جمن

ہمارا الیکٹرونک میڈیا، ہمارا اپنا پرنٹ میڈیا کیوں نہیں؟۔ کیا ہمارے پاس دولت کی کمی ہے؟ کیا ہمارے پاس باصلاحیت افراد کا فقدان ہے؟ نہیں، بالکل نہیں۔ ضرورت ہی ہے تو اتحاد و اتفاق کی، بیداری کی ہے تو تنظیم کی۔ آج ہم شور مچاتے ہیں کہ سرکاری ملازمتوں میں ہمارا تناسب صفر رہ گیا ہے۔ کیا ہم نے یہ دیکھا کہ جس مقام پر ہمارا جتنا تناسب ہے وہاں کے تعلیمی اداروں میں بھی ہمارا اتنا ہی تناسب ہے؟ آخر اس کا ذمہ دار کون ہے؟۔ کیا سرکار ہمارے گھر سے بچوں کو سکول لے جانے آئے گی؟ بقول علامہ اقبال ؎

آہ اے مرد مسلماں تجھے کیا یاد نہیں حرف لا تدع مع اللہ الٰہا آخر

ہم اپنے گھروں میں دروازے تو لگاتے نہیں اور غیروں سے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ہمارے گھر کی رکھوالی کرے!؟

لوگ ناخون سے بناتے ہیں چٹانوں میں کنواں اور امید یہ کرتے ہیں کہ پانی نکلے!!

یہ کہاں کا منطق ہے؟۔ آج ہم "بجرنگ دل" پر تو پابندی عائد کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کی پشت پر کتنی زبردست تنظیم (۱۴) ہے۔ حال ہی میں "ہندوستان ٹائمس" میں اس تنظیم کا ایک مختصر سا خاکہ شائع کیا گیا ہے۔ آپ بھی اس کو ملاحظہ فرمالیں۔ افسوس!۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنے بھی چہرے کو بگاڑ !
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے !!

ایک بار کسی نے کسی مفکر (غالباً روسی مفکر، ٹالسٹائے) سے پوچھا کہ دنیا میں سب سے اچھی چیز کیا ہے اور سب سے بری چیز کیا ہے؟۔ اس نے جواب دیا کہ سب سے اچھی چیز مذہب اسلام ہے اور سب سے بری چیز آج کل کے مسلمان ہیں۔ جب سوالی نے وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ حالتِ نماز میں اسلام کی Discipline اور مسجد سے باہر نکلتے وقت مسلمانوں کی افراتفری کا عالم خود دیکھ لو۔

صد افسوس!! ایک وہ وقت تھا جب کسی بھی مومن کو دیکھ کر باہم دست و گریباں کفار یہ سمجھ جاتے تھے کہ اب تصفیہ ہو جائے گا۔ ایک یہ دور ہے کہ ہم خود دست و گریباں ہیں، ہماری موجودگی ان کے شعلۂ بغض کا سبب بن جاتی ہے۔ آج ہم یہ بھول گئے ہیں کہ ہم اس کے غلام ہیں جو رحمت اللعالمین بن کر تشریف لائے۔ نادانی کے نام پر ہم نفس اور روپے کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ہمارے رہنما مصلحت کوشی، سرمایہ دار آرام طلب اور masses کسی معجزے کے انتظار میں ہیں۔ ہم کیپشنوں سے تو امید رکھتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ یہ خواب آور خوشنما capsules سے زیادہ کچھ نہیں۔ کیپشن تو ہر سیاسی پارٹی کا ایک حربہ بھر ہوتا ہے۔ کپڑے تبدیل کرائے جاتے ہیں لیکن جسم اور ذہن تبدیل نہیں ہوتے۔ افسوس کہ جو قوم "اَلصَّلٰوةُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" کی ایک صدا پر بستر استراحت سے الگ ہو جاتی تھی آج وہ گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی ہے۔ یاد رکھیں، بنا قربانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم صفوں میں اتحاد قائم رکھیں، نظم و ضبط، صبر و تحمل سے کام لیں اور دہشت گردوں [جو یقیناً مسلمان نہیں ہو سکتے کیوں کہ اسلام تو اخوت و بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ خودکشی اسلام میں حرام ہے، اور اسی لئے خودکشی کرنے والے کے لئے دعائے مغفرت بھی نہیں کی جا سکتی۔ جان اللہ کی ایک امانت ہے، امانت میں خیانت کا کسی کو کوئی حق نہیں۔ اس لئے ایسا کرنے والے اسلام کے دشمن ہی ہوں گے۔ وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتے۔] کو اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

نازک بہت ہے وقت، خموشی سے ربط کر
غصہ ہو، آہ ہو، کہ ہنسی، سب کو ضبط کر

یہ ضروری ہے کہ سرمایہ دار وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تعلیمی ادارے اور انڈسٹریز

قائم کریں۔ نوجوان تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں اور مقابلے جاتی امتحانات میں Top کریں [وہ یہ ذہن نشین کریں کہ جو مسلم دشمن قوتیں لکھنے پڑھنے والے نوجوانوں کا مستقبل کمند تاریک ہے، وہ دہشت گرد بنانے کی مذموم کوشش کر رہی ہیں تاکہ وہ اپنے راستے سے بھٹک جائیں۔] سیاست داں مصلحت کوشی کے خول سے باہر نکل کر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک Charter of Demand مرتب کرکے جمہوریت اور سیاسی پارٹیوں سے رابطہ قائم کریں [جمہوریت میں انسانوں کو تولا نہیں جاتا صرف گنا جاتا ہے۔] اور Masses کی رہنمائی فرمائیں۔ Masses کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بکروں کی روش چھوڑ کر اپنے رہنماؤں کے پیچھے پر بیٹھ کہیں۔ یہ وہ بھی چاند کے گرد ستاروں کے مانند پڑے ہوتے ہیں اور چاند ستاروں کی دنیا میں تنہا ہوتا ہے۔ حق حقیقت میں وہ ہے۔ اپنے کردار سے فراق اور تیجوری کے اس قلعہ میں بیداری کی روح پھونکیں۔

قرنوں کے مٹانے سے مٹے ہیں نہ مٹیں گے — آفت زمانہ سے جھکے ہیں نہ جھکیں گے
مرنے تو زمانے سے دبے ہیں نہ دبیں گے — ہم موت کے ڈر سے بھی مرے ہیں نہ مریں گے
ہم زندہ تھے، ہم زندہ ہیں، ہم زندہ رہیں گے

(۱۴) راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ (R.S.S) ۱

- وشو ہندو پریشد (V H P) ۲
  - سیوا بھارتی (S B) ۷
  - ودیا بھارتی (V B) ۸
  - بجرنگ دل (B D) ۹
- ونواسی کلیان آشرم (V K A) ۳
- بھارتیہ مزدور سنگھ (B M S) ۴
- اکھل بھارتیہ ودھیارتھی پریشد (A B V P) ۵
- بھارتیہ جنتا پارٹی (B J P) ۶

۱ یہ ایک مردانہ نیم فوجی تنظیم ہے جس کے جھنڈے کا رنگ بھگوا (زعفرانی) ہے۔ اس کی تشکیل ۲۱ ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔ ناگپور میں کانگریس سیشن کے موقع پر ایک ڈاکٹر ...

کار ہیں، ہیڈگوار (Hedgewar) نے پہلی مرتبہ رضا کاروں کی ایک تنظیم قائم کی جن کی وردی خاکی نیکر، سفید قمیص اور کالی ٹوپی مقرر کی گئی تھی۔ اس کے پانچ سال بعد اس نے اسی تنظیم کو R S S کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اس وقت اس تنظیم کے تقریباً اٹھارہ لاکھ ممبران اور اس کی چالیس ہزار شاخیں (Branches) ہیں۔ اس تنظیم کا مکھیا (Head) ''سر سنگھ چالک'' کہلاتا ہے۔ (اس کا ہیڈ کوارٹر ناگپور میں ہے۔) اس وقت اس کے موہن بھاگوت ''سر سنگھ چالک'' ہیں۔ اس تنظیم کے تین ہزار ایسے Full time کل (Male) ورکر ہیں جو غیر شادی شدہ ہیں، شادی اس ساری زندگی نہیں کی بھی ابھی تک کنوارے ہیں۔) یہ ''پرچارک'' کہلاتے ہیں اور اس تنظیم کی ریڑھ کی ہڈی مانے جاتے ہیں۔ یہ ''پرچارک'' دوسری تنظیموں جیسے B J P اور B M S وغیرہ کو وقت پڑنے پر ادھار دیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ ۱۹۶۴ء میں ۲۹ اگست کو سادھوؤں کے اجتماع میں بحیثیت R S S کی مذہبی شاخ کے قائم ہوا۔ اس وقت اس کے صدر اشوک سنگھل اور جنرل سیکرٹری پروین توگڑیا ہیں۔

۳۔ ۱۹۵۲ء میں قائم ہوا۔ اس کا کام عیسائی مشنریز کی سرگرمیوں کا کاٹ کرنا ہے خاص کر قبائلی علاقوں میں۔ اس وقت اس کے روح رواں جگدیو اورام ہیں۔

۴۔ ۱۹۵۵ء میں ''لیفٹ ٹریڈ'' (Left Trade) یونینوں (کمیونسٹ یونینوں) کے متبادل کے طور پر وجود میں لائی گئی۔ اس وقت اس کے صدر ہسموکھ بھائی دوے ہیں۔

۵۔ ۱۹۴۸ء میں قائم ہوا۔ طالب علموں میں کمیونسٹوں کے اثرات کی بیخ کنی کے لئے وجود میں آیا ہے۔ اس وقت اس کے صدر رام نریش سنگھ (سابق ممبر اسمبلی بہار) ہیں۔

۶۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں قائم ہوئی۔ جمہوریت اور سیاسی پارٹیوں بالخصوص کانگریس کے خلاف سیاسی سطح پر محاذ آرائی کے لئے وجود میں لائی گئی۔ اس وقت اس کے صدر راج ناتھ سنگھ ہیں۔

۷۔ ۱۹۷۹ء میں قائم کی گئی۔ اس کا کام کچی بستیوں (Slums) اور دیہاتوں میں پرچار کرنا ہے۔

۸۔ ۱۹۷۷ء میں قائم کی گئی۔ اس کا کام سکولوں کے Network میں اشتراک پیدا کرنا ہے۔

۹ ۱۹۸۲ء میں قائم کی گئی۔ اس کا کام بزور طاقت اپنی بات منوانے کا ہے۔ اس وقت اس کے نیشنل کنوینر پرکاش شرما ہیں۔

[بشکریہ ''ہندوستان ٹائمز'' ص ۹، مورخہ ۱۹/ اکتوبر ۲۰۰۸ء]

مذکورہ بالا کے علاوہ بھی بہت سی ایسی تنظیمیں ہیں جن میں باہمی اشتراک اور تعلقات، بالخصوص مسلمانوں کے بارے میں نظریاتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جیسے ''بھارتیہ کسان سنگھ'' (R.S.S. کی کسان شاخ ہے)، ''درگا واہنی'' (وشو ہندو پریشد کی خواتین شاخ ہے جس کی ابتداء ۱۹۹۱ء میں سادھوی رتمبرا نے کی۔)، ''راشٹریہ سیویکا سمیتی'' (یہ RSS کی طرز پر خواتین کی تنظیم ہے جو ۱۹۳۶ء میں وجود میں آئی۔ اس کے ذمے ''سمیتی شکشک ورگ'' کا انتظام ہے)، ''بے کلیان سمیتی''، ''ہندو جاگرن سمیتی'' (جموں کے علاقے میں سرگرم ہے)، ''ہندو راشٹریہ سینا'' (HRS)، ''آریہ سینا'' (اس کا بانی یو۔پی کے مظفر نگر کا رہنے والا ایک برخاست شدہ سپاہی دھیندر ملک ہے ۲۰۰۲ء میں سہارنپور میں ہوئے متعدد دھماکوں سے یہ بے نقاب ہوا اور ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔)، ''شری رام سینا'' (اس کا بانی رکن کرناٹک کا پرمود متالک ہے جو کبھی بجرنگ دل میں ہوا کرتا تھا ۲۰۰۴ء میں اس نے مذکورہ دل سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ۲۰۰۸ء میں اس تنظیم کی بنیاد رکھی۔)، ''شیو سینا'' (اس کے صدر بال ٹھاکرے ہیں جو کبھی سنڈے ''مارمک'' میں ایک کارٹونسٹ ہوا کرتے تھے۔ ۱۹/ جون ۱۹۶۶ء میں وجود میں آئی۔)، ''مہاراشٹر نو نرمان سینا'' (MNS) (بال ٹھاکرے کے جواں سال بھتیجے راج ٹھاکرے اس کے کرتا دھرتا ہیں جو کبھی ''شیو سینا'' میں ہوا کرتے تھے لیکن ۲۰۰۶ء میں انھوں نے اپنی یہ نئی پارٹی تشکیل دے لی۔ تبھی سے اس نے آج کل ممبئی میں دہشت کا ماحول پیدا کیا ہے نیز توڑ پھوڑ اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔)، ''ہندو جاگرن منچ''، ''جے ہندو راشٹرم''، ''اکھل بھارتیہ ہندو مہاسبھا'' (۱۹۱۵ء میں قائم ہوئی۔ موجودہ صدر ہمانی ساورکر ہیں۔)، ''سناتن پربھات''، ''سناتن سنستھا'' (جموں کے علاقے میں سرگرم ہے۔)، ''گرو کرپا پرشٹھان'' (کشمیر کے جموں علاقے میں سرگرم ہے۔)، ''ہندو ودیا کیندر'' (کمیونسٹ طرز پر ہندوتو لٹریچر تقسیم کرنے کی ذمہ داری ہے۔)، ''بھارتیہ جن شکتی''

پارٹی" (R S.S کی سیاسی شاخ ہے جس کی روحِ رواں اوما بھارتی ہیں جو پہلے "بی' جے پی" میں ہوا کرتی تھیں اور مرکز میں وزیر بھی رہیں۔ اوما بھارتی ایک شعلہ بیان مقرر ہیں۔)، "دین دیال شودھ سنستھان" (R S S کی Idiological Unit ہے۔ "منتھن" نامی رسالہ نکالتی ہے۔)، "دین دیال ریسرچ انسٹیٹیوٹ" (یہ بھی R S.S کی Idiological unit ہے۔ دراصل دین دیال اپادھیائے بھی R.S S کے سینیر کارکن ہوا کرتے تھے۔ انھیں پراسرار طور سے قتل کردیا گیا تھا۔)، "ہندو ساہتیہ کیندر" (۱۹۸۴ء میں قائم ہوا)، "نیشنل میڈیکوز آرگنائزیشن" (آر ایس ایس کی طبی شاخ ہے)، "ابھینو بھارتی" (اس کی بنیاد ویر ساورکر نے ۱۹۰۲ء میں رکھی تھی لیکن ۱۹۵۲ء میں اسے بند کردیا گیا تھا۔ ۲۰۰۶ء میں اسے دوبارہ "ہندو مہاسبھا" کے بانی، ویر ساورکر کے بھائی کی بہو، اور مہاتما گاندھی کے قاتل، ناتھورام گوڈسے کے بھائی، گوپال گوڈسے کی دختر، ہیمانی ساورکر نے زندہ کیا۔ رمیش اپادھیائے اس کا موجودہ صدر اور ہیمنت کلکرنی مدھیہ پردیش شاخ کا صدر ہے۔ "مالیگاؤں بم دھماکے" سے جڑے بھی مشتبہ ہندو دہشت گرد کسی نہ کسی شکل میں اس تنظیم سے جڑے ہیں۔)، "راشٹریہ جاگرن منچ" (R J M) (پرگیہ سنگھ ٹھاکر عرف سادھوی پورنہ چیتانند گری صدر ہے۔ یہ اسی سال ۲۰۰۸ء میں ۳؍جولائی کو اندور میں ہوئے فرقہ وارانہ فساد جس میں آٹھ جانیں تلف ہوئیں، کے بعد وجود میں آئی۔) اور "ہندو منانی" (یہ جنوبی صوبوں میں قائم ہے۔) وغیرہ وغیرہ۔

پرگیہ سنگھ ٹھاکر کی رسائی تو ملٹری کے اعلیٰ آفیسران تک بتائی جارہی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ ایک نہایت خطرناک صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے۔ ۲۹ ستمبر ۲۰۰۸ء کو مالیگاؤں (ضلع ناگپور) میں ہوئے بم دھماکے جس میں ۱۶ افراد ہلاک ہوگئے تھے، کی تفتیش کے سلسلے میں مہاراشٹر "دہشت گردی مخالف دستے" [Anti Terrorist Squad (ATS)] نے جو سنسنی خیز انکشافات کیے وہ چونکا دینے والے ہیں۔ اب تک ATS نے جن گیارہ مشتبہ مجرموں کو گرفتار کیا ہے ان کے نام اس طرح سے ہیں —

۱۔ **پرگیہ سنگھ ٹھاکر عرف سادھوی پورنہ چیتانند گری (عمر ۳۸ سال)**:
یہ ہندو دہشت گرد تنظیم "راشٹریہ جاگرن منچ" کی صدر، آر۔ ایس۔ ایس کے ایک رکن چندر پال سنگھ ٹھاکر کی بیٹی اور مدھیہ پردیش کی رہنے والی ہے۔ "اکھل بھارتیہ ودیارتھی پریشد" کی بھی رکن رہ چکی ہے۔ ۲۰۰۷ء میں "پریاگ کمبھ"

کے دوران مشہور پجاری سوامی اودھیش آنند گری سے دیکشا لے کر سادھوی بن گئی۔

۲۔ **لیفٹیننٹ کرنل (Lieutenant Colonel) شری کانت پروہت (عمر ۳۷ سال)** = یہ فوج کی "مہاراشٹر لائٹ انفنٹری" میں لیفٹیننٹ کرنل اور ایک کمیشنڈ آفیسر ہے۔ گرفتاری سے پہلے پنچمڑھی میں تعینات تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے مجرموں کو RDX مہیا کرایا۔ مالیگاؤں کے علاوہ حیدرآباد کی مکہ مسجد اور ۱۹ فروری ۲۰۰۷ء کو پانی پت کے قریب "سمجھوتہ ایکسپریس" جس میں ۶۸ بے گناہ مسافر شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے تھے، میں جو دھماکے ہوئے تھے ان میں بھی اسی کا ہاتھ بتایا جا رہا ہے [پہلے "سمجھوتہ ایکسپریس" دھماکے کا الزام صفدر ناگوری پر تھا اور مکہ مسجد کے حملے میں کسی بنگلہ دیشی تنظیم "حرکت الجہاد اسلامی" (HUJI) کا نام لیتے ہوئے بے قصور مسلمان نوجوانوں پر ہی گرائی گئی تھی۔] یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ ۱۶ تا ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو اس نے پنچمڑھی میں ایک ٹریننگ کیمپ لگایا جس میں دن میں "یوگا" اور "سادھنا کی" تربیت اور رات کو بم سازی اور ہتھیار چلانے کی ہندو انتہا پسند نوجوانوں کو مخصوص ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اس کیمپ میں جبل پور، بھوپال، کھنڈوا وغیرہ کے تقریباً ۲۹ نوجوانوں نے حصہ لیا تھا ان میں سے محض ۱۰ کو ہی بم سازی اور ہتھیار چلانے کی خصوصی تربیت دی گئی۔ یہ قابل ذکر ہے کہ جبل پور میں تین آرڈیننس فیکٹریاں واقع ہیں۔

۳۔ **امرتانند سرسوتی مہاراج عرف دیانند پانڈے** = ان کو خود ساختہ "شنکر آچاریہ" بتایا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو خواجہ غریب نواز کی درگاہ شریف اجمیر میں جو بم دھماکہ ہوا تھا اس کا ماسٹر مائنڈ یہی شخص ہے جب کہ پہلے شک مسلمانوں پر ہی کیا جا رہا تھا۔

۴۔ **سمیر کلکرنی (عمر ۳۲ سال)** = سابق فوجی اور ہندو سخت گیر تنظیم "ابھینو بھارت" کا سرگرم رکن ہے۔ بھوپال کی ایک پریس میں کام کرتا تھا۔

۵۔ **رمیش اپادھیائے** = پونہ کا رہنے والا ہے اور سابق میجر ہے۔ آرمی کی آرٹیلری رجمنٹ میں رہ چکا ہے۔

۶۔ **شیام بھنور لال ساہو (عمر ۴۲ سال)** = کامرس سے گریجویٹ ہے۔ بھوپال میں موبائل کا کاروباری ہے۔

۷۔ **شیو نرائن سنگھ (عمر ۳۶ سال)** - رام جی کال سانگرے کا بھائی اور اندور سے بی ایس سی گریجویٹ ہے۔ ایک الیکٹریشین اور LIC ایجنٹ بطور کام کرتا ہے۔

۸۔ **راکیش دھاوڑے** = ہتھیار چلانے میں ماہر مانا جاتا ہے۔ اس کے پاس نادرت جوہتھیاروں کا ذخیرہ بھی مونا تایا گیا ہے۔

۹۔ **جگدیش مہاترے**

۱۰۔ **اجے راہیلکر (عمر ۳۹ سال)** = "ابھینو بھارت" کا خزانچی ہے۔

۱۱۔ **سدھاکر چترویدی**

یہ قابل ذکر ہے کہ ۴ راور ۵ راپریل ۲۰۰۶ء کی درمیان شب کو ناندیڑ میں لکشمن راج کوندوار کے گھر پر جو بم بناتے وقت دھماکہ ہوا تھا اور جس میں اس کا بیٹا نریش اور VHP کا ایک رکن ہمانشو پانسے مارے گئے تھے، کے سلسلے میں تفتیشی ایجنسیوں کو راج کونڈوار کے گھر سے نقلی داڑھیاں، ٹوپیاں اور اورنگ آباد کی ایک مسجد پر حملے سے متعلق نقشے خاکے وغیرہ ملے تھے۔ اگر اسی وقت غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس واقعہ کو سنجیدگی سے لیا جاتا تو شاید اس کے بعد جو دھماکے ہوئے، انہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ لیکن CBI سے جانے یا انجانے میں چوک ہوگئی۔

اب تک مہاراشٹر "دہشت گردی مخالف دستہ" (ATS) مسٹر ہیمنت کرکرے (۱۷) کی سربراہی میں جس حوصلے، دیانتداری، جرأت اور غیر جانبداری سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ثابت کرنے میں لگا رہا ہے اس کے سے ہر منصف و امن پسند اور صاف ذہن ہندوستانی، بالخصوص مظلوم فرقہ اس و سلام کرتا ہے اور بی بی نے ان نہیں اپنے محسنوں کو تا قیامت یاد رکھیں گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر کرکرے کے بعد اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ آیا کہ

مسمار کرنے کے جانشین ان کے نقش قدم پر چلنا پسند کریں گے جو کانوں سے بہرے ہیں یا صیہونی طاقتوں کے دباؤ میں آ کر خانہ پوری کریں گے۔

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اسرائیل سے ہمارے سفارتی تعلقات ۱۹۹۲ء سے قائم ہوئے اور تبھی سے تمام دھماکوں کی ذمہ داریاں مسلمانوں کے سر تھوپی جارہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بدبخت یہ تنظیموں کی اسرائیل کی خفیہ ایجنسی "موساد" اور امریکہ کی خفیہ ایجنسی "CIA" سے ضرور کوئی سازباز ہے جو ہمارے ملک کی سالمیت کے لئے ایک خطرہ ہو سکتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ R S S اور بی جے پی تنظیمیں اب مجرموں کی حمایت میں بچاؤ پر غور کر رہی ہیں کیوں کہ اب ان کی قلعی کھل رہی ہے۔ ویسے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جب باپوئے قوم مہاتما گاندھی جی کو قتل کیا گیا تھا تب بھی ان ہی لوگوں نے قاتل کی پیروی کی تھی حتیٰ کہ ان کی خواتین نے اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے سویٹر تک بن کر بھیجے تھے اور جب اس کو پھانسی کی سزا ہوئی تو انھوں نے مرگھٹ کا سارا خرچ برداشت کیا تھا۔ چونکہ مہاتما گاندھی عدم تشدد کے پیرو تھے اس لئے ان کے قاتل کو پھانسی کی سزا دی جائے یا سزا عمر قید میں تبدیل کر دی جائے۔ جب مبینہ طور سے ایک مسلمان کو دہشت گردی کے الزام میں یو۔پی۔ پولس نے گرفتار کیا تھا تو چند تنگ نظر، ناعاقبت اندیش اور انصاف پسندی سے دشمن چند وکلاء صاحبان نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اس کی (مسلمان مبینہ مجرم کی) پیروی نہیں کرنے دیں گے۔ اسی طرح وہ ملزم قصاب کی پیروی پر بھی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ جب کہ چیف جسٹس کا کہنا ہے کہ کسی بھی شخص کو قانونی مدد سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے پوچھا جائے کہ مالیگاؤں بم دھماکوں کے سلسلے میں Polygraph & Narco Analysis Test کے بعد جو حقیقت ابھر کر سامنے آئی ہے، اس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے!!

جو چپ رہے گی زبان خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

(۱۵) طوفان اور باد و باراں (۱۸) میں اولیاء اللہ کے چراغ گل نہ ہونے کے بارے میں بہت سی مستند کتب میں حوالے ملتے ہیں۔

منقول ہے کہ جن دنوں شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ [آپ حضرت خواجہ یسویؒ کی اولاد

سے تھے جن کا سلسلہ نسب حضرت محمد حنیفہ بن امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ پیر و مرشد کی تلاش میں ترکستان سے ماوراء النہر اور پھر ہند وارد ہوئے۔ چھ ماہ تک شیخ الاسلام حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کی صحبت میں رہنے کے بعد حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابرؒ (م ۱۲۹۱ء) کی خدمت میں پہنچ کر بیعت سے مشرف ہوئے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد خود کو پردہ میں رکھنے کی خاطر سلطان غیاث الدین بلبن (م ۱۲۸۶ء) کے مصاحبوں میں ملازمت اختیار کر لی۔ بعد ازاں پیر و مرشد کی وصیت کے مطابق ان کے وصال کے تین دن بعد اور قریب وصال شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندر (م ۱۳۲۳ء) صاحب ولایت پانی پت، پانی پت پہنچ کر وہاں کے صاحب ولایت ہوئے۔ ۷۱۶ھ (۱۳۱۶ء) میں وصال ہوا اور پانی پت میں مدفون ہوئے۔]

سلطان غیاث الدین بلبن کے یہاں ملازم تھے تو بلبن نے ایک قلعہ پر یورش کی اور ایک عرصے تک اس کا محاصرہ کئے رہا لیکن فتح میسر نہ کی۔ ایک رات زبردست طوفان آیا جس سے لشکر کے خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں اور شمعیں گل ہو گئیں۔ سلطان کے وضو کے پانی گرم کرنے کی غرض سے ایک خدمت گار (سقہ) آفتابہ لے پھرا کہ کہیں سے آگ مل جائے کہ اتنا کہ اس نے دیکھا کہ ایک خیمے میں روشنی ہو رہی ہے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک بزرگ قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول ہیں اور شمع بدستور جل رہی ہے۔ صبح کو اس نے یہ بھی دیکھا کہ ان بزرگ نے جس تالاب پر وضو فرمایا تھا وہاں کا پانی سخت سردی کے باوجود بھی گرم ہے۔ سقہ نے پوری کیفیت سلطان سے عرض کی۔ اگلے دن سلطان نے خود مشاہدہ کیا اور واقعہ صحیح پایا۔ تب اس نے ان بزرگ کے خیمے میں جا کر عرض کیا کہ بد قسمتی کہ آپ جیسے بزرگ میرے لشکر میں موجود ہیں لیکن قلعہ فتح نہیں ہو پا رہا ہے۔ انھوں نے ہر چند سلطان کو ٹالنا چاہا لیکن جب سلطان نہ مانا تو انھوں نے فرمایا کہ اسی وقت قلعہ پر یلغار کرو، اس بار ان شاء اللہ فتح ہو جائے گا اور پھر وہ بزرگ خود سجدے میں گر گئے۔ قلعہ پر یلغار کی گئی اور وہ حکم ربی سے فتح ہو گیا۔ وہ بزرگ حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی ہی تھے۔ [''تذکرہ اولیائے پاک و ہند'' ص ۱۷۴]

ایک اور واقعہ منقول ہے۔ مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے لئے چتوڑ کا قلعہ فتح کرنا

دردِ سر بنا ہوا تھا۔ اس کے فتح کرنے میں جب بادشاہ ناکام ہو گیا تو اس نے خواص اور ارکانِ سلطنت سے مشورہ کیا۔ بادشاہ کو بتایا گیا کہ اوچ میں ایک بزرگ رہتے ہیں اگر وہ دعا فرما دیں تو یہ قلعہ فتح ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے فوراً ایک وفد ان بزرگ حضرت سید محمد شاہ موسیٰ دریا بخاری [آپ سید جلال الدین سرخ بخاری کی اولاد سے تھے۔ ۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴ء) میں وصال ہوا۔ مزار شریف لاہور میں واقع ہے۔ تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ”تذکرہ شیخ بہائے کرام اولیاء“ کی جلد سوم ”مشائخ ابرار“ میں ملاحظہ فرمائیں۔] کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب وفد نے اوچ پہنچ کر بادشاہ کا پیغام آپ تک پہنچایا تو آپ نے فرمایا کہ آپ سب لوگ واپس جائیں اور جو ساتھی بادشاہ نے ہمارے لیے بھیجے ہیں انہیں بھی واپس لے جائیں ہم اکیلے خود چتوڑ کے قلعہ پر پہنچ جائیں گے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ہماری آمد کی شب اللہ کے حکم سے سخت طوفان آئے گا جس سے خیمے اکھڑ جائیں گے نیز چراغ گل ہو جائیں گے لیکن ایک ہی چراغ روشن رہے گا جو ہمارے خیمے کا ہوگا۔ چند دنوں بعد ایک شب کو حضرت موسیٰ دریا کے فرمان کے مطابق سخت طوفان آیا جس سے لشکر کے خیموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں اور چراغ گل ہو گئے۔ جب بادشاہ کے لشکر کو جب مصاحبین سے تفتیش کی تو ایک خیمے میں چراغ روشن پایا۔ چنانچہ بادشاہ اس سمت چل پڑا۔ اس نے وہاں جا کر دیکھا کہ ایک نورانی صورت بزرگ محو عبادت ہیں۔ جب وہ بزرگ (حضرت موسیٰ دریا) عبادت سے فارغ ہوئے تو آپ سے اجازت لے کر خیمے کے اندر داخل ہوا اور عرض حال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ انشاء اللہ کل قلعہ فتح ہو جائے گا۔ دوسرے دن حضرت موسیٰ دریا بخاری قلعہ کے پاس تشریف لے گئے اور تین بار بآواز بلند اسم ذات ”اللہ“ اپنی زبان مبارک سے پکارا۔ اس کے بعد آپ نے جیسے ہی قلعہ پر پھونک ماری تو وہ ناقابل تسخیر قلعہ چند گھنٹوں میں اللہ کے فضل و کرم سے سر ہو گیا۔

(۱۶) ۱۹۹۵ء میں احقر مراد آباد میں تعینات تھا۔ دوران الیکشن اس کی قصبہ سنبھل میں ڈیوٹی تھی۔ وہ کوتوالی میں تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ وہیں ایک پولیس افسر جو غالباً Dy SP تھے، بھی آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں کوتوالی انچارج بھی وہاں آگئے۔ احقر دونوں کے لئے اجنبی تھا لیکن پھر بھی احقر کی موجودگی کا پاس لئے بغیر Dy SP موصوف نے کوتوال صاحب سے

سوال یہ کہ قصبے میں ہندو مسلم تناسب کیا ہے؟ کوتوال صاحب نے جواب دیا "۳۰-۷۰" کا۔ اس پر Dy SP صاحب نے قدرے متعجب ہو کر دوسرا سوال کیا کہ یہ قصبہ تو بہت Sensitive ہے، پھر کس طرح ہندو یہاں محفوظ رہتے ہوں گے؟ کوتوال صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ ایسے موقعوں پر ہمیں ہی مجبور کرنا پڑتا ہے۔ اس جواب پر Sy SP صاحب نے قدرے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ایک واقعہ کوتوال صاحب کو سنایا۔ بقول ان کے، جب وہ خورجہ میں کوتوال تھے تو وہاں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ جب مسلمان بلوائیوں پر حاوی ہونے لگے تو انہوں نے خود مورچہ سنبھالتے ہوئے ایک شخص (اس شخص کی نشاندہی کرتے ہوئے) کو وہیں مار دیا ... تحقیقات میں کسی کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ کس نے مارا تھا۔

کچھ اسی طرح کی ملاقات ایک "آبزرور" (Observor) سے بھی ہوئی۔ وہ چند افسران کے ساتھ ایک کمرہ میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ دوران گفتگو خاندانی منصوبہ بندی کا بھی ذکر چھڑ گیا۔ "آبزرور" موصوف نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے زہر اگلا کہ ایک مخصوص اقلیتی فرقے (بہت بھدے الفاظ میں فرقے کا نام لے کر) کے لوگ اس منصوبہ بندی پر عمل نہیں کر رہے ہیں جس کی وجہ سے آبادی کا توازن بگڑتا جا رہا ہے، اور پھر خود ہی اس So called مسئلہ کا حل پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اس اقلیتی فرقے کے افراد کو قتل کر کے ان کی تعداد کم کر دینی چاہئے۔ (یہی شعور R S S بھی پھیلاتی ہے۔)

بابری مسجد کی شہادت کے بعد ایک مرتبہ جب میں فیض آباد (جہاں تعینات تھی) سے میرٹھ آ رہا تھا تو ٹرین میں حسب معمول مسافروں میں باہمی گفتگو کے دوران ایک نیم فوجی تنظیم کے ایک جوان نے یہ بتایا کہ اس کی یونٹ آجکل اجودھیا میں تعینات ہے اور وہ چھٹی پر اپنے گھر جا رہا ہے۔ اجودھیا کا نام سن کر چند مسافروں نے اس سے ۶ دسمبر کی روداد سننی چاہی۔ اس نے پورا واقعہ سناتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں یہ انکشاف بھی کیا کہ اس نے بھی اس دن "کارسیوا" میں حصہ لیا تھا۔

مرکزی یا صوبائی نیم فوجی تنظیموں یا پولس کی سطح پر کی جانے والی جانبدارانہ زیادتیوں یا ناانصافیوں کا سدباب اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے مذکورہ فورسیز میں نمائندگی دئیے جانے ہی سے کیا جاسکتا ہے لیکن

مصیبت یہ ہے کہ ماں، جسکی ممتا مثالی مانی گئی ہے، بھی اپنے اس دور میں شیر خوار بچوں کو برغبت و خوشی اپنا دودھ نہیں پلاتی۔

(۱۷) مسٹر ہیمنت کرکرے - وہ ۱۲؍دسمبر ۱۹۵۴ء کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ وہ ۱۹۸۲ء بیچ کے IPS آفیسر تھے۔ IPS جوائن کرنے سے پہلے وہ ایک اشیائے صرف بنانے والی کمپنی [Consumer Goods' Manufacturing Co] میں بھی ملازمت اختیار کر چکے تھے۔ [انھوں نے Management Engineering سے گریجویشن کیا تھا۔] اس کے علاوہ انھوں نے Personality Development کا کورس بھی کیا تھا جہاں ان کی ملاقات کویتا (Kawita) جی سے ہوئی اور پھر یہ ملاقات شادی میں تبدیل ہوگئی۔ کویتا جی سے آپ کے تین بچے ہیں، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ لڑکا ابھی چھوٹا ہے۔ وہ دو سال تک ہندوستانی خفیہ ایجنسی "RAW [Research & Analysis Wing]" میں بھی نہایت خوبی سے خدمات انجام دے چکے تھے اور اب گذشتہ ایک سال سے مہاراشٹر "دہشت گردی مخالف تنظیم" (ATS) کے سربراہ تھے۔ وہ ایک صاف ذہن، انصاف پسند، باصلاحیت اور جری ہونے کے ساتھ ساتھ دہشت گردوں [بلا تمیز مذہب وملت] کے جانی دشمن اور انسانیت کے دوست تھے۔ ۸؍ستمبر ۲۰۰۶ء کو مالیگاؤں میں ہوئے بم دھماکوں کے سلسلے میں وہ جس ایمانداری سے تفتیش کر رہے تھے اس سے بہت سے سفید پوش دہشت گرد بے نقاب ہونے والے تھے اور ملک میں دیگر مقامات پر بھی ہونے والے بم دھماکوں پر سے پردہ اٹھنے والا تھا۔ اس سے دہشت گردوں اور ان کے آقاؤں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ مسلسل انھیں قتل اور گھر کو اڑا دینے کی دھمکیاں مل رہی تھیں لیکن وہ ثابت قدم رہے۔ بالآخر ۲۶؍نومبر ۲۰۰۸ء کو ہوٹل تاج ہوٹل، اوبرائے ہوٹل اور نریمن ہاؤس پر ہوئے دہشت گردانہ حملوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ مذکورہ سفید پوش دہشت گردوں کی قلعی کھولنے کے بعد آپ کا ہندوستان چھوڑ کر کسی دیگر ملک کو ہجرت کر جانے کا ارادہ تھا [آپ ممبئی کے دادر علاقے میں رہتے تھے۔] یہ قابل ذکر ہے کہ اب تک بم دھماکے اور دہشت گردی کی تمام تر ذمہ داریاں مسلمانوں پر ہی ڈالی جاتی رہی تھیں لیکن یہ مسٹر کرکرے ہی تھے جنھوں نے یہ انکشاف کر کے ہندو فسطائی طاقتوں کی نیندیں حرام کر دی

تھیں کہ ان سازشوں میں کچھ ہندو دھرم گرو، سادھو سنیاسی اور فوج کے افسر ملوث ہیں۔ جب گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی جی مذکورہ سانحہ کے بعد ایک کروڑ کی خطیر رقم آپ کی بیوہ کو دینے پہنچے [غالباً کسی اندیشے کے سبب کیوں کہ ہمدردی تو ہو نہیں سکتی جیسا کہ مودی جی اور ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ چند دنوں پہلے تک مسٹر کرکرے کو ہدف تنقید بنائے ہوئے تھے۔] تو انھوں نے ملنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ اس سے لگتا ہے کہ ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔

(۱۸) جب ناصر الدین قباچہ [م ۶۲۲ھ (۱۲۲۵ء)] کے دور اقتدار میں تاتاریوں نے سندھ پر حملہ کر کے ملتان کا محاصرہ کر لیا تو قباچہ آبدیدہ ہو کر اپنے گلے میں تلوار لٹکائے شیخ الاسلام خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی [م ۶۶۶ھ (۱۲۶۷ء)] کی خدمت میں مدد کی درخواست لے کر حاضر ہوا۔ ان دنوں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی [م ۶۳۳ھ (۱۲۳۵ء)] بھی حضرت شیخ الاسلام کے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے حضرت خواجہ کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہماری کیا مجال جو کوئی قدم اٹھائیں۔ حضرت خواجہ نے فوراً قباچہ کے ہمراہ قلعہ کی فصیل پر جا کر تاتاری لشکر کا معائنہ کیا اور پھر وہیں پر متعین ایک سپاہی کے ترکش سے تیر نکال کر قباچہ کو دیتے ہوئے فرمایا کہ لو اسے چلّے میں رکھ کر پوری قوت سے دشمن کی طرف چھوڑ دو۔ قباچہ یہ سن کر خوفزدہ ہوا کیوں کہ اس کے معنی جنگ کے شعلے بھڑکانا تھا۔ جب حضرت خواجہ نے قباچہ کو تذبذب کے عالم میں دیکھا تو فرمایا کہ اگر مدد چاہتے ہو تو جیسا ہم کہیں اس پر عمل کرو۔ قباچہ نے اس بار کوئی کوتاہی نہیں کی اور پوری قوت سے وہ تیر تاتاریوں کے لشکر میں پھینکا۔ تیر ایک منجنیق پر لگا جس سے وہ چکنا چور ہو گئی۔ آس پاس موجود تاتاری خوف وہراس سے ادھر ادھر دیکھنے لگے لیکن ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ابھی وہ سکتے کے عالم میں ہی تھے کہ مغرب کی سمت سے ایک زبردست طوفان اٹھا جس نے تاتاریوں کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ طوفان اس قدر شدید تھا کہ منجنیق کہیں کی کہیں جا پہنچیں، خیمے اکھڑ گئے اور ہر طرف افراتفری کا عالم ہو گیا۔ پھر موسلا دھار بارش بھی شروع ہو گئی۔ الغرض تاتاری بے قابو ہو کر آپس میں ہی دست و گریباں ہونے لگے اور پھر بالآخر انھیں پسپائی پر مجبور ہونا پڑا۔

[۲] تاریخ کے جھروکوں سے

(۱) چند اہم تاریخی واقعات

۳۶۷/۶۸ھ (۹۷۷/۷۸ء) میں والیٔ **لاہور** راجہ جے پال اول [برہمن تھا جس کے جد اد کابل کے حکمراں رہے لیکن وہاں سے نکال دیئے جانے کے بعد **لاہور** کو دار الخلافہ بنا کر حکومت کرنے لگے تھے۔] نے بڑی جنگ سے **لاہور** آکر امیر سبکتگین کے ساتھ وعدہ شکنی کی جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان خوفناک جنگ ہوئی۔ نتیجتاً جے پال کی شکست کے بعد ہندوستان کے ایک بڑے علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔(۱)

۳۶۸ھ (۹۷۸ء) میں جے پال اول کے شکست کے بعد خودسوزی کر لینے پر اس کا بیٹا، آنند پال **لاہور** میں تخت نشیں ہوا۔

۴۰۴ھ (۱۰۱۳ء) میں جے پال ثانی اپنے باپ، آنند پال کی جگہ **لاہور** میں تخت نشیں ہوا۔

۴۱۲ھ (۱۰۲۱ء) میں سلطان محمود غزنوی نے **لاہور** پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لینے کے بعد خود نے تو شہر میں قیام کیا اور اس کے لشکر نے دل کھول کر شہر کو لوٹا۔(۲) راجہ جے پال ثانی کے اجمیر بھاگ جانے پر محمود نے **لاہور** میں اپنا ایک مسلمان صوبے دار مقرر کر دیا اور اس طرح سے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑ گئی۔

۴۱۴ھ (۱۰۲۳ء) میں محمود نے ہندوستان پر گیارہواں حملہ کر کے راجائے کالنجر کو شکست

دہلی اور **لاہور** کو سلطنتِ غزنی میں ملالیا۔

۴۲۹ھ ۹ر رمضان (۱۶؍۱۰۳۷ءرجون) میں طغرل بیگ سلجوقی کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد سلطان مسعوداول بن سلطان محمود غزنوی **لاہور** چلا آیا اور اس کو اپنا پایۂ تخت بنانے کا ارادہ کیا لیکن اس کی فوج نے اس کو قید کرلیا اور اس کے بھائی محمد کو تخت پر بٹھادیا۔ [۴۳۳ھ (۱۰۴۱ء) میں اس کو احمد بن محمد نے قتل کردیا۔]

۴۳۵ھ (۱۰۴۳ء) میں تین بڑے بڑے ایسے ہندوراجاؤں نے جو ماضی میں مسلمان حکمرانوں کے خوف سے جنگل میں جاچھپے تھے، مسلمان حکمرانوں کی باہمی چپقلش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے **لاہور** پر حملہ کرکے اس کا محاصرہ کرلیا۔ (۳)

۴۹۲ھ (۱۰۹۸ء) سے ۵۰۸ھ (۱۱۱۴ء) تک (۱۶ سال تک) سلطان مسعود ثالث (سلطان ابراہیم کا بیٹا اور سلطان سنجر کا داماد) نے غزنی اور **لاہور** پر حکومت کی۔

سلطان بہرام شاہ بن مسعود ثالث [شجرہ ص ۱۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔] کے انتقال کے بعد جب اس کا لڑکا، معزالدولہ خسروشاہ تخت نشین ہوا تو اس زمانے میں علاؤالدین غوری [المشہور بہ جہاں سوز] کے غزنی پر حملے کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔ چنانچہ خسروشاہ نے غزنی میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ معہ اہل وعیال **لاہور** آکر مقیم ہوگیا۔ اس طرح **لاہور سلطنت غزنی کا دارالخلافہ بن گیا۔**

۵۵۵ھ (۱۱۶۰ء) میں ۸ سال حکومت کرنے کے بعد معزالدولہ سلطان خسروشاہ کا **لاہور** میں انتقال ہوگیا۔

سلطان خسروشاہ کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا، تاج الدولہ خسرو ملک **لاہور** میں تخت نشیں ہوا۔

۵۷۶ھ (۱۱۸۰ء) میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے پہلی بار ہندوستان پر حملہ کیا۔

اس نے سندھ اور ملتان کو فتح کر لینے کے بعد **لاہور** کو بھی فتح کر لیا لیکن بعد میں سلطان خسرو ملک کے نوعمر شہزادے، ملک شاہ کو بطور یرغمال لے کر واپس غورستان لوٹ گیا۔ (۴) [ص ۲۱۵ بھی ملاحظہ فرمائیں]

سنہ ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے دوسری بار **لاہور** پر حملہ کیا اور شہر نیز اس کے اطراف کو خوب جی کھول کر لوٹا۔ (۵)

سنہ ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں شہاب الدین محمد غوری نے تیسری بار **لاہور** پر حملہ کیا لیکن اس بار معرکہ آرائی کی بجائے اس نے ایک شاطرانہ چال (۶) چلی اور **لاہور** پر قابض ہو گیا۔ اس بار **لاہور** کے سقوط کے بعد **غزنی کی عظیم الشان حکومت امین الملت یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی کے خاندان سے نکل کر خاندان غوری کے ہاتھ آگئی۔**

۲۷ سال حکومت کرنے کے بعد سلطان خسرو ملک کا **لاہور** میں قتل ہو گیا۔

سنہ ۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء) ۱۸ ذیقعدہ بروز شنبہ قطب الدین ایبک **لاہور** میں تخت نشین ہوا۔ (۷)

سنہ ۶۰۳ھ (۱۲۰۶ء) میں قطب الدین ایبک نے تاج الدین یلدوز (۸) پر حملہ کر کے دوبارہ **لاہور** پر اپنا اقتدار بحال کر لیا۔

سنہ ۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) میں چوگان (پولو) کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر قطب الدین کا **لاہور** میں انتقال ہو گیا۔ اس کا مزار انار کلی بازار کے عقب میں واقع ہے۔

آرام شاہ بن قطب الدین ایبک **لاہور** میں تخت نشیں ہوا۔

سنہ ۶۱۱ھ (۱۲۱۴ء) میں تاج الدین یلدوز خوارزم شاہیوں سے بھاگ کر ہندوستان آیا اور اس نے **لاہور** پر قبضہ کر لیا۔ التمش نے تراوڑی (ترائن) کے میدان میں اس کو

شکست دے کر بدایوں میں قید کر دیا جہاں وہ مر گیا۔

۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں شمس الدین التمش اور ناصر الدین قباچہ کے درمیان **لاهور** کو لے کر نوبت معرکہ آرائی تک پہنچی۔ دونوں ہم زلف کے درمیان دریائے چناب کے کنارے جنگ ہوئی۔ قباچہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور **لاهور** پر التمش کا قبضہ ہو گیا۔

۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) میں جلال الدین خوارزمی نے چنگیز خاں کے ڈر سے بھاگ کر پنجاب میں پناہ لی اور **لاهور** میں قیام کرنے کے لئے سلطان التمش سے اجازت چاہی جس نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ یہاں کی آب و ہوا اس (جلال الدین) کو موافق نہیں آئے گی۔

۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) [سلطان معز الدین بہرام شاہ کے عہد حکومت میں] میں ۷ار جمادی الآخر کو چنگیز خانی مغلوں نے **لاهور** پر حملہ کر کے اسے دل کھول کر لوٹا اور بہت سے اہلیانِ شہر کو قید کر کے لے گئے۔(۹)

۶۸۳ھ (۱۲۸۴ء) میں چنگیزی مغلوں نے تیمور چنگیزی کی قیادت میں بیس ہزار سواروں کی جمعیت سے پنجاب پر حملہ کیا اور دیپالپور و **لاهور** کے تمام دیہاتوں کو تباہ کر کے **لاهور** کا محاصرہ کر لیا۔ صوبیدار **لاهور** نے شہزادہ سلطان محمد یا محمد خان سلطان (المعروف بہ خانِ ملتان) کو لکھا۔ محمد نے **لاهور** پر چڑھائی کر دی جس سے مغلوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ محمد نے ان کا پیچھا کیا لیکن ملتان کے قریب ۳۰رذی الحجہ ۶۸۳ھ (۹ر مارچ ۱۲۸۴ء) بروز جمعہ بدقسمتی سے شہزادے کے سینے میں ایک تیر لگنے سے وہ شہید ہو گیا۔ اس کے ساتھ دیگر تمیں بہادر اور تجربہ کار جوان بھی شہید ہوئے۔ اس معرکہ میں امیر خسرو بھی قید کر لئے گئے تھے جو بعد میں رہا ہو پائے۔ اسی وقت سے "خانِ ملتان" کو "خانِ شہید" کے نام

سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ بلبن کا سب سے بڑا لڑکا، ولی عہد سلطنت، بہادر و نیک بخت شہزادہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی یاد میں بلبن راتوں کو اٹھ اٹھ کر اکثر رویا کرتا تھا۔

۶۹۸ھ (۱۲۹۸ء) میں ماوراء النہر سے ایک لاکھ مغل داؤد خاں کی سرکردگی میں ہند پر حملہ آور ہوئے۔ دہلی سے الغ خاں اور ظفر خاں کو مقابلے کے لئے روانہ کیا گیا۔ **لاہور** کے قریب زبردست لڑائی ہوئی۔ بارہ ہزار مغل مارے گئے، بہت سے گرفتار ہوئے اور باقی ماندہ بھاگ گئے۔

۷۲۹ھ (۲۹۔۱۳۲۸ء) میں منگول سردار ترمشیرین خاں نے ہندوستان پر حملہ کر کے ملتان اور **لاہور** سے دلی تک کا پورا علاقہ روند ڈالا لیکن بعد میں واپس لوٹ گیا۔

۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں ہندوستان سے لوٹتے وقت امیر تیمور نے پنجاب میں سیپہ گکھر جس نے سلطان غیاث الدین کے عہد حکومت سے پنجاب میں بغاوت کر رکھی تھی، کو قتل کر کے **لاہور** و دیپالپور کی حکومت خضر خاں کو سپرد کر دی اور خود ماوراء میں دریائے سندھ کے اس پار چلا گیا۔

۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) سے ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) کے عرصے میں [معز الدین ابوالفتح مبارک شاہ بن خضر خاں] پنجاب میں سیپہ گکھر کے بھائی، جسرت گکھر نے فتنہ برپا کر کے **لاہور** اور دیپالپور کو لوٹ لیا اور ان پر قابض ہو گیا۔

۸۳۳ھ (۱۴۲۹ء) میں والی کابل، امیر شیخ علی مغل نے شاہ رخ بن امیر تیمور کے حکم سے ہندوستان پر حملہ کیا مگر عماد الملک، صوبہ دار ملتان نے اسے شکست دے کر بھگا دیا، لیکن شیخ علی نے **لاہور** پر قبضہ کر لیا اور دو ہزار محافظ **لاہور** میں چھوڑ کر خود کابل واپس لوٹ گیا۔ سلطان مبارک شاہ نے شمس الملک کو **لاہور** روانہ کیا جس نے مغلوں سے **لاہور** کا قبضہ واپس لے لیا۔

۹۳۱ھ (۱۵۲۴ء) میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کر کے **لاہور** پر قبضہ کر لیا۔ (۱۰)

۹۳۷ھ (۱۵۳۰ء) میں جب ہمایوں تخت نشین ہوا تو اس نے پنجاب کی حکومت اپنے بھائی کامران کو دے دی۔ لنگر خاں بلوچ جو حسین ثانی لنگاہ کا مدار المہام تھا، کامران سے **لاہور** میں آ کر ملا۔ کامران نے اسے **لاہور** کے قریب ایک علاقہ دے کر ملتان کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں ہمایوں نے قنوج کے قریب شیر شاہ سوری کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور دلی چھوڑ کر اپنے بھائی کامران کے پاس **لاہور** چلا گیا۔ وہاں وہ تین ماہ تک رہا لیکن جب خواص خاں اس کا پیچھا کرتا ہوا اس شہر میں وہاں پہنچا تو وہ بھی وہاں سے براستہ سندھ کابل چلا گیا۔ اس کے بعد شیر شاہ سوری بھی **لاہور** پہنچے۔

۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) ۲۴ فروری کو ہمایوں نے دوبارہ **لاہور** پر قبضہ کر لیا۔ [ان دنوں سکندر شاہ سور (اصل نام احمد خاں سوری جو مبارز خاں الملقب بہ محمد عادل شاہ سور کا بہنوئی اور شیر شاہ سوری کا بھتیجا داماد تھا۔) اپنے سالے، محمد عادل شاہ سور کو شکست دے کر حکومت کرتا تھا۔ اس کی طرف سے تاتار خاں **لاہور** کا نگراں تھا۔ ہمایوں کی آمد کی خبر سن کر تاتار خاں دلی بھاگ گیا جس سے بنا کسی مزاحمت کے ہمایوں نے **لاہور** پر قبضہ کر لیا۔]

۹۷۴ھ (۱۵۶۶ء) میں حکیم مرزا نے یلغار کر کے **لاہور** پر قبضہ کر لیا لیکن جب ۱۴ر جمادی الاول کو اکبر **لاہور** کے لئے روانہ ہوا تو وہ لاہور سے فرار ہو کر کابل چلا گیا۔

۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) ۱۱ر محرم الحرام کو مرزا محمد حکیم نے دوبارہ **لاہور** پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ سعید خاں، راجہ بھگونت داس اور راجہ مان سنگھ قلعہ بند ہو گئے۔ مرزا نے جب پھر سے اکبر کی آمد کی خبر سنی تو وہ پھر فرار ہو کر کابل بھاگ گیا۔

۹۹۵ھ (۱۵۸۶ء) ماہ اگست میں جہانگیر کا سب سے بڑا لڑکا، خسرو [ماں کا خطاب شاہ بیگم تھا جو راجہ مان سنگھ پسر راجہ بھگوان داس کی دختر تھی۔] **لاہور** میں پیدا ہوا۔

۹۹۹ھ ۲۳ ربیع الاول [۵ جنوری ۱۵۹۰ء] نصف شب جمعرات کو رانی جگت گوسائیں بنت راجہ اودے سنگھ کے بطن سے شہزادہ خرم (شاہجہاں) **لاہور** میں پیدا ہوا۔

۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) میں جہانگیر کی ملکہ اور زین خاں کوکہ کی ایک رشتہ دار، صاحب جمال کا **لاہور** میں انتقال ہوا۔ سلطان پرویز اسی کے بطن سے تھا۔

۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں شہزادہ خسرو فرار ہو کر بغاوت پر کمر بستہ ہوا۔ شیخ فرید مرتضیٰ خاں کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا گیا۔ **لاہور** کے قریب دونوں کے درمیان جھڑپ ہوئی اور شہزادہ گرفتار کر لیا گیا۔ جہانگیر نے اس کے ۷۰۰ آدمیوں کی کھال کھنچوا کر **لاہور** کے باہر کھڑا کروا دیا اور خسرو کو بھی ہاتھی پر سوار کر کے انھیں دیکھنے کے لئے بھیجا اور نقیب کو حکم دیا کہ موافق دستور کے ہر ایک مصاحب کا نام لے کر نگاہ روبرو پکارتا جائے۔ خسرو نے اس غم میں تین دن تک کچھ نہیں کھایا اور زار و قطار روتا رہا۔ ایک دوسری روایت کی رو سے شہزادہ اور اس کا رفیق کار عبدالرحیم [ایک جہانگیری امیر] پکڑ کر **لاہور** میں جہانگیر کے حضور میں پیش کئے گئے۔ عبدالرحیم کو گدھے کی کھال میں سی کر اس پر پانی ٹپکایا گیا۔ چوبیس گھنٹے کے بعد عفو قصور ہوا۔

۱۰۳۷ھ (۲۸ اکتوبر ۱۶۲۸ء) ۲۷ صفر المظفر کو کشمیر سے **لاہور** آتے ہوئے دمہ کی بیماری سے شہنشاہ نورالدین جہانگیر کا انتقال ہو گیا۔ **لاہور** میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جہانگیر کے انتقال کے فوراً بعد ہی شہزادہ شہریار نے **لاہور** میں بادشاہت کا اعلان کر دیا اور **لاہور** کے شاہی خزانے کو امراء و سپاہیوں میں تقسیم کر کے انھیں اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی۔ آصف خاں نے **لاہور** پر حملہ کر کے

شہریار اور داور بخش عرف بلاقی سلطان خسرو کو قید کر کے قتل کر دیا۔ شہزادہ شہریار اپنے جسم کی خوبصورتی اور دماغی کمزوری کے لئے مشہور تھا۔

۲۲ جمادی الاول کو شہاب الدین محمد شاہجہان (خرم) **لاہور** میں تخت نشین ہوا۔(۱۱)

۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں ملکہ نور جہاں کا **لاہور** میں ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس کے مقبرہ میں ایک دوسری قبر اس کی بیٹی لاڈلی بیگم کی ہے۔

۱۰۶۸ھ (۱۶۵۸ء) میں جب شاہجہان بیمار ہوا اور امید زیست کی منقطع ہوئی تو شجاع بنگالے سے، مراد گجرات سے اور اورنگ زیب دکن سے اپنی اپنی فوجیں آراستہ کر کے دارالسلطنت دلی پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ شجاع تو دارا شکوہ کے بیٹے، سلیمان شکوہ سے بنارس کے قریب شکست کھا کر بنگالے لوٹ گیا، لیکن مراد اور اورنگ زیب متفق ہو کر اور دارا شکوہ کے بھیجے ہوئے راجا جسونت سنگھ کو اجین کے قریب شکست دے کر آگرہ کے قریب تقریباً ۲۵ کلومیٹر تک آ داخل ہوئے۔ دارا شکوہ ایک لاکھ سوار لے کر مقابلے کو پہنچا لیکن شکست کھائی اور **لاہور** کی طرف بھاگ گیا۔

۱۰۶۹ھ (۱۶۵۹ء) اپریل میں جب دارا شکوہ (۱۶۵۹ء، ۳۰ اگست) جے سنگھ اور بہادر خاں کے زیر کمان شاہی لشکر سے جنگ اجمیر کے قریب ہار گیا تو وہ دادر کے افغان میر، جیون خاں سے مدد کے لئے بھاگ نکلا۔ راستے میں ہی (مئی میں) اس کی اہلیہ، نادرہ بیگم جو جہانگیر کے فرزند، پرویز کی بیٹی تھی [وہ ۲۳ جنوری ۱۶۲۲ء کو پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بطن سے دو شہزادے، سلیمان شکوہ اور سپہر شکوہ پیدا ہوئے تھے۔] کا انتقال ہو گیا۔ **لاہور** میں میاں میر کی درگاہ میں اس کا مقبرہ واقع ہے۔

۱۱۱۳ھ (۱۷۰۲ء) میں شہزادی زیب النساء بیگم بنت اورنگ زیب کا انتقال **لاہور** میں ہوا۔ وہ ایک عالمہ خاتون اور قرآن شریف کی حافظہ تھی۔ اس کو عربی اور فارسی پر پورا عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ اس کو خطاطی کا بہت شوق تھا۔ اس کا اپنا ایک عمدہ کتب خانہ بھی تھا۔ [وہ ۱۰ شوال المکرم ۱۰۴۸ھ (۵ فروری ۱۶۳۹ء) کو پیدا ہوئی تھی۔]

۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) غرہ ذی الحجہ کو محمد معظم الملقب بہ شاہ عالم بہادر شاہ (اول) **لاہور** میں تخت نشین ہوا۔

۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱ء) میں بہادر شاہ نے خطبۂ جمعہ سے متعلق جو فرمان جاری کیا تھا اس کی مخالفت میں **لاہور** میں زبردست احتجاج و ہنگامہ ہوا۔ (کہتے ہیں کہ یہ ہنگامہ شہزادہ عظیم شان کے اشارے پر ہوا تھا۔) ہنگامے کی وجہ سے بادشاہ کو یہ فرمان واپس لینے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ [تفصیل حضرت کی کتاب "سید عبدالرحمن بن فضل اللہ" میں ملاحظہ فرمائیں۔]

۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) ۲۱ محرم الحرام کو ۷۱ سال کی عمر میں بہادر شاہ کا **لاہور** میں انتقال ہوگیا۔

۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں معزالدین جہاندار شاہ (بن شاہ عالم اول) اور فرخ سیر (بن عظیم الشان) کے درمیان آگرہ کے قریب جنگ ہوئی جس میں جہاندار شاہ ہزیمت اٹھانے کے بعد فرار ہوگیا لیکن بعد میں پکڑ کر قتل کر دیا گیا اور اس کی معشوقہ لعل کنور المخاطب بہ امتیاز محل جو ایک رقاصہ تھی اور جس کی وجہ سے اس کے رشتہ دار دربارِ شاہی میں رسائی پا گئے تھے نیز جس کے بغیر جہاندار شاہ ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا، فرار ہوکر **لاہور** چلی گئی تھی۔

تخت نشینی کو لے کر ۲۷ مارچ کو شہزادہ جہان شاہ اور شہزادہ جہاندار شاہ (محمد

معز الدین) کے درمیان **لاهور** میں میاں میر کے مزار شریف کے نزدیک معرکہ آرائی ہوئی۔ اس لڑائی میں جہاں شاہ اور اس کا فرزند، فرخندہ اختر مارے گئے۔

۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں فارس کے حکمراں نادر شاہ (۱۲) نے ہندوستان پر حملہ کرکے **لاهور** پر قبضہ کرلیا۔ (۱۳)

۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) میں بندہ، جو گرو گوبند سنگھ کا جانشین تھا اور جس نے بہادر شاہ کے عہد میں اس وقت جب بادشاہ اپنے بھائی، کام بخش کا دکن میں مقابلہ کررہا تھا، نے صوبہ **لاهور** میں سخت غارتگری پھیلاتے ہوئے مسلمانوں پر نہایت بیدردی سے مظالم کئے تھے، کو دہلی میں ہلاک کردیا گیا۔

۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) میں احمد شاہ ابدالی (۱۴) نے دوسری بار پنجاب پر حملہ کرکے **لاهور** کے صوبیدار معین الملک [بن اعتمادالدولہ قمرالدین خاں وزیر جو سرہند کے مقام پر احمد شاہ ابدالی سے ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔] کو شکست دے دی۔ معین الملک نے مغل بادشاہ، احمد شاہ کے مشورے اور حکم پر **لاهور** کے چار محال (سیالکوٹ، ایمان آباد، پسرور اور اورنگ آباد) ابدالی کو دے دیئے۔ ابدالی مطمئن ہوکر واپس لوٹ گیا۔

۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱ء) میں احمد شاہ ابدالی نے معین الملک کے اپنے وعدے سے پھر جانے پر تیسری بار پھر سے پنجاب پر حملہ کردیا۔ معین الملک کو شکست ہوئی۔ اس بار معین الملک نے مغل بادشاہ کے رویہ سے مایوس ہوکر ابدالی کی اطاعت قبول کرلی۔ مغل بادشاہ نے جاوید خاں (م ۱۷۵۲ء) کے مشورہ پر پنجاب اور ملتان کے صوبے ابدالی کو دے دیئے۔ ابدالی، معین الملک کو اپنی طرف سے **لاهور** کا صوبیدار مقرر کرکے واپس چلا گیا۔

۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء) میں احمد شاہ نے چوتھی بار پھر سے ہندوستان پر حملہ کردیا اور وہ

۲۳ر جنوری ۱۷۵۷ء کو دلی تک جا پہنچا۔ [نومبر ۱۷۵۳ء میں معین الملک اور ۱۷۵۴ء میں اس کے صغر سن فرزند، میر مومن (معین الملک کے انتقال کے بعد احمد شاہ نے میر مومن کو صوبیدار اور اس کی ماں کو مہمات ملکی پر مقرر کر دیا تھا۔) کے انتقال کے بعد وزیر سلطنت دلی، عماد الملک غازی الدین فیروز جنگ، وزیر و مدار المہام سلطنت عالمگیر ثانی، نے ۱۷۵۶ء میں حملہ کر کے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور **لاھور** کے ایک با اثر امیر، میر منعم کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔] اس نے پنجاب، کشمیر، سندھ اور سرہند وغیرہ علاقوں پر قبضہ کر لیا اور اپنے فرزند، تیمور شاہ کو **لاھور** کا صوبیدار، اور افغان سپہ سالار، جہان خاں کو اس کا وزیر مقرر کر کے اپریل ۱۷۵۷ء میں وطن واپس لوٹ گیا۔

۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء) اپریل میں رگھوناتھ راؤ اور ملہار راؤ (مراٹھہ) نے **لاھور** پر حملہ کر کے تیمور شاہ اور جہان خاں کو وہاں سے بھگا دیا نیز ۷۵ لاکھ روپیہ سالانہ مراٹھوں کو دینے کے عوض جالندھر دوآبہ کے حاکم، آدینہ بیگ خاں (م ۱۷۵۸/۱۰/۱۵۳ اکتوبر ۱۷۵۸ء) کو **لاھور** کا صوبیدار مقرر کر دیا۔

۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) اکتوبر میں مذکورہ بالا واقعہ کی وجہ سے ابدالی دریائے سندھ کو عبور کر کے سیدھا **لاھور** آیا اور اس نے پانچویں بار پھر سے حملہ کر کے پنجاب پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

۱۱۷۴ھ (۱۷۶۰ء) میں **لاھور** سے تقریباً بارہ کلومیٹر فاصلے پر واقع موضع لہو کے جسا سنگھ نے **لاھور** کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ کا لقب اختیار کرتے ہوئے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا۔

۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں ابدالی پھر سے حملہ آور ہوا اور سکھوں کو شکست دے کر ۱۲ر دسمبر ۱۷۶۲ء کو واپس لوٹ گیا۔ پھر اس کو ہندوستان کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی

جس سے وہ **لاہور** کا پوری طرح انتظام اور سکھوں کا استیصال پورا پورا نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے بعد **لاہور**، ملتان اور سندھ کی حکومت اس کے جانشینوں کے قبضے سے جاتی رہی اور پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) فروری میں سکھوں نے پھر سے **لاہور** پر قبضہ کرلیا۔

۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) میں والیٔ کابل سلطان زمان شاہ (۱۵) (شجرہ ۱۶۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔) (ابن تیمور شاہ بن احمد شاہ درانی) نے حملہ کرکے **لاہور** پر قبضہ کرلیا اور ایک انیس سالہ سکھ نوجوان رنجیت سنگھ کو راجہ کے خطاب سے نوازتے ہوئے اس کو **لاہور** کا صوبیدار مقرر کردیا۔

۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) میں والیٔ کابل، شاہ شجاع (احمد شاہ ابدالی کا پوتا) کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر سے پنجاب بلا کر **لاہور** میں قید کرلیا اور اس سے شاہجہاں کا مشہور زمانہ ہیرا "کوہ نور" حاصل کرلیا۔ [۱۸۱۲ء میں اس کے بھائی نے اسے قید کرکے کشمیر بھیج دیا تھا۔]

۱۲۳۱ھ (۱۸۱۵ء) اپریل میں شاہ شجاع **لاہور** سے بھاگ کر برٹش ("ایسٹ انڈیا کمپنی") کے زیر انتظام صوبہ لدھیانہ چلا گیا۔ [انگریزوں نے موقع پا کر ۸؍مئی ۱۸۳۹ء کو اسے پھر سے کابل کے تخت پر بٹھادیا تھا۔ اس کے بعد ۲؍مئی ۱۸۴۲ء کو اسکے بھتیجے نے اسے قتل کردیا۔]

۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں سید احمد بریلوی (۱۶) نے لاہور کے راجہ بدھ سنگھ کے پاس ایک تحریری اعلام نامہ حسب قاعدہ شرعی بھیج کر یہ مانگ کی کہ یا تو وہ اسلام قبول کرلے یا پھر مطیع ہوکر جزیہ دے نہیں تو جنگ کے لئے تیار ہوجائے۔ بالآخر جنگ ہوئی جس میں سکھوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

۱۲۶۳ھ (۱۸۴۶ء) ۱۰/۱۳؍فروری کو برٹش ("ایسٹ انڈیا کمپنی") کی فوج نے لاہور پر

حملہ کیا اور سکھوں کو شکست دے کر ۲۰ رفروری کو شہر میں داخل ہو گئی۔

۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں دیوان مولراج، ناظم ملتان نے **لاھور** میں آکر اپنی نظامت کا استعفیٰ برٹش حکام کے سامنے پیش کر دیا۔ صاحب "قوموں کی مشاہیر" کے بقول اس کو برطانیہ بھیج دیا گیا تھا جہاں اس نے عیسائی مذہب اختیار کرتے ہوئے ایک مصری عیسائی عورت سے شادی کر لی تھی اور پھر ۱۸۹۱ء میں فوت ہو گیا۔

۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں برٹش فوج ملتان میں داخل ہوگئی اور قریب تھا کہ قلعہ پر حملہ ہو کہ مولراج نے خود معہ اپنی سپاہ کے قلعہ چھوڑ کر گورنر جنرل کی خدمت میں چلا گیا۔ گورنر جنرل نے اس کو قید کر کے لاہور روانہ کر دیا اور ۲۹ مارچ کو صوبہ پنجاب ضبط کر کے اور راجہ دلیپ سنگھ کو پنشن دے کر فتح گڑھ میں رہنے کے لئے بھیج دیا۔

۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء، ۱۵ اپریل) کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آخری زوجہ جھوری دیوی (۱۷) فوت ہوئی۔

۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) کے انڈین ہائی کورٹ قانون کے تحت **لاھور** ہائی کورٹ قائم ہوا۔ (۱۸)

۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں علامہ اقبال کی زیر صدارت **لاھور** میں "آل انڈیا مسلم کانفرنس" کا اجلاس ہوا۔

۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء) کے عام انتخابات میں پنجاب میں "Unionist" پارٹی برسر اقتدار آئی اور "کانگریس" کی مدد سے خضر حیات خاں وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔

۱۳۵۹ھ (۱۹۴۰ء) مارچ میں "مسلم لیگ" کے **لاھور** اجلاس میں بابائے پاکستانی قوم، قائد اعظم محمد علی جناح نے ایک علیحدہ آزاد مسلم مملکت کی مانگ کی۔ اسی سال،

اس سے پہلے کہ اجلاس میں وہ ''دو قومی نظریہ'' (Two Nation Theory) کا اعلان کر ہی چکے تھے۔ [یہ قابلِ ذکر ہے کہ اپریل ۱۹۲۵ء سے کچھ ہی پہلے لالہ لاجپت رائے بھی ہندوستان کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں مسلم صوبوں کی تجویز رکھ چکے تھے۔] (۱۹)

"Limited Civil Disobediance Movement" کے دوران **لاھــور** سے مولانا ابوالکلام آزاد کو گرفتار کر کے دو سال کی سزا سنائی گئی اور پھر نینی جیل بھیج دیا گیا۔ (۲۰) اس وقت مولانا آزاد ''آل انڈیا کانگریس'' کے صدر تھے۔

۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) ۲/مارچ کو وزیر اعلیٰ پنجاب خضر حیات خاں نے استعفیٰ دے دیا۔ ۴/مارچ کو شہر میں ''مسلم لیگ'' مخالف فسادات ہوئے جس میں ۱۳ آدمی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ [پہلے نواکھالی اور بہار میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ اس کے بعد کلکتہ، بمبئی، گڑھ مکتیسر (پہلے ضلع میرٹھ اور اب ضلع غازی آباد)، **لاھور**، امرتسر، ٹیکسلا اور راولپنڈی وغیرہ میں فسادات ہوئے۔]

۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) ۱۴/اگست کو مملکتِ پاکستان کے عالمِ وجود میں آجانے کے بعد سے **لاھور** پورے پنجاب (غیر منقسم) کی بجائے نوتشکیل شدہ (منقسم مشرقی پنجاب) پنجاب کا دارالخلافہ بن گیا۔

۱۳۸۵ھ (۱۹۶۵ء) میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ہندوستان کی فوجیں **لاھور** کے محاذ پر پیش قدمی کرتے ہوئے بین الاقوامی سرحد کو عبور کر کے اچھوگل کینال تک پہنچ گئیں جہاں سے **لاھــور** بالکل قریب اور ہندوستان کی توپوں کی زد میں تھا۔ (تفصیل ص ۱۱۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

۱۴۱۷ھ (۱۹۹۶ء) میں **لاھور** میں دوسری ''اسلامک کانفرنس'' کا انعقاد ہوا۔

International Cricket Council (I C C) کی طرف سے "قذافی اسٹیڈیم" **لاهور** میں "عالمی کرکٹ کپ" کا فائنل میچ کھیلا گیا۔

۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹ء) فروری میں ہندوستان کے وزیر اعظم، جناب اٹل بہاری واجپئی نے پاکستان کا دورہ کیا اور **لاهور** میں ''مینارِ پاکستان'' پر جا کر وہاں رکھے رجسٹر میں اپنے تاثرات درج کیے۔ کسی ہندوستانی وزیر اعظم کا ''مینارِ پاکستان'' پر جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔

۱۴۳۰ھ (۲۰۰۹ء) میں "قذافی اسٹیڈیم" جاتے ہوئے **لاهور** میں سری لنکائی کرکٹ ٹیم پر نامعلوم مسلح دہشت گردوں نے قاتلانہ حملہ کیا۔ (۳۱)

حواشی

(۱) ۳۶۷ھ (۹۷۷ء) کے اواخر میں امیر سبکتگین نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ ان دنوں راجہ اسچپال کا بیٹا، راجہ جے پال سرہند سے لمغان [افغانستان کے مشرقی اضلاع جو موجودہ پاکستان میں پشاور کے قریب تک پھیلے ہوئے ہیں، اکا نام لمغان تھا۔] اور کشمیر سے ملتان تک کے علاقے پر حکومت کرتا تھا۔ ملتان کی سرحد پر دونوں لشکروں کے درمیان آمنا سامنا ہوا اور کئی روز تک لڑائی چلتی رہی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو جے پال نے صلح کی درخواست کی۔ آخر کار اس شرط پر صلح ہوگئی کہ راجہ جے پال ایک لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی بطور نذرانہ پیش کرے گا۔ راجہ اپنی حکومت کے ایک معتبر رکن دوست کو اس نذرانے کے عوض گروی رکھ کر اور مسلمانوں کی ایک جماعت کو اپنے ہمراہ لے کر لاہور چلا گیا تاکہ حسب وعدہ وہ ہاتھی اور رقم ان کے حوالے کر سکے۔ لاہور پہنچ کر راجہ اپنے وعدہ سے پھر گیا اور اس نے ان مسلمانوں کو گرفتار کر کے سبکتگین سے یہ مانگ کی کہ وہ ان کے سردار کو رہا کر دے۔ اس کے درباریوں نے اسے ہر چند سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کرے لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ جب سبکتگین کو علم ہوا تو وہ غصے سے تلملا اٹھا اور ایک لشکر جرار کے ساتھ راجہ پر حملہ آور ہوا۔ ہر چند کہ دہلی، کالنجر، قنوج اور اجمیر کے راجاؤں نے جے پال کی ہر طرح سے مدد کی لیکن انھیں

شکست فاش ہوئی اور لمغان و پشاور کے ملک دریائے سندھ کے کنارے تک مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ [''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اوّل، ص ۹۰ تا ۹۲]

(۲) ۴۱۲ھ (۱۰۲۱ء) میں محمود نے اپنی عنانِ فتح کو کشمیر کی طرف موڑا اور نواحِ کشمیر میں پہنچ کر ''لوہ کوٹ'' کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا اور محمود اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود جب اس کو فتح نہ کر سکا تو وہ لاہور کی سمت چل پڑا۔ ان دنوں راجہ انند پال [۱۰۰۱ء میں اپنے باپ جے پال اوّل کا جانشین مقرر ہوا تھا۔] کا بیٹا جے پال ثانی لاہور کا راجہ تھا جو کافی بزدل ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر اجمیر بھاگ گیا۔

[''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اوّل، ص ۱۲۷]

(۳) امیر مودود (۴۳۲ھ تا ۴۴۱ھ بمطابق ۱۰۴۰ء تا ۱۰۴۹ء) بن سلطان مسعود بن سلطان محمود کے دورِ حکومت [۴۳۲ھ تا ۴۴۱ھ] میں جب پنجاب میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں اور مسلمان جاگیردار اور امراء مودود کی اطاعت سے منہ موڑ کر آپس میں دست و گریباں تھے تو ان میں سے بڑے بڑے ہندو راجاؤں نے جو ڈر کر جنگل میں جا چھپے تھے، باہمی اتفاق سے دس ہزار سوار اور بے شمار پیادوں کے ساتھ لاہور پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس سے مسلمان امراء کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر ایک متحدہ لشکر تیار کیا اور امیر مودود کی اطاعت کا اقرار کر کے حملہ آور فوج سے مقابلے کے لیے شہر سے باہر آ گئے۔ جب غنیم نے ان کا یہ اتحاد دیکھا اور ان کے لشکر کی کثرت کا اندازہ کیا تو وہ بغیر جنگ کیے بدحواسی کے عالم میں میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔

[''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اوّل، ص ۱۷۰]

(۴) سلطان خسرو شاہ کی ۵۵۵ھ (۱۱۶۰ء) میں وفات کے بعد اس کا لڑکا خسرو ملک تخت نشین ہوا۔ اس نے لاہور کو اپنا دار السلطنت بنایا اور بڑے عدل و انصاف سے حکومت کی۔ جب شہاب الدین نے لاہور پر حملہ کیا تو وہ قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔

[''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اوّل، ص ۲۰۳]

(۵) اس بار بھی خسرو ملک قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ غوری سیالکوٹ کا قلعہ تعمیر کر کے اور وہاں کی حکومت اپنے ایک امیر کے سپرد کر کے پھر سے غورستان واپس چلا گیا۔

["تاریخ فرشتہ" (اردو ترجمہ) جلد اول ص ۲۰۳]

(۶) اس مرتبہ شہاب الدین نے خسرو ملک سے بظاہر دشمنی ترک کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے خسرو ملک کے گرفتار شدہ شہزادہ کو آزاد کر دیا اور اپنے چند امرا کو شاہی اعزازات کے ساتھ شہزادہ کو باپ سے ملنے کے لئے روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی امرا کو خفیہ طریقے سے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ راستے بھر شہزادہ کو اتنی شراب پلاتے جائیں کہ وہ معمول سے زیادہ تاخیر باپ تک پہنچنے میں کرے۔ ادھر خسرو شاہ فرزند کی رہائی کی خبر سن کر بے انتہا خوش ہوا اور بے خوف ہو کر آرام سے دن گزارنے لگا۔ ادھر شہاب الدین ایک دوسرے راستے سے برق رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کر کے اچانک لاہور کے پاس دریائے راوی پر خیمہ زن ہو گیا۔ یہ دیکھ کر خسرو ملک نے مجبوراً غوری سے امان طلب کر لی اور لاہور پر بنا کسی معرکہ آرائی کے شہاب الدین کا قبضہ ہو گیا۔

["تاریخ فرشتہ" (اردو ترجمہ) جلد اول ص ۲۰۳، ۲۰۴]

(۷) شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کے بعد اس کا بھتیجا محمود بن غیاث الدین غورستان کا حکمران ہوا۔ اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی قطب الدین ایبک کے لئے آزادی و خود مختاری کا فرمان، چتر اور بادشاہی کے دیگر لوازمات کے ساتھ ہندوستان بھجوایا۔ قطب الدین اس فرمان اور خلعت کا استقبال کرنے کے لئے لاہور تک آیا اور ۱۸ ذیقعدہ ۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء) کو لاہور ہی میں تخت نشینی کی رسومات ادا کر کے واپس دلی لوٹ گیا۔ اس کے پنجاب سے چلے جانے پر یلدوز نے غزنی سے آ کر لاہور پر حملہ کر دیا، اور اس طرح ۶۰۳ھ (۱۲۰۶ء) میں شہاب الدین کے پروردہ، پرداختہ یہ دونوں فرد ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہوئے۔ یلدوز شکست کھا کر توران و کرمان کے راستے پہاڑی علاقے میں جا چھپا۔ اس طرح پھر سے لاہور پر قطب الدین کا قبضہ ہو گیا۔

["تاریخ فرشتہ" (اردو ترجمہ) جلد اول ص ۲۳۹۔۲۴۰]

(۸) **تاج الدین یلدوز** = بچپن میں اس کو شہاب الدین نے ایک سوداگر سے خریدا تھا۔ اس کی صورت و سیرت کی پاکیزگی اور حسن نے شہاب الدین کو اس کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ جب وہ جوان ہوا تو سلطان نے اس کو اپنے گرامی قدر امیروں کی جماعت میں شامل کر لیا

اور شیوران اور مکران کے علاقے اس کی جاگیر میں مقرر کر دیئے۔ اس کے دو بیٹیاں تھیں۔ سلطان شہاب الدین کے حکم سے اس نے ایک بیٹی کی شادی قطب الدین ایبک سے اور دوسری کی شادی ناصر الدین قبچہ سے کردی تھی۔

(۹) جب چنگیزی مغلوں نے شہر پر حملہ کیا تو وہاں کا حاکم، ملک قراقش اپنی فوج میں نااتفاقی دیکھ کر آتی فرار ہو گیا۔ معز الدین بہرام شاہ کو جب حالات کا علم ہوا تو اس نے شاہی محل میں امراء کو جمع کر کے اپنی اطاعت کا اقرار لیا اور پھر نظام الملک اور قطب الدین حسن غوری وکیل السلطنت کو ایک لشکر کے ساتھ مغلوں سے مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ جب لشکر دریائے بیاس (پرانا نام بیاہ) کے کنارے پہنچا تو نظام الملک جو پہلے ہی سے بادشاہ سے ناراض تھا، نے ایک شاطرانہ چال چلی جو ۸/ذیقعدہ ۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) کو بادشاہ کی گرفتاری کا ایک پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

[''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اول، ص ۲۶۵]

(۱۰) بابر کافی عرصے سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی تمنا رکھتا تھا کہ دو اہم غیر مطمئن امراء نے اس کو حملہ کرنے کی دعوت دے ڈالی۔ یہ امراء تھے، دولت خاں اور عالم خاں۔ دولت خاں پنجاب کا سب سے زیادہ طاقتور امیر تھا۔ اس کے لڑکے، دلاور خاں کے ساتھ بادشاہ، ابراہیم لودی سختی سے پیش آچکا تھا۔ اور عالم خاں، بادشاہ کا چچا تھا جو دلی کی گدی پر اپنا حق جتاتا تھا۔ بابر نے فوراً دعوت نامے کا مثبت جواب دیتے ہوئے ۱۵۲۴ء میں چوتھی بار [پہلا حملہ ۱۵۱۹ء کے اوائل میں، دوسرا حملہ ستمبر ۱۵۱۹ء میں اور تیسرا حملہ ۱۵۲۰ء میں] ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب میں گھس کر لاہور پر قبضہ کر لیا۔

[''بھارت کا برہت اتیہاس'' (ہندی) جلد دوم، ص ۱۲۹، ''مغل کالین بھارت'' (ہندی) ص ۷، ۸]

(۱۱) ۱۰۳۶ھ (۱۶۲۶ء) میں جب جہانگیر کا انتقال ہوا تو اس کے دو شہزادے، شہاب الدین اور شہریار بقید حیات تھے۔ [خسرو کا ۱۶۲۲ء اور پرویز کا ۱۶۲۶ء میں پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔] شہاب الدین کی شادی ۱۶۱۲ء میں ارجمند بانو الملقب بہ ممتاز محل بنت آصف خاں (ملکۂ نورجہاں کا بھائی) اور شہریار کی شادی ۱۶۲۱ء میں لاڈلی بیگم بنت شیر افگن

(مہر النساء الملقب بہ نور جہاں کا پہلا شوہر) سے ہوئی تھیں۔ جہانگیر کے انتقال ہوتے ہی شہزادہ پرویز نے اپنی خوشدامن جو تب تک مہر النساء سے ملکہ نور جہاں ہو چکی تھی کی شہ پر لاہور میں تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اُدھر دیوان سلطنت، خواجہ ابوالحسن کی حمایت پر آصف خاں جو وکیل سلطنت تھا، نے بہت چابکدستی اور عقلمندی سے خسرو کے لڑکے، شہزادہ داور بخش کی تخت نشینی کا اعلان کرتے ہوئے شہاب الدین کو فوراً بلا بھیجا اور میر بخشی کی حمایت سے لاہور پر حملہ کر کے پرویز کو گرفتار کر لیا، اور پھر اس کی آنکھیں پھوڑ وا دیں۔ اس کے بعد شہاب الدین کے لاہور پہنچنے پر داور بخش کو برطرف کرتے ہوئے شہاب الدین کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔

(۱۲) نادر شاہ = اصل نام نادر قلی تھا وہ ایک ترکی النسل تھا اور ۱۶۸۸ء میں خراسان کے ایک معمولی گھرانے [ایک گڈریے کے گھر] میں پیدا ہونے کے سبب کافی دشواریوں سے بعد تعلیم حاصل کر سکا تھا۔ ۱۷۲۲ء میں ابدالی افغانوں نے شاہ حسین صفوی سے فارس حاصل کر لیا تو ۱۷۳۰ء میں نادر شاہ نے پھر سے فارس حاصل کرنے اور شاہ حسین کے فرزند، طہماسپ کے تخت نشین ہونے میں مدد کی۔ اس کے بعد اس نے شاہ ایران کے ترکوں سے معاہدہ کر لینے سے خفا ہو کر ۱۷۳۲ء میں بادشاہ کو تخت سے معزول کر کے اس کے شیر خوار شہزادے کو عباس سوم کے لقب سے تخت نشین کر دیا اور انتظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد ۱۷۳۶ء میں بالآخر وہ خود مختار ہو گیا۔ ۱۰ رجمادی الاول ۱۱۶۰ھ (۱۰ مئی ۱۸۴۷ء) کو مشہد میں اس کو قتل کر دیا گیا۔

(۱۳) "بھارت کا برہت اتہاس" (ہندی) جلد دوم ص ۲۳۶

(۱۴) احمد شاہ ابدالی = اس کا تعلق افغانستان کے ابدالی قبیلے سے تھا۔ وہ نادر شاہ کا ایک سپہ سالار تھا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد اس نے افغانستان میں ایک آزاد حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی اور "دُرِّ دُرّاں" کا لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد سے اس کا قبیلہ بھی "دُرّانی" کے نام سے موسوم ہو گیا۔

جب وہ نادر شاہ کے ہمراہ ہندوستان آیا تھا تو تبھی سے ہندی حکمرانوں کی کمزوریاں بھانپ گیا تھا۔ اس لئے اس نے ان کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور سات بار ہندوستان پر حملے کئے۔

۲۶ سال حکومت کرنے کے بعد ۵۰ سال کی عمر میں ۱۱۸۲ھ (۱۷۷۲ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا مقبرہ جس پر ایک سنہرا گنبد ہے، شاہی محل کے نزدیک واقع ہے۔

[''بھارت کا ورہت اتہاس'' (ہندی) جلد دوم ص ۲۴۷ ''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۷۰]

(۱۵) سلطان زماں شاہ = وہ سلطان احمد شاہ ابدالی کا پوتا اور تیمور شاہ کا پانچواں فرزند وارث سلطنت اور ایک قابل و بیدار مغز سلطان تھا۔ والد کی وفات کے بعد ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۳ء میں) میں کابل میں تخت نشین ہوا۔ پہلے تو اس نے ملک میں لاقانونیت کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد اس نے ۱۷۹۱ء میں لاہور تک اپنی سلطنت کو وسعت دی۔

''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کو اس سے خوف لاحق تھی۔ اسی لئے ویلزلی نے فارسی سفیر بھیج کر اس کے اثر سے زماں شاہ کو فوراً واپس کابل لوٹ جانے پر مجبور کیا۔

محمود شاہ، بادشاہ ہرات نے ۱۸۰۰ء میں اس کو تخت سے بے دخل کرنے کے بعد اندھا کر کے بالاحصار میں قید کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کو ہندوستان آکر کمپنی بہادر کی پنشن پر زندگی بسر کرنی پڑی۔

[''بھارت کا ورہت اتہاس'' (ہندی) جلد سوم ص ۱۱۷۔۱۱۸]

(۱۶) سید احمد بریلوی = والد کا نام سید محمد عرفان تھا جن کا سلسلہ نسب حضرت امام حسن تک پہنچتا ہے۔ یکم مئی ۱۲۰۱ء میں بمقام رائے بریلی پیدا ہوئے اور بچپن ہی سے جہاد کا شوق تھا۔ ایک دفعہ رامپور میں آپ نے چند افغانوں کی زبانی سنا کہ سکھوں نے مسلمان عورتوں کو جبرا تنگ کر کے ان پر تصرف کر لیا ہے۔ اس پر آپ نے جہاد کا ارادہ کر لیا اور دس گیارہ ہزار مسلمان جان نثاروں کی ایک فوج تیار کر لی۔ تب راجہ لاہور کے پاس اعلام نامہ ارسال کیا۔ راجہ نے آپ کے قاصد کو دربار سے نکلوا دیا اور دس ہزار کے ایک لشکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ نوشہرہ کے قریب دریائے سندھ کے کنارے ۲۰ رجمادی الاول ۱۲۴۲ھ (۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء) کو دونوں فوجیں دونوں کناروں پر خیمہ زن ہوئیں۔ زبردست معرکہ آرائی کے بعد سکھوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد اول، ص ۲۹۰، ۲۹۶]

(۱۷) جھنداں دیوی = مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آخری بیوی تھی۔ اس کو سرکار سے ۸۰۰ روپیہ ماہوار

پنشن ملتی تھی اور ۲۰،۰۰۰ روپے نقد سے زائد اس کے پاس جاگیر تھی۔ جب وہ فوت ہوا تو اس کے پسر راجکمار کنور جگجوت سنگھ نے بہت دھوم دھام سے اس کی آخری رسومات ادا کیں۔ اس کی ارتھی مہاراجہ کی سمادھی کے پاس نذر آتش کی گئی اور راکھ ہردوار لے جا کر دریائے گنگا میں بہا دی گئی۔ ["قاموس المشاہیر" جلد اول ص ۱۴۳]

(۱۸) "بھارت کا برہت اتہاس" (ہندی) جلد سوم ص ۲۹۹

(۱۹) ایضاً ... ص ۳۵۵

(۲۰) مولانا کو پورے دو سال تک جیل میں بسر کرنے پڑے ... ۱۹۴۲ء میں ... Pearl Harbour (Ship) پر حملہ ... جنگ Global ہو گئی تھی۔ [اس سے پہلے امریکہ برطانیہ کی مدد کر رہا تھا اور جنگ مغربی یورپ تک ہی محدود تھی۔] چنانچہ امریکہ کے صدر روزویلٹ (Roosve t) نے برطانیہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان کے لیڈروں سے تعلقات استوار کرے۔ الغرض جون ۱۹۴۲ء میں وائسرائے ہند نے ... آزاد کر دینے کا فیصلہ لے لیا۔

(۲۱) ۵ مارچ ... (۳ مارچ) بروز منگل صبح کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے سری لنکائی کرکٹ ٹیم ... پاکستان کے "قذافی سٹیڈیم" جاتے وقت جیسے ہی ... Luxury ہوٹل کے ... تقریباً ایک درجن دہشت گردوں نے ... راکٹوں ... AK 47 رائفلوں سے حملہ کر دیا۔ یہ حملہ 8 39 سے 8 51 تک چلا ... اس کا ڈرائیور محمد خلیل ... حاضر دماغی اور جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے ... کامیاب ہو گیا ... سری لنکائی کھلاڑی ... زخمی ہو گئے ... Umpires کو لے کر آ رہی تھی وہ بھی حملے کی زد میں آ گئی جس سے اس کا ڈرائیور، محمد ... جاں بحق اور ایک پاکستانی Reserve امپائر، احسان رضا، زخمی ہو گئے۔ ... اندوہناک واقعے میں ... افراد جن سب کا تعلق پاکستان سے تھا، جاں بحق ہوئے۔ ان میں پانچ پاکستانی سیکورٹی اہلکار شامل ہیں۔ ٹیم کا دورہ فوراً منسوخ کر دیا گیا اور سری لنکائی ٹیم ... ایک چارٹرڈ ہوائی جہاز سے وطن واپس لوٹ گئی۔

۲۰۱۱ء میں عالمی کرکٹ کپ ... کی پاکستان کو میزبانی کرنی تھی۔ اب اس واقعے سے ... میزبانی کھٹائی میں پڑ گئی ہے پھر مستقبل قریب میں کسی بیرونی کرکٹ ٹیم کے پاکستان آنے کے امکانات بھی معدوم ہو گئے ہیں جو معاشی اعتبار سے اس کے لیے ایک زبردست دھچکا ہوگا۔ ساتھ ہی ہندوستان پر بھی اس واقعے کے منفی اثرات مرتب ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

خاندانِ غزنویہ

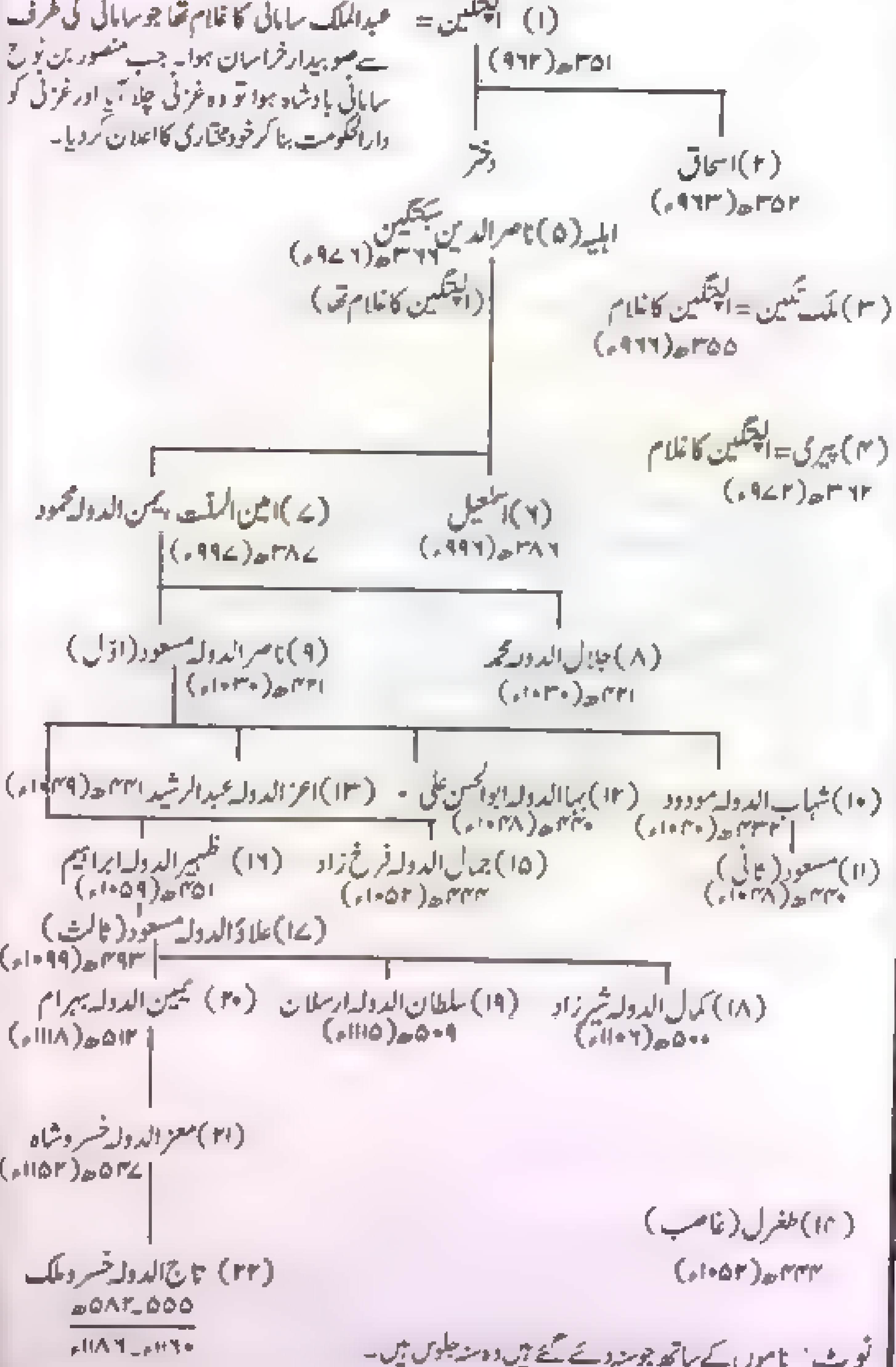

نوٹ: ناموں کے ساتھ جو سنہ دیے گئے ہیں وہ سنہ جلوس ہیں۔

درّانی شاہی خاندان

- احمد شاہ درّانی (۱۷۴۷_۱۷۷۳ء)
  - تیمور شاہ (۱۷۷۳_۱۷۹۳ء)
    - ہمایوں
    - محمود [۱۸۰۰_۱۸۰۳ء، ۱۸۰۹_۱۸۱۸ء]
    - زمان شاہ (۱۷۹۳_۱۸۰۰ء)
    - شجاع الملک [۱۸۰۳_۱۸۰۹ء] [۱۸۳۹_۱۸۴۲ء]
    - ایوب (۱۸۱۸_۱۸۲۹ء)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خاندان

- بدھ سنگھ (م ۱۷۱۶ء)
  - نودھ سنگھ (م ۱۷۵۲ء)
    - چڑت سنگھ (م ۱۷۷۴ء)
      - مہا سنگھ (مہان سنگھ) (م ۱۷۹۲ء) + دختر
      - دیگر
  - چندر سنگھ
    - گجپت سنگھ (راجہ جند)
      - دختر + مہا سنگھ
        - رنجیت سنگھ (پیدائش ۱۷۸۰ء، وفات ۱۸۳۹ء)
          - دلیپ سنگھ (۱۸۴۳_۱۸۴۹ء) [رانی چندا کنور کے بطن سے تھا]
          - ملتانہ سنگھ
          - پشورا سنگھ
          - کشمیرا سنگھ
          - تارا سنگھ
          - کھڑک سنگھ (۱۸۳۹_۱۸۴۰ء)
            - شیر سنگھ (۱۸۴۱_۱۸۴۳ء)
            - نونہال سنگھ (۱۸۴۰ء)

(۲) لاہور کے چند نامور امراء

جن کے نقشِ پا کو رکھتی تھی زمیں سر پہ بہ فخر
ترتبوں میں خاک آلودہ ہیں وہ عالی گہر

نام ان کا کوئی اب بھولے سے بھی لیتا نہیں
جن کے دروازوں پہ ڈنکا بجتا تھا شام وسحر

خاک میں مرکر ملے افسوس وہ عالی دماغ
اب نشانِ قبر بھی اُن کے نہیں آتے نظر

(نامعلوم)

نمبر شمار	نام	منصب	عرصہ	
			کب سے	کب تک
۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	ملک ایاز (۱)	صوبیدار	۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء)	—
۲۔	علی کرماخ (۲)	صوبیدار	۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء)	—
۳۔	ملک اعز الدین ایاز (۳)	صوبیدار	—	—
۴۔	امیر تلابغو (۴)	صوبیدار	—	۷۳۶ھ (۱۳۳۵ء)
۵۔	خضر خاں (۵)	صوبیدار	۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء)	
۶۔	بہلول لودی (۶)	صوبیدار	—	—
۷۔	دولت خاں لودی (۷)	صوبیدار	—	—
		پنجاب	—	—
۸۔	احمد خاں سور (۸)	صوبیدار	—	۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء)
	(الملقب بہ سکندر شاہ)		—	
۹۔	خضر خاں کاشغری (۹)	ناظم	۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء)	—

عہدِ اکبری [۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء) تا ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	حسین قلی خاں (۱۰) (خان جہاں)	صوبیدار لاہور	۹۶۵ھ (۱۵۵۷ء)	۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء)
۲۔	قاضی حسن زنجانی (۱۱)	قاضی	— —	۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء)
۳۔	رائے رائے سنگھ آف بیکانیر (۱۲)	مشترکہ صوبیدار لاہور	۹۹۴ء (۱۵۸۵ء)	۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء)
۴۔	راجہ بھگونت داس کچھواہہ (۱۳)	ایضاً	۹۹۴ء (۱۵۸۵ء)	۹۹۸ء (۱۵۸۹ء)
۵۔	قلیج خاں اندجانی (۱۴)	دیوان لاہور	۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء)	۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء)
۶۔	متھرا داس کھتری (ہندی)	دیوان لاہور	۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء)	— —
۷۔	میر مراد جوینی (تورانی) (۱۵)	بخشی لاہور	۱۰۰۷ھ (۱۵۹۸ء)	۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء)
۸۔	خواجہ شمس الدین خوانی (ہندی) (۱۶)	صوبیدار لاہور	۱۰۰۷ھ (۱۵۹۸ء)	۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء)
۹۔	قلیج محمد خاں (تورانی) (۱۷)	صوبیدار لاہور	۱۰۱۲ھ [I] (۱۶۰۳ء)	۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴ء)
			۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) [II]	۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء)
۱۰۔	ملک علی اہتمام خاں (برادر قاضی علی)	کوتوال لاہور	۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)	— —

عہد جہانگیری [۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) تا ۱۰۳۶ھ (۱۶۲۶ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	دلاور خاں کاکر (۱۸)	صوبیدار	۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)	۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء)
۲۔	مرزا جعفر بیگ (آصف خاں) (۱۹)	صوبیدار	۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)
۳۔	نورالدین قلی صفہانی (ہندی) (۲۰)	کوتوال	۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)	۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء)
۴۔	ملک علی اہتمام خاں (ہندی) (برادر قاضی علی)	کوتوال	۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)
۵۔	قلیج خاں (ٹورانی) (۱۷)	صوبیدار	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)	۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء)
۶۔	میر قوام الدین خوانی (ہندی)	دیوان	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)	۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء)
۷۔	جمال اللہ	کوتوال	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)	— —
۸۔	شیخ یوسف (ہندی)	بخشی	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)	— —
۹۔	آقا نور اصفہانی	کوتوال	— —	۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء)

۱	۲	۳	۴	۵
۱۰۔	آقا فضل اصفہانی (۲۱) (فاضل خاں)	نائب صوبیدار	۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء)	۱۰۲۸ھ (۱۶۱۸ء)
۱۱۔	خواجہ غیاث الدین (۲۲) (محمد غیاث بیگ اعتماد الدولہ)	صوبیدار	۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء)	۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء)
۱۲۔	صادق خاں (ہندی) (۲۳)	صوبیدار	۱۰۳۳ھ (۱۶۲۳ء)	۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء)
۱۳۔	طالب خاں (بن آصف خاں)	نائب صوبیدار	۱۰۳۴ھ (۱۶۲۴ء)	— —

عہدِ شاہجہانی [۱۰۳۶ھ (۱۶۲۶ء) تا ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	ابوالحسن (آصف خاں یمین الدولہ، مبارز السلطنت) (ہندی) (۲۴)	وکیل اور صوبیدار	۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء)	۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء)
۲۔	حکیم جمالائی کاشی (۲۵) (دیانت خاں) (ہندی)	دیوان	۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء)	۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء)
۳۔	وزیر خاں حکیم علیم الدین (۲۶) (ہندی)	صوبیدار	۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء)	۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء)
۴۔	رائے سبھا چند (ہندی) (۲۷)	دیوان	۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء)	۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء)

۱	۲	۳	۴	۵
۵۔	بہاری مل (ہندی) (۲۸)	دیوان	—	۱۰۴۸ھ
			—	(۱۶۳۸ء)
۶۔	محمد شریف (معتمد خاں) (ہندی) (۲۹)	صوبیدار	۱۰۴۹ھ	۱۰۴۹ء
			(۱۶۳۹ء)	(۱۶۳۹ء)
۷۔	دوست کام (بن معتمد خاں) (۳۰)	بخشی اور واقعہ نویس	۱۰۴۹ھ	۱۰۵۱ھ
			(۱۶۳۹ء)	(۱۶۴۱ء)
۸۔	غیرت خاں (۳۱)	قلعدار	۱۰۴۹ھ	۱۰۵۰ھ
			(۱۶۳۹ء)	(۱۶۴۰ء)
۹۔	اعظم خاں کوکہ (۳۲)	صوبیدار	۱۰۴۹ھ	۱۰۵۳ھ
	[المعروف بہ فدائی خاں کوکہ]		(۱۶۳۹ء)	(۱۶۴۳ء)
۱۰۔	سعید خان بہادر ظفر بیگ (۳۳)	صوبیدار	۱۰۵۲ھ	۱۰۵۳ھ
		دوسری بار	(۱۶۴۲ء)	(۱۶۴۳ء)
۱۱۔	مہیش داس راٹھور (ہندی) (۳۴)	قلعدار	۱۰۵۴ھ	—
			(۱۶۴۴ء)	—
۱۲۔	سر انداز خاں قلماق (تورانی)	قلعدار	۱۰۵۶ھ	۱۰۵۶ھ
			(۱۶۳۶ء)	(۱۶۳۶ء)
۱۳۔	شفیع اللہ برلاس (تورانی)	قلعدار	۱۰۵۶ھ	۱۰۵۸ھ
	(تربیت خان)		(۱۶۳۶ء)	(۱۶۴۸ء)
۱۴۔	سید علی (ہندی)	کوتوال	۱۰۵۷ھ	۱۰۶۰ھ
	(بن سید جلال بخاری)		(۱۶۴۷ء)	(۱۶۵۰ء)

۱	۲	۳	۴	۵
۱۵۔	سید منور برہہ (ہندی) (بن سید خانِ جہاں)	قلعدار	۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء)	— —
۱۶۔	محمد صالح	کوتوال	۱۰۶۱ھ (۱۶۵۰ء)	— —
۱۷۔	مرشد علی	بخشی	۱۰۶۱ھ (۱۶۵۰ء)	— —
۱۸۔	نادر علی بیگ (تورانی)	قلعدار	۱۰۶۱ھ (۱۶۵۰ء)	— —
۱۹۔	آقا یوسف	داروغہ (عمارات)	۱۰۶۱ھ (۱۶۵۰ء)	— —
۲۰۔	نادر علی (تورانی)	کوتوال	۱۰۶۲ھ (۱۶۵۱ء)	— —
۲۱۔	اسد اللہ (بن شیر خواجہ)	قلعدار	۱۰۶۲ھ (۱۶۵۱ء)	— —
۲۲۔	شیخ عبدالکریم (ہندی)	حارث	۱۰۶۲ھ (۱۶۵۱ء)	— —
۲۳۔	محمد فاضل خاں	بخشی اور واقعہ نویس	۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء)	— —
۲۴۔	قاضی محمد یوسف	دیوان	۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵ء)	— —

۱	۲	۳	۴	۵
۲۵۔	عبدالرحیم (ہندی) (بن عبدالکریم)	بخشی اور واقعہ نویس	۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵ء)	۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء)
۲۶۔	بہادر خان باقی بیگ (۳۵)	محافظ لاہور	۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵ء)	۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء)
۲۷۔	قاضی حیدر	قاضی	۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵ء)	— —
۲۸۔	خواجہ معین خاں	نائب صوبیدار	۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء)	— —
۲۹۔	سید عزت خان عبدالرزاق گیلانی (۳۶)	محافظ لاہور	۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء)	— —
۳۰۔	شیخ داؤد (عزت خاں) (ہندی)	نائب صوبیدار	۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء)	— —
۳۱۔	باقی بیگ (غیرت خان، بہادر خان) (۳۷)	نائب صوبیدار	۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء)	۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء)
۳۲۔	علی مردان خاں (امیر الامراء) (۶۷)	صوبیدار	۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء)	۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء)

عہد عالمگیری [۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) تا ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	مہابت خان محمد ابراہیم (۳۸)	صوبیدار	— —	۱۰۷۸ھ (۱۶۶۷ء)
۲۔	خانِ جہاں بہادر ظفر جنگ کوکتاس (۳۹)	صوبیدار	۱۱۰۲ھ (۱۶۹۰ء)	۱۱۰۵ھ (۱۶۹۳ء)
۳۔	مظفر حسین المعروف بہ فدائی خان کوکہ (۴۰)	صوبیدار	۱۰۶۲ھ (۱۶۷۱ء)	۱۰۸۶ھ (۱۶۷۵ء)
۴۔	محمد امین خان (میر محمد امین) (۴۱)	صوبیدار	۱۰۷۸ھ (۱۶۶۷ء)	۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء)
۵۔	قوام الدین خاں اصفہانی (۴۲)	صوبیدار	۱۰۸۹ھ (۱۶۷۸ء)	۱۰۹۱ھ (۱۶۸۰ء)
۶۔	لطف اللہ خان (۴۳)	نائب صوبیدار	۱۰۹۱ھ (۱۶۸۰ء)	۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء)
		واقعہ نویس	۱۰۹۳ھ (۱۶۸۲ء)	۰۱۹۴ھ (۱۶۸۲ء)
۷۔	کامگار خان (۴۴)	واقعہ نویس	۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء)	۱۰۹۳ھ (۱۶۸۲ء)
۸۔	خلیل اللہ خان (۴۵)	صوبیدار	—	—
۹۔	میر محمد کاظم خان (۴۶)	دیوان قلعدار [جہاندار شاہ کے عہد میں]	—	—

۱	۲	۳	۴	۵
۱۰۔	صمصام الدولہ شاہنواز خان (۴۷)	دیوان	—	—
۱۱۔	اللہ یار خاں (۴۸)	صوبیدار	—	—
۱۲۔	احمد یار خاں (۴۹) (بن اللہ یار خاں)	صوبیدار	—	—

عالمگیر کے بعد کا دور [۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) تا ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	ولی محمد خاں مسرور	حاکم	طہماسپ ثانی، شاہ فارس کے عہد (۱۱۳۵ھ تا ۱۱۵۱ھ) میں	
۲۔	سیف الدولہ عبدالصمد خان بہادر دلیر جنگ (۵۰)	صوبیدار		
۳۔	زکریا خان بہادر ہزبر جنگ (۵۱)	صوبیدار	—	۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء)
۴۔	شہنواز خاں (۵۲) (بن زکریا خاں)	صوبیدار	۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء)	—
۵۔	معین الملک (۵۳) (بن اعتماد الدولہ قمر الدین خاں)	صوبیدار	۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء)	۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء)
۶۔	میر مومن (بن معین الملک) (۵۴)	صوبیدار	۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء)	۱۱۶۸ھ (۱۷۵۴ء)

۱	۲	۳	۴	۵
۷۔	میر منعم (۵۵)	صوبیدار	۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء)	۱۱۷۰ھ (۱۷۵۹ء)
۸۔	تیمور شاہ (۵۶)	صوبیدار	۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء)	۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء)
۱	۲	۳	۴	۵
۹۔	آدینہ بیگ خاں (۵۷)	صوبیدار	۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء)	۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء)
۱۰۔	رنجیت سنگھ (۵۸)	صوبیدار	۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء)	۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء)
۱۱۔	حفظ اللہ خاں	واقعہ نویس	۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء)	— —
۱۲۔	شاہ نواز خاں	صوبیدار	—	—

(۳) لاہور میں پیدا ہوئے/ وصال پائے چند نامور امراء

نمبر شمار	نام	سنہ پیدائش/وصال	پیدائش وصال
۱	۲	۳	۴
۱۔	قاضی حسن زنجانی (۱۱)	۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء)	انتقال

۱	۲	۳	۴
۲۔	راجہ بھگونت داس کچھواہہ (۱۳)	۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء)	انتقال
۳۔	راجہ ٹوڈرمل (۵۹)	۱۱رمحرم الحرام ۹۹۸ھ (۱۰رنومبر ۱۵۸۹ء)	انتقال
۴۔	شیخ مبارک ناگوری (۶۰)	۱۰۰۱ھ ۱۷رذیقعدہ (۱۵۹۲ء ۵راگست)	انتقال (لیکن دفن آگرہ میں ہوئے)
۵۔	خواجہ شمس الدین خوانی (۱۲)	۱۰۰۹ء (۱۶۰۰ء)	انتقال
۶۔	میر مراد جوینی (۱۵)	۱۰۰۹ء (۱۶۰۰ء)	انتقال
۷۔	شاہ بیگ خان کابلی (۶۱) (خان دوراں اوّل)	۱۰۲۹ھ (۱۶۱۹ء)	انتقال
۸۔	ابوالحسن آصف خاں امیر الدولہ (۲۴)	۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء)	انتقال
۹۔	فتح خاں [بن ملک عزیز (م ۱۶۲۶ء)]	۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء)	انتقال
۱۰۔	اسد خاں ماموری (۶۲)	۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء)	انتقال
۱۱۔	خواجہ ابوالحسن تربتی (۶۳)	۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء)	انتقال
۱۲۔	علامی ملا شکر اللہ شیرازی (الملقب بہ افضل خاں)	۱۰۴۸ھ ۱۲رمضان ۷رجنوری (۱۶۳۹ء)	انتقال
۱۳۔	صف شکن خاں مرزا لشکری (۶۴)	۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء)	انتقال
۱۴۔	خانِ جہاں بارہہ (۶۵)	۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء)	انتقال
۱۵۔	خانِ دوراں نصرت جنگ (۶۶)	۱۰۵۵ھ ۷رجمادی الاوّل (۱۶۴۵ء ۲رجون)	انتقال

۱	۲	۳	۴
۱۶۔	علی مردان خاں امیر الامراء (۶۷)	۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء)	انتقال
۱۷۔	ظفر خاں (خواجہ احسن اللہ) (بن خواجہ ابوالحسن تربتی) (۶۸)	۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء)	انتقال
۱۸۔	ملا علاء الملک تونی (۶۹) (مخاطب بہ فاضل خاں)	ایضاً (۱۱/ ذیقعدہ) (ایضاً ۲۴/ جون)	انتقال
۱۹۔	پشوتن (م ۱۶۳۳ء آگرہ) (۷۰)	۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) ۳/ ذیقعدہ بروز جمعہ	پیدائش
۲۰۔	تقی انشاء (۷۱)	۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء)	انتقال
۲۱۔	فاضل خاں (۷۲)	۱۰۷۳ھ (۱۶۶۳ء) ۲۷/ ذیقعدہ	انتقال
۲۲۔	صمصام الدولہ شاہنواز خاں (۴۷)	۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء)	پیدائش

حواشی

(۱) ملک ایاز = محمود غزنوی نے لاہور فتح کر کے اس کو وہاں کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس طرح کسی بھی مسلم سلطان کی طرف سے مقرر کیا گیا وہ لاہور کا پہلا صوبیدار ہوا۔

(۲) علی کرماج = شہاب محمد غوری کی طرف سے ملتان کا حاکم تھا۔ جب ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں غوری نے لاہور پر زبردست حملہ کر کے اسے فتح کر لیا تو علی کرماج کو لاہور کا حاکم مقرر کیا۔

(۳) ملک اعزالدین ایاز = رضیہ سلطانہ بنت سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۳۶ء میں برسر اقتدار آنے پر حکومت کی تنظیم نو کی۔ حکومت کے اہم اور بڑے بڑے عہدے اپنے

مشہور اور قابل اعتماد امیروں کے سپرد کیے۔ اعزالدین کبیر خانی (ملک اعزالدین ایاز) کو لاہور کا حکمراں (صوبیدار) مقرر کیا لیکن جب رضیہ سلطانہ اور جمال الدین یاقوت حبشی کے درمیان تعلقات نے غلط موڑ لیا تو بہت سے امراء رضیہ سے ناراض ہو گئے۔ ملک اعزالدین نے بھی ۱۲۳۸ء میں رضیہ کے خلاف علم سرکشی بلند کر دیا۔ جب رضیہ نے اس پر لشکر کشی کی تو اس نے پھر سے رضیہ کی اطاعت قبول کر لی۔ اس پر رضیہ نے خوش ہو کر اس کو لاہور کے ساتھ ملتان کی بھی حکومت سپرد کر دی۔ ملک ایاز کی قبر لاہور میں واقع ہے۔

(۴) امیر ہلاجو = محمد بن تغلق کے عہد حکومت میں صوبیدار لاہور ہوا۔ لیکن اس نے ۱۳۳۵ء میں سلطان کے خلاف بغاوت کر دی جس کی پاداش میں مارا گیا۔

(۵) خضر خاں = تیمور نے وطن واپس لوٹتے وقت خضر خاں کو ملتان، لاہور اور دیپالپور کا صوبیدار مقرر کیا۔

(۶) بہلول لودی = سلطان محمد شاہ بن فرید خاں بن خضر خاں کے عہد حکومت (۱۴۳۴۔۱۴۴۵ء) میں وہ لاہور اور سرہند کا صوبیدار رہا۔ بعد میں دیپالپور کو اپنے قبضہ میں کر کے خودمختار ہو گیا تھا۔ آگے چل کر وہ لودی خاندان کا پہلا سلطان ہوا۔ تفصیلات احقر کی کتاب "تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ" جلد چہارم ("تذکرۂ جہنیاں") میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۷) دولت خاں لودی = ۱۵۲۴ء میں جب بابر نے چوتھی بار ہندوستان پر حملہ کر کے باجوڑ اور بھیرا کے علاوہ پنجاب میں داخل ہو کر لاہور، سیالکوٹ اور دیپالپور وغیرہ پر قبضہ کیا، ان دنوں دولت خاں لودی پنجاب کا صوبیدار تھا۔ اسی کی دعوت پر بابر نے حملہ بھی کیا تھا۔ دولت خاں پورے پنجاب پر اپنی حکومت چاہتا تھا لیکن بابر اس کے لڑکے دلاور خاں اور عالم خاں لودی کو پنجاب کی دیکھ ریکھ سپرد کر کے واپس چلا گیا۔ دولت خاں نے دلاور خاں اور عالم خاں پر حملہ کر کے ان سے علاقہ چھین لیا۔ چنانچہ نومبر ۱۵۲۵ء میں بابر پھر سے حملہ آور ہوا۔ دولت خاں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ بابر نے اسے قید کر کے بھیرا روانہ کر دیا۔ راستے میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

["مغل کالین بھارت" (ہندی) ص ۸]

(۸) <u>احمد خاں سور</u> = احمد خاں، نظام خاں سوری (شیر شاہ سوری کا بھائی) کا داماد، یعنی محمد عادل شاہ سور (اصل نام مبارز خاں) کا بہنوئی تھا۔ اس نے <u>۱۵۵۵ء</u> میں سلطان عادل شاہ سور پر حملہ کیا۔ فرح (متھرا) کے قریب جنگ ہوئی جس میں عادل شاہ کی شکست ہوئی سکندر شاہ نے آگرہ اور دلی پر قبضہ کر لیا۔ اس سے حکومت ہمایوں نے لے لی تھی۔

(۹) <u>خضر خاں خاشغری</u> = اس کی شادی شہزادی گلبدن بیگم بنت بابر بادشاہ سے ہوئی تھی۔ لاہور کے بعد اس کو بہار کا ناظم مقرر کر دیا گیا تھا جہاں <u>۹۶۶</u>ھ (<u>۱۵۵۸ء</u>) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ["قاموس المشاہیر" جلد دوم ص ۲۹]

(۱۰) <u>حسین قلی بیگ</u> = وہ خان خاناں بیرم خاں کا بھانجا اور ولی بیگ ذوالقدر کا بیٹا تھا۔ جب بیرم خاں اور شمس الدین اتکہ کے درمیان جالندھر کے قریب معرکہ آرائی ہوئی تو اس میں بیرم خاں کی طرف سے لڑتے ہوئے ولی بیگ زخمی ہو گیا تھا اور بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔

حسین قلی اکبر کے عہد میں پنج ہزاری منصب دار رہا۔ <u>۹۸۰</u>ھ (<u>۱۵۷۳ء</u>) میں "خان جہاں" کے خطاب سے نوازتے ہوئے اجمیر اور ناگور کی جاگیرداری دی گئی۔ <u>۹۸۱</u>ھ (<u>۱۵۷۳ء</u>) میں جب اکبر گجرات فتح کر کے آگرہ لوٹا تو جشن کے موقع پر اس کو "خان جہاں" کے خطاب سے نوازا گیا۔ [اس وقت یہ سب سے اونچا خطاب مانا جاتا تھا اور منعم خاں خان خاناں کو یہ خطاب ملا ہوا تھا۔] <u>۹۸۳</u>ھ (<u>۱۵۷۵ء</u>) میں بنگال کے صوبیدار منعم خان کے انتقال کے بعد اس کو وہاں کا صوبیدار مقرر کیا گیا اور <u>۹۸۴</u>ھ (<u>۱۵۷۶ء</u>) میں صوبہ [illegible] بنا دیا گیا۔ اس نے ٹانڈا کے قریب صحت پور کے نام سے ایک بستی آباد کی۔ وہیں <u>۹۸۶</u>ھ (<u>۱۵۷۸ء</u>) میں وہ بیمار پڑ گیا۔ مرض اطباء کی سمجھ میں نہ آ سکا اور پھر ڈیڑھ ماہ بستر علالت پر رہ کر دسمبر میں انتقال کر گیا۔ ["مآثر الامراء" (انگلش ترجمہ) جلد اول ص ۶۹۵ تا ۶۹۶]

(۱۱) <u>قاضی حسن زنجانی</u> = آپ کو کئی ہزار احادیث ازبر تھیں۔ بابر بادشاہ جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے آپ کا شہرۂ فضل و کمال سن کر فرغانہ طلب کیا اور مشیر خاص بنایا۔ آپ بابر کے ہمراہ ہند وارد ہوئے۔ ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد بابر نے آپ کو باغیوں کو زیر کرنے کے لئے مامور کیا۔ چنانچہ آپ نے موجودہ [illegible] تھے۔

سیوہارہ کو فتح کیا جس سے خوش ہو کر بادشاہ نے وہ علاقہ آپ کو جاگیر میں عطا فرماتے ہوئے منصب قضیات مرحمت فرمائی۔ بعد میں اکبر نے آپ کو لاہور کا قاضی بنا کر بھیجا۔ آپ کو دیوانی اور فوجداری کے کل اختیارات حاصل تھے۔ وہیں ۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء) میں سو سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ فرنگ کے دیرینہ قبرستان میں شاہ سریائی کے مزار کے پاس آپ کا مزار شریف واقع تھا۔ اب آثار لاپتہ ہیں۔

آپ کی اولاد میں کئی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں، جیسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، بیرسٹر آصف علی، پروفیسر عبدالصمد صارم، خان بہادر نورالاسلام وغیرہ وغیرہ۔ آج بھی آپ کی اولاد سیوہارہ میں رہتی ہے اور ابھی بھی قاضی کہلاتے ہیں۔ احقر کی حقیقی نانی کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔

(۱۲) رائے رائے سنگھ آف بیکانیر = وہ بیکانیر کے زمیندار کلیان مل کا لڑکا اور راٹھور قبیلے سے تھا۔ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی دختر، جو بیکانیر بیگم کے نام سے مشہور ہوئی، شہزادہ سلیم کے عقد میں تھی۔ اکبر نے اسے چار ہزاری اور جہانگیر نے پنج ہزاری منصب عطا فرمائے۔ ["قاموس المشاہیر" جلد اول ص ۲۴۲]

(۱۳) راجہ بھگونت داس کچھواہا = راجہ بہارمل کچھواہہ کا لڑکا تھا۔ ۱۵۷۲ء میں بہادری دکھانے کے عوض علم و نقارہ مرحمت ہوا۔ ۹۹۳ھ (۱۵۸۴/۸۵ء) میں اس کی لڑکی کی شادی شہزادہ سلیم سے ہوئی اور دو کروڑ روپیہ کا مہر مقرر ہوا۔ اسی کے بطن سے ایک دختر، سلطان النساء بیگم اور ۴ راگست ۱۵۸۷ء کو شہزادہ خسرو پیدا ہوئے۔ وہ اکبر کا نہایت وفادار سردار اور کھلے ذہن کا انسان تھا۔ اس نے لاہور میں ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جس میں اکثر لوگ جمعہ کی نماز ادا کرتے تھے۔ تیسویں سال جلوس اکبری میں وہ پنج ہزاری منصب پر فائز ہوا۔ ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں اس کا لاہور میں انتقال ہوگیا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۱۳۰ تا ۱۳۳]

(۱۴) قلیچ خاں اندجانی = اس کے باپ دادا سلاطین چغتائیہ کی خدمت میں صاحب نسبت رہے تھے۔ خاص طور سے اس کا دادا سلطان حسین مرزا بایقرا کے یہاں امارت کا درجہ رکھتا تھا۔ جب اکبر نے کشمیر کے سفر کا ارادہ کیا تو اس نے قلیچ خاں کو راجہ بھگونت داس اور راجہ

ٹوڈرمل کے ہمراہ لاہور میں ٹھہرنے کا حکم دیا تاکہ ایک دوسرے کے مشورے سے ملکی معاملات انجام پائیں۔ راجہ ٹوڈرمل کے مرنے کے بعد بھی وہ ایک مدت تک دیوانی کے کام انجام دیتا رہا۔ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں وہ کابل کی نظامت پر مقرر کیا گیا۔ ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۶۹۱ تا ۶۹۲]

(۱۵) میر مراد جوینی = بہت دنوں تک دکن میں رہنے کے سبب دکنی مشہور ہوا۔ شجاعت اور بہادری میں بے مثال تھا۔ تیر اندازی کے فن میں لوگ اسے استاد سمجھتے تھے۔ اس سے اکبر نے شہزادہ خرم کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا۔ بخشی گیری کے زمانے میں ہی ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) میں لاہور میں وفات ہوئی۔ [''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۱۳۰ تا ۱۳۲]

(۱۶) خواجہ شمس الدین خوافی = موروثی اعلیٰ ذات کے رہنے والے تھے جو عہد میں خواف کے تھے۔ اس سے خوافی کہلائے۔ شمس الدین خواجہ نے ۹۹۵ھ میں خان اعظم اور بعد میں ''آصف خان اور اعتماد خان'' کے خطابات سے نوازا۔ وہ مغلیہ حکومت کا دیوان بھی رہا۔ لاہور میں انتقال ہوا۔

(۱۷) قلیج خاں تورانی = ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں وہ صوبیدار گجرات، ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) میں وزیر، ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں مشترکہ صوبیدار احمد آباد، ۱۰۰۷ھ (۱۵۹۹ء) میں صوبیدار آگرہ، ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) میں صوبیدار پنجاب، ۱۰۱۲ھ (۱۶۰۳ء) میں صوبیدار لاہور، ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں صوبیدار گجرات، ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں صوبیدار ... ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۰ء) میں صوبیدار کابل ہوا۔ چار ہزار ذات سے ترقی کرتا کرتا چھ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کے منصب پر پہنچے۔ عہد جہانگیری میں ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔
دو دو بار لاہور کا صوبیدار رہا۔ ایک بار اکبر کے عہد میں اور دوسری بار جہانگیر کے عہد میں۔

["The Apparatus of Empire"]

(۱۸) داور خاں کاکر = اس کا اصل نام ابراہیم تھا۔ جس کی عمدگی سے اس نے ... سلطان خسرو کے حملے سے محفوظ رکھا اس پر شاہی عنایت سے سرفراز ہوا۔ ۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء) میں وہ ٹھٹھہ کی صوبیداری پر فائز ہوا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۱۳۰ تا ۱۳۲]

(۱۹) **مرزا جعفر بیگ (آصف خان)** = وہ عہد اکبری میں ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں بخشی، ۹۹۴ھ (۱۵۸۶ء) میں بخشی الہ آباد، ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۷ء) میں صوبیدار کشمیر، ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) میں دیوان کل، ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) میں صوبیدار آگرہ، ۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴ء) میں صوبیدار بہار اور دو ہزار ذات اور دو ہزار سوار کے منصب پر فائز رہے۔ عہد جہانگیری میں ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں حاکم لاہور، ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں وزیر اور پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کے منصب پر فائز رہا۔ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں وفات پا گیا۔

["Tha Apparatus of Empire"]

(۲۰) **نورالدین قلی اصفہانی** = ۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء) میں وہ ایک ہزاری ذات اور ۳۰۰ سوار کے منصب پر فائز ہوا۔ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) (دور شاہجہانی) میں سابقہ منصب دو ہزاری ذات اور ۷۰۰ سوار کے منصب پر بحال ہوا۔ ۲۵ر شعبان ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) کو اسے کشن سنگھ نے قتل کر دیا۔ [''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۲۱۴]

(۲۱) **فاضل خاں** = اصل نام آقا فضل اصفہانی تھا۔ وہ ولایت سے ہندوستان آیا اور شیخ فرید مرتضیٰ خاں بخاری سے وابستہ ہو گیا۔ ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) میں جب صوبہ پنجاب کی حکومت شیخ فرید کو تفویض ہوئی تو لاہور کی نائب صوبہ داری اس کو مل گئی۔ جب شیخ فرید کے انتقال کے بعد صوبہ اعتمادالدولہ کی جاگیر میں مقرر ہوا تو بھی وہ بدستور نائب صوبہ دار لاہور رہا۔ بعد میں اس کو ''فاضل خاں'' کا خطاب مرحمت ہوا۔ اس کے بعد شاہجہاں نے بھی اس کو نوازتے ہوئے ''اعتماد خاں'' کا خطاب مرحمت فرمایا۔ ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ [''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۶۳۸، جلد سوم ص ۱۵ تا ۱۸]

(۲۲) **خواجہ غیاث الدین (محمد غیاث بیگ)** = والد کا نام محمد طہرانی تھا جو طہماسپ صفوی، شاہ ایران کے عہد میں حاکم خراسان رہا لیکن خواجہ غیاث گردش زمانہ سے پریشان ہو کر ایک قافلے کے ساتھ مع اپنی بیوی کے عازم ہندوستان ہوا۔ قندھار کے قریب راستے میں اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ کئی دنوں سے پریشانی اور معاشی تنگی کا سامنا تھا چنانچہ اس بچی کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ بچی ایک سوداگر کے ہاتھ لگ گئی اور پھر خدا کی قدرت سے خواجہ کی اہلیہ ہی اس بچی کو دودھ پلانے پر مقرر ہوئی۔ آگے چل کر یہی بچی جس کا نام مہرالنساء تھا

ملکۂ نور جہاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ سوداگر نے جب وہ بڑی اکبر کو پیش کر دی تو مرزا غیاث بھی اکبر کے یہاں ملازم ہو گئے۔ عہد جہانگیری میں ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں نصف حکومت کے وزیر کے ساتھ "اعتماد الدولہ" کے خطاب سے سرفراز ہوا، پھر ترقی کرتے کرتے ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء) میں وزیر و وکیل، ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں صوبیدار لاہور ہو نیز ایک ہزار ذات اور دو سو پچاس کے منصب سے سات ہزار ذات اور سات ہزار سوار کے منصب تک ترقی کی۔ ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۰ء) میں انتقال ہو گیا۔ آگرہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اعتماد الدولہ کے نام سے آپ ہی کا مقبرہ قابل دید ہے جو نور جہاں نے تعمیر کرایا تھا۔

["قاموس المشاہیر" جلد دوم ص ۲۲۱، "The Apparatus of Empire"]

(۲۳) صادق خان = آقا طاہر وصلی بن محمد شریف ہروی کا لڑکا اور اعتماد الدولہ طہرانی کا بھتیجا اور داماد تھا۔ کچھ مدت اپنے باپ کے ہمراہ پنجاب کے نواح میں گزاری۔ ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء) میں ایک ہزار ذات اور ایک ہزار سوار کے منصب کے ساتھ "خان" کے خطاب سے نوازا گیا۔ پھر ترقی کرتے کرتے چار ہزار ذات اور چار ہزار سوار کے منصب کے ساتھ ساتھ ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۲ء) میں صوبیدار پنجاب، ۱۰۳۳ھ (۱۶۲۳ء) میں حاکم لاہور اور عہد شاہجہانی میں ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں میر بخشی ہوا۔ ۹ ربیع الاول ۱۰۴۳ھ (۳ ستمبر ۱۶۳۳ء) کو انتقال ہو گیا۔

["قاموس المشاہیر" جلد دوم ص ۳۳، "مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۲۳ تا ۲۷، "The Apparatus of Empire"]

(۲۴) ابوالحسن (آصف خاں) = وہ نور جہاں کا بھائی، شاہجہاں کا خسر اور مشہور مغل امیر، شائستہ خاں کا باپ تھا۔ وہ دور جہانگیری میں ۱۶۱۱ء میں "اعتقاد خاں" کے لقب سے سرفراز ہو کر ۱۶۱۹ء میں وکیل حضرات، ۱۶۲۲ء میں صوبیدار بنگال و اڑیسہ، ۱۶۲۷ء میں وکیل اور صوبیدار پنجاب و ملتان رہا۔ دور شاہجہانی میں ۱۶۲۷ء میں "مبارز السلطنت" اور "یمین الدولہ" کے خطابات سے نوازے جانے کے ساتھ ساتھ وکیل و صوبیدار لاہور رہا اور ۱۶۳۳ء میں "خانِ خاناں سپہ سالار" کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۶۴۱ء میں انتقال کے وقت وہ ۹۰۰۰ ذات اور ۹۰۰۰ سوار کے منصب پر فائز تھا۔ شاہدرہ میں دریائے راوی کے کنارے جہانگیر کے مقبرہ

کے متصل مدفون ہے۔ چارلڑ کے شائستہ خاں، مرزا صبح، مرزا حسین اور نوشہ نواز خاں چھوڑے۔

(۲۵) حکیم جمالائی کاشی = ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) میں دو ہزاری ذات اور ۲۵۰ سوار کے منصب پر فائز ہوا اور صوبہ پنجاب کی دیوانی پر مقرر ہوا۔ ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) میں ''دیانت خاں'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۰۸۳ھ (۱۶۷۲ء) میں انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۳۶۔۳۷]

(۲۶) وزیر خاں حکیم علیم الدین = وہ چنیوٹ (پنجاب) کا رہنے والا اور طبابت میں ملکہ رکھتا تھا۔ جس دن شاہجہاں تخت نشیں ہوا، وہ پنج ہزاری ذات اور تین ہزار سوار کے منصب پر فائز ہوا۔ ''وزیر خاں'' کے لقب سے نوازے جانے کے ساتھ ہی علم، نقارہ اور ایک لاکھ روپیہ انعام میں پایا۔ ۱۰۴۴ھ میں لاہور میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی ''مسجد وزیر خاں'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ لاہور ہی کے نزدیک اس نے وزیر آباد آباد کیا۔ وہ لاہور کے قریب واقع چنیوٹ کا رہنے والا تھا چنانچہ اس نے چنیوٹ میں قصبے کے چاروں جانب ایک پختہ چہار دیواری، پختہ عمارتیں، بازاروں کے پختہ راستے، دکانیں، مساجد، سرائے، مدرسے، شفاخانے، کنویں اور تالاب بھی بنوائے۔ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں اس کا درد قولنج میں انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۷۶۲۔۷۶۴]

(۲۷) رائے سبھا چند = عہد شاہجہانی میں ۱۰۴۷ھ (۱۶۳۷ء) میں پانچ سو ذات اور اسی سوار کے منصب سے ترقی کرتے کرتے ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں دیوان لاہور، ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں سات سو ذات اور سو سوار کے منصب تک پہنچا۔ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں فوت ہو گیا۔

["The Apparatus of Empire"]

(۲۸) بہاری مل = عہد شاہجہانی میں ترقی کر کے دارالسلطنت لاہور کا دیوان مقرر ہوا۔ بارہویں سال جلوس شاہجہانی میں صوبہ ملتان کی دیوانی پر تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد خالصہ شاہی کا دیوان نائب (دوم وزیر اعظم) مقرر ہوا۔ پندرہویں سال جلوس شاہجہانی میں کل صوبہ پنجاب کی دیوانی پر مقرر رہا۔ اس کے بعد اس کی ملازمت شاہزادہ دارا شکوہ کی سرکار میں منتقل ہو گئی اور شہزادوں کی سرکار کا دیوان مقرر رہا۔ بیسویں سال جلوس شاہجہانی میں پھر

سے شاہی ملازمت میں واپس آ کر منصب ہزاری ذات وصد و پنجاہ سوار سے ممتاز ہوا۔

["قاموس المشاہیر" (جلد اول) ص ۱۳۰]

(۲۹) <u>محمد شریف</u> = ایران سے عہد جہانگیری میں ہندوستان آیا۔ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) میں "معتمد خاں" کے خطاب سے نوازا گیا۔ شاہجہاں کی خیر خواہی میں مشہور تھا۔ اس نے شاہجہاں کے برسر اقتدار آتے ہی عروج حاصل کیا۔ ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں انتقال ہو گیا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۴۲۳تا۴۲۴]

(۳۰) <u>دوست کام</u> = عہد شاہجہانی میں پانچ سو ذات اور اسی سوار کے منصب سے ترقی کر کے آٹھ سو ذات اور دو سو سوار کے منصب پر پہنچا نیز مختلف مقامات پر بخشی اور واقعہ نویس رہا جیسے ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں لاہور، ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) میں بنگال، ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں گجرات، ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۲ء) میں مالوہ، ۱۰۶۳ھ (۱۶۵۳ء) میں احمد آباد اور ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۷ء) میں بنگال وغیرہ۔

["The Apparatus of Empire"]

(۳۱) <u>غیرت خاں</u> = اصل نام خواجہ کامگار تھا، اور عبداللہ بہادر فیروز جنگ کا بھتیجا تھا۔ ۱۰۳۹ھ (۱۶۲۹ء) میں ایک ہزاری ذات اور ۴۰۰ سوار کے منصب پر فائز ہوا۔ ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۱ء) میں منصب میں اضافے کے ساتھ بادشاہ نے "غیرت خاں" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۸۵۸_۸۶۰]

(۳۲) <u>اعظم خاں کوکہ</u> = اصل نام مظفر حسین تھا اور خان جہاں بہادر کوکلتاش کا چھوٹا بھائی تھا۔ ۹ ربیع الآخر ۱۰۸۹ھ (۲۱ مئی ۱۶۷۸ء) کو اس کا ڈھاکہ میں انتقال ہو گیا۔

["مآثر الامراء" (انگلش ترجمہ) جلد اول ص ۳۱۱تا۳۱۳]

(۳۳) <u>سعید خاں بہادر ظفر بیگ</u> = وہ امیر غیاث الدین خان جو امیر تیمور کے سرداروں میں سے ایک تھا، کی اولاد سے نیز شجاعت و دلیری و حسن تدابیر اور دانشمندی میں بے مثال تھا۔ جہانگیر کے عہد میں کابل میں تعینات رہا۔ شاہجہاں کے عہد میں دو ہزاری منصب سے ترقی کرتا کرتا سہ ہزاری ذات اور دو ہزار سوار کے منصب کے علاوہ کئی صوبوں میں صوبیدار رہا۔ ۲ صفر المظفر ۱۰۶۲ھ [۳ جنوری ۱۶۵۲ء] کو اس کا انتقال ہو گیا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۴۳۳_۴۴۰]

(۳۴) مہیش داس راٹھور = راجہ سورج سنگھ کا بھتیجا اور دلپت سنگھ کا لڑکا تھا۔ ابتداً مہابت خان خانخاناں کے یہاں نوکری کی اور بہادری دکھائی۔ خان مذکور کے انتقال کے بعد ۱۰۴۳ھ (۱۶۳۴ء) میں شاہی ملازمت اختیار کرلی اور ۵۰۰ ذات اور ۴۰۰ سوار کا منصب ملا۔ اس کے بعد لگاتار ترقی کرتا چلا گیا۔ ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) میں انتقال ہوگیا۔

["ماثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۳۷۵، ۳۷۶]

(۳۵) بہادر خان باقی بیگ = ابتداً وہ شہزادہ داراشکوہ کا نجی ملازم تھا۔ ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں دو ہزاری ذات اور ۵۰۰ سوار کے منصب کے ساتھ ساتھ "عزت خاں" کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) میں وہ شاہی لشکر میں شامل ہوگیا۔ ۱۰۶۳ھ (۱۶۵۳ء) میں چار ہزاری ذات اور ۲۵۰۰ سوار کے منصب کے ساتھ "بہادر خاں" کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ ["ماثر الامراء" جلد اول (انگلش ترجمہ) ص ۳۳۸ تا ۳۴۰]

(۳۶) سید عزت خاں عبدالرزاق گیلانی = ابتداً شہزادہ داراشکوہ کا متوسل تھا۔ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں شہزادہ کی سفارش پر "غیرت خاں" کا خطاب ملا۔ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں بہادر خاں کی جگہ لاہور کی حفاظت پر مامور ہوا۔ جب سموگڑھ کے مقام پر داراشکوہ اورنگ زیب سے شکست کھا کر لاہور، اور پھر وہاں سے بھی ملتان فرار ہوگیا تو وہ شہزادہ مذکور کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب سے جاملا۔

["ماثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۴۷۸]

(۳۷) باقی بیگ = ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں ایک ہزار ذات اور چار سو سوار کے منصب سے ترقی کرتا کرتا ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) تک چار ہزار ذات اور دو ہزار پانچ سو سوار کے منصب تک پہنچا اور اس دوران ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں نائب صوبیدار الہ آباد، گجرات ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۰ء) میں حارث احمد آباد، نائب صوبیدار گجرات ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۱ء) میں نائب صوبیدار لاہور اور ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں نائب صوبیدار بہار رہا۔ نیز ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) میں "غیرت خان" اور ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) میں "بہادر خان" کے خطابات سے نوازا گیا۔ ["The Apparatus of Empire"]

(۳۸) مہابت خان محمد ابراہیم = وہ ایرانی النسل اور دکنی (حیدرآباد) تھا۔ عالمگیری عہد

میں سات ہزار ذات اور چھ ہزار سوار کے منصب پر فائز رہا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۸۱۵، 'The Mughal Nobility Under Aurangzeb']

(۳۹) خان جہاں بہادر ظفر جنگ = اس کا نام میر ملک حسین اور اس کے والد کا نام میر ابو المعالی خوافی تھا۔ ۱۹ ر جمادی الاول ۱۱۰۹ھ (۲۳ ر نومبر ۱۶۹۷ء) کو اس کا انتقال ہوا۔

[''مآثر الامراء'' (انگریزی ترجمہ) جلد اول ص ۸۳ سے ۹۰]

(۴۰) مظفر حسین کوکہ = اس کی زیر نگرانی لاہور کی بادشاہی مسجد تعمیر ہوئی۔

(۴۱) محمد امین خان = معظم خاں میر جملہ اردستانی کا لڑکا تھا۔ ابراہیم خاں کی جگہ پر لاہور کا صوبیدار مقرر رہا۔ ۸ ر جمادی الآخر ۱۰۹۳ھ (۴ ر جون ۱۶۸۲ء) کو احمد آباد میں اس کا انتقال ہو گیا۔ [''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۵۰۹۔ ۵۱۴]

(۴۲) قوام الدین خاں اصفہانی = وہ ایران کے مشہور وزیر اعظم خلیفہ سلطان کا بھائی تھا۔ جب بھائی وزیر اعظم ہوا تو وہ بھی ایران کی صدارت کے منصب پر فائز ہو گیا جو اس ملک کا بہترین منصب تھا لیکن بعد میں سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان آ گیا اور ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴ء) میں عالمگیر کی ملازمت میں داخل ہوا۔ ۱۰۹۱ھ (۱۶۸۰ء) میں اس کی جگہ شہزادہ محمد اعظم شاہ لاہور کا صوبیدار مقرر ہوا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۹۹ تا ۱۰۱ اور ۲۲۸]

(۴۳) لطف اللہ خاں = وہ جملۃ الملک سعد اللہ خاں (وزیر اعظم شاہجہان بادشاہ) کا فرزند، لاہور کے مضافاتی علاقے، چنیوٹ کا رہنے والا اور انصاری النسب تھا۔ (تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' کی جلد اول ''تاریخ دودمان عالی'' ملاحظہ فرمائیں۔) جب والد کا انتقال ہوا تو اس کی عمر محض گیارہ سال تھی۔ شروع میں اس کو ۲۰۰ ذات اور ۱۰۰ سوار کا منصب مرحمت ہوا۔ اس کے بعد عہد عالمگیری میں اس نے بہت ترقی کی۔ جب شہزادہ محمد اعظم صوبیدار لاہور ہوا تو اس کو شہزادہ کا نائب مقرر کیا۔ سنہ ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۲ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۱۴۷ تا ۱۵۴]

(۴۴) کامگار خاں = جعفر خاں کا دوسرا لڑکا تھا۔ عالمگیر کی سلطنت کے آغاز میں اسے مناسب منصب ملا۔ ۵-۱۰۷۵ھ (۱۶۶۴ء) میں ایک ہزاری ذات اور دو سو سوار کے منصب کے ساتھ "خان" کے خطاب سے نوازا گیا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۱۳۷ تا ۱۳۸]

(۴۵) خلیل اللہ خاں = جس سال عالمگیر، شجاع سے مقابلے کے ارادے سے ملتان سے واپس ہوا، اسی سال خلیل اللہ خاں کو لاہور کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۵۱۳]

(۴۶) میر محمد کاظم خاں = صاحب "مآثر الامراء" کا دادا اور میرک معین الدین امانت خاں کا فرزند تھا۔ ۱۱۳۵ھ (۲۳-۱۷۲۲ء) میں انتقال ہو گیا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۵۹۲ تا ۵۹۸]

(۴۷) صمصام الدولہ شاہنواز خاں = اصل نام میر عبدالرزاق تھا۔ خواف کے سید خاندان سے تھا۔ اکبر کے عہد میں اس کے بزرگ، میر کمال الدین خواف سے ہندوستان وارد ہوئے اور شاہی ملازمت اختیار کر لی۔ میر کمال الدین کے فرزند، میرک حسین جہانگیر کے عہد میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے اور میرک حسین کے فرزند، میرک معین الدین کو شاہجہاں کے عہد میں "امانت خان" کے خطاب سے نوازا گیا۔ عالمگیر کے عہد میں وہ لاہور، ملتان اور کابل کا دیوان مقرر ہوا۔ وہ ۹ رمضان ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) کو لاہور میں پیدا ہوا، نشو و نما اورنگ آباد (دکن) میں ہوئی اور ۳ رمضان ۱۱۷۱ھ (۱۱ مئی ۱۷۵۸ء) کو شہید کر دیا گیا۔ شاہ نور کے مزار کے متصل اورنگ آباد (دکن) میں قبر واقع ہے۔

["مآثر الامراء" (انگریزی ترجمہ) جلد اول ص ۱۲ تا ۴۴]

(۴۸) اللہ یار خاں = ترکی النسل اور خاندان برلاس سے تھا۔ عہد عالمگیری میں صوبیدار لاہور، ٹھٹھہ اور ملتان رہا۔ اس کے بعد غزنی کی فوجداری پر تقرر ہو گیا۔

["قاموس المشاہیر" جلد اول ص ۴۷]

(۴۹) احمد یار خاں = اللہ یار خاں کا لڑکا تھا۔ عالمگیر کے عہد کے آخر میں صوبیدار لاہور رہا۔ بہت نازک خیال شاعر تھا۔ کئی نظمیں لکھیں۔ ۲۳ رجمادی الاول ۱۱۴۷ھ (۲۱ ستمبر

۱۷۳۴ء) کو وفات پائی۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد اوّل ص ۷۴]

(۵۰) سیف الدولہ عبد الصمد خاں = وہ خواجہ عبید اللہ احرار کی اولاد سے، خواجہ عبد الکریم کا لڑکا، خواجہ زکریا کا بھتیجا و داماد نیز اعتماد الدولہ محمد امین خاں کا ہم زلف تھا۔ عالمگیر کے عہد میں ہندو روہوا اور ۴۰۰ کے منصب پر فائز ہوا۔ بہادر شاہ اوّل کے عہد میں ۷۰۰ کے منصب پر پہنچا۔ فرخ سیر کے عہد میں پانچ ہزاری ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب، ''دلیر جنگ'' کا خطاب اور لاہور کی صوبیداری پر فائز ہوا۔ بعد میں سکھوں کی بغاوت کے قلع قمع کرنے پر سات ہزاری ذات اور سات ہزار سوار کے منصب کے ساتھ ''سیف الدولہ'' کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں اس کا انتقال ہوگیا۔ [''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۵۱۲ تا ۵۲۰]

(۵۱) زکریا خاں [المعروف بہ سیف الدولہ بہادر ہزبر جنگ] = وہ عبد الصمد خاں کا فرزند اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کا بہنوئی تھا۔ والد کے بعد وہ صوبیدار لاہور مقرر رہوا۔ اس کا حسنِ انتظام اور عدل گستری مشہور ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں جب ۱۷۳۹ء میں فارس کے حکمران، نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ خود اس مقابلے کی قوت نہ دیکھ کر نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ ۱۲؍ جمادی الثانی ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) کو اس کا انتقال ہوگیا۔
[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۱۰۳ تا ۱۰۴]

(۵۲) شہ نواز خاں = وہ زکریا خاں بن عبد الصمد خاں کا لڑکا تھا۔ ۱۲؍ جمادی الثانی ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) کو باپ کے انتقال کے بعد اس کی جگہ پر صوبیدار لاہور مقرر رہو۔
[''قاموس المشاہیر'' جلد اوّل ص ۲۵۷]

(۵۳) معین الملک = وہ قمر الدین خاں وزیر الملک کا فرزند تھا۔ تفصیلات ص پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۴) میر مومن = تفصیلات ص ۱۴۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۵) میر منعم = تفصیلات ص ۱۴۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۶) تیمور شاہ = تفصیلات ص ۱۴۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۷) آدینہ بیگ خاں = چنو آرین کا لڑکا تھا۔ لاہور کے نزدواقع سرک پور میں پیدا ہوا اور مغلیہ خاندان میں پرورش پائی نیز فنِ حساب میں ماہر تھا۔ ۱۷۵۸ء میں افغانوں کو لاہور کے نزدیک شکست دی۔ ہوشیار پور کے نزدواقع خان پور میں مرا اور کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔ اس کا شاندار مقبرہ اب تک موجود ہے۔ [''قاموس المشاہیر'' (حصہ اوّل) ص ۲]

(۵۸) رنجیت سنگھ = تفصیلات ص ۵۰ اپر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۹) راجہ ٹوڈرمل = ذات کا کھتری تھا۔ وطن کی بابت اختلاف ہے۔ بعض قصبہ لاہر پور (ضلع سیتاپور) کا، تو بعض لاہور کا بتاتے ہیں۔ بیوہ ماں نے بہت تنگ دستی سے پرورش کی۔ شروع میں اکبر کے عام منشیوں میں داخل ہوا اور پھر اپنی قابلیت اور محنت سے ترقی کرتے کرتے وزارت کی مسند پر بیٹھ کر دیوان کل ہوگیا۔ ۹۹۳ھ (۱۵۸۹ء) میں چہار ہزاری منصب پر فائز ہوا۔ ۱۱ محرم الحرام ۹۹۸ھ (۱۰ نومبر ۱۵۸۹ء) کو ایک کھتری نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۱۵۹]

(۶۰) شیخ مبارک ناگوری = تفصیل احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' کی جلد سوم، ''منبع الاسرار'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۶۱) شاہ بیگ خان کابلی = عہد اکبری کا ایک امیر تھا۔ ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء) میں اس کو جہانگیر نے ''خان دوراں'' کا خطاب عطا فرما کر کابل کا صوبیدار مقرر کیا۔ ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰۲۹ھ (۱۶۱۹ء) میں لاہور میں انتقال ہوا۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۲۰۸]

(۶۲) اسد خاں ماموری = عبدالوہاب خاں عنایتی کا لڑکا اور مظفر خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ عہد جہانگیری میں صوبہ دار قندھار ہوا اور دوسرے سال جلوس شاہجہانی میں لکھی جنگل (سندھ) کا فوجدار مقرر ہوا۔ [''مآثر الامراء'' جلد اول (انگلش ترجمہ) ص ۲۶۹]

(۶۳) خواجہ ابوالحسن تربتی = تربت، خراسان کا ایک ضلع ہے۔ اسی نسبت سے تربتی کہلایا۔ ۱۶۱۳ء میں میر بخشی ہوا اور اعتماد الدولہ کے انتقال پر چیف دیوان بنا اور پانچ ہزاری منصب ملا۔ ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

[''مآثر الامراء'' جلد اول (انگلش ترجمہ) ص ۱۲۸ تا ۱۳۰]

(۶۴) صف شکن خاں مرزا لشکری = سید یوسف خاں رضوی کا لڑکا تھا۔ والد کے انتقال پر تھانیداری پر مقرر ہوا اور جہانگیر کے عہد میں ''صفدر خاں'' کا خطاب ملا اور صوبہ بہار کے جاگیرداروں میں شامل ہوا۔ چھٹے سال جلوس جہانگیری میں صوبہ دار کشمیر مقرر ہوا۔ عہد شاہجہانی میں ''صف شکن خاں'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

[''مآثر الامراء'' جلد اول (اردو ترجمہ) ص ۷۳۰ تا ۷۳۲]

(۶۵) خانِ جہاں بارہہ = اصل نام سید مظفر تھا جو بارہہ ضلع مظفر نگر کا رہنے والا اور چھ ہزاری دار تھا۔ بعہد شاہجہانی لاہور میں ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں انتقال ہوا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۲۰۹]

(۶۶) خانِ دوراں نصرت جنگ = لاہور سے ۴ کلومیٹر مشرق میں واقع چنت گڑھ میں مقبرہ واقع تھا۔

(۶۷) علی مردان خاں = کردوں کے قبیلے سے اور گنج علی خاں (م ۱۶۲۵ء) کا لڑکا تھا۔ گنج علی خاں، شاہ ایران کی طرف سے کرمان کا حاکم رہا۔ وہ شاہ کی طرف سے قندہار کا صوبیدار مقرر ہوا لیکن بعد میں شاہ کے ظلم سے فرار ہو کر دہلی آ گیا۔ ۱۶۳۹ء میں اسے ہفت ہزاری ذات اور ہفت ہزار سوار کا منصب اور کشمیر کی صوبیداری کے ساتھ ساتھ پنجاب کی صوبیداری بھی عطا ہوئی ۱۶۴۲ء میں ''امیر الامراء'' کے خطاب کے ساتھ ساتھ ایک کروڑ دام اور لاہور میں اعتقاد خاں کی حویلی عنایت ہوئی۔ چھواڑہ کے مقام پر ۱۶/ اپریل ۱۶۵۷ء [۱۲/ رجب ۱۰۶۷ھ] کو انتقال ہوا لیکن سپرد خاک لاہور میں والدہ کے مقبرہ میں ہو۔

[''قاموس المشاہیر'' (جلد دوم) ص ۹۲ ''مآثر الامراء'' جلد اول (انگلش ترجمہ) ص ۹۹ تا ۱۰۱]

(۶۸) ظفر خاں احسن اللہ = خواجہ ابوالحسن تربتی کا لڑکا تھا۔ جب انیسویں صدی سال جلوس جہانگیری میں اس کے والد کو کابل کی صوبیداری ملی تو وہ باپ کی نیابت میں وہاں کی حکومت پر مقرر ہوا نیز ۱۵۰۰ ذات اور ۶۰۰ سوار کے منصب کے ساتھ ''ظفر خاں'' کے خطاب، علم، خنجر، شمشیر مرصع اور ہاتھی مرحمت ہوا۔ وہ پستہ قد لیکن عقل و تدبیر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) میں لاہور میں انتقال ہوا اور والد کے مقبرہ میں دفن ہوا۔

[''مآثر الامراء'' جلد دوم (اردو ترجمہ) ص ۷۵۱ تا ۷۵۸]

(۶۹) ملا علاء الملک تونی [المخاطب بہ فاضل خاں] = وہ طبیعی اور ریاضی علوم میں یکتائے زمانہ تھا، خاص طور سے علم ہیئت اور نجوم میں۔ ساتویں سال جلوس شاہجہانی میں وہ ایران سے ہندوستان آیا اور نواب آصف جاہ سے وابستہ ہو گیا اور بحیثیت مصاحب اس کے ساتھ رہنے لگا۔ نواب کے انتقال کے بعد پندرہویں سال جلوس شاہجہانی میں وہ بادشاہی ملازمت میں شامل ہو گیا اور

۵۰۰ ذات اور ۵۰ سوار کا منصب ملا۔ دوسرے سال جلوس عالمگیری میں اسے ۳۰۰۰ ذات اور دو ہزاری سوار کا منصب ملا۔ اور پانچویں سال عالمگیری میں پانچ ہزاری منصب ملا۔

[''مآثر الامراء'' جلد سوم (اردو ترجمہ) ص ۴۴۰ تا ۴۴۳]

(۷۰) پشوتن = شیخ عبدالرحمن الملقب بہ ''افضل خاں'' بن ابوالفضل کا لڑکا تھا۔ نام اکبر بادشاہ نے رکھا تھا۔ شیخ حبیب اللہ کی دعاؤں سے پیدا ہوا تھا۔ (تفصیل احقر کی کتاب ''سید عبدالرحمن بن فضل اللہ'' میں ملاحظہ فرمائیں۔)

(۷۱) ستی النساء = ملک الشعراء طالب آملی کی بہن تھی۔ عہد جہانگیری میں بھائی سے ملنے ایران سے ہندوستان آئی۔ شادی نصیرائی کاشی جو مرزا صائب کا استاد اور حکیم کاشی کا بھائی تھا، سے ہوئی تھی۔ نصیرائی کی وفات کے بعد ممتاز محل کی پیش خدمت مقرر ہوئی۔ نہایت قابل، خوش تقریر اور فن قرأت کی ماہرہ تھی اور خانہ داری کا خاص سلیقہ رکھتی تھی۔ علم طب میں بھی مہارت تھی۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر جہاں آرا کی معلمہ مقرر ہوئی۔ ممتاز محل کے انتقال کے بعد شاہجہاں نے اس کو حرم شاہی کا مدارالمہام مقرر کر دیا تھا۔ انتقال لاہور میں ہوا لیکن شاہجہاں نے آگرہ میں دفن کرایا۔ ممتاز محل کی قبر سے مغرب کی سمت میں، جلو خانے کے متصل مقبرہ واقع تھا جو تیس ہزار روپیہ کی لاگت سے شاہجہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ اور ایک گاؤں بھی مقبرے کے اخراجات کے لئے عطا کر دیا تھا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد اوّل ص ۲۶۵]

(۷۲) فاضل خاں = عالمگیر کا وزیر تھا جو ۱۱ر ذیقعدہ ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) کو خلعتِ وزارت سے سرفراز ہوا۔ وہ نام ہی کا نہیں بلکہ فی الحقیقت فاضلِ اجل اور جامع علوم دینی و دنیوی تھا۔ خاص کر علمِ نجوم میں اسے کامل دستگاہ تھی۔ منصب وزارت پر سرفراز ہونے سے سولہ روز بعد ہی پیامِ اجل آیا اور ۲۷ر ذیقعدہ کو فوت ہو گیا۔ اس نے لاہور میں جو پہلے ہی سے مقبرہ تعمیر کرایا ہوا تھا، اسی میں دفن ہوا۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد دوم ص ۱۰۷]

"تمام ہندوستان پر انوار و تجلیات کی بارش **لاہور** سے ہو رہی ہے۔"

[حضرت مجدد الف ثانیؒ]

[۳] لاہور کے چند معروف صوفیا کرام

(۱) جن کے مزارات پر حاضری ممکن ہو سکی

سرحلقہ جملہ اقطاب محرم از جمیع ابواب، معشوق بہ اوصاف معنوی

شیخ علی بن عثمان بن علی الجلابی الغزنویؒ

[المعروف بہ داتا گنج بخش علی ہجویریؒ] [م ۴۶۳ھ (۱۰۷۱ء) ۱۵ صفر المظفر بروز یکشنبہ]

آپ کے والد بزرگوار کا نام شیخ ابو علی عثمانؒ (ہجویری جلابی غزنوی) تھا جو افغانستان کے مشہور شہر غزنی کے رہنے والے تھے۔ ایک دوسرے قول کے مطابق آپ کے آباؤ اجداد غزنی کے قریب واقع قصبہ ھجویر کے رہنے والے تھے۔ اس وجہ سے آپ کو ہجویریؒ بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کی کنیت ابوالحسن اور لقب داتا گنج بخش ہے۔ آپ کی والدہ سیدنا حضرت امام حسینؓ کی اولاد سے اور ایک ولیہ خاتون تھیں جن کا مزار مبارک غزنین میں واقع اور مرجع خلائق ہے۔ آپ کے ماموں بھی ایک ولی اللہ گزرے ہیں جو شیخ تاج اولیاءؒ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا مزار مبارک بھی غزنین میں زیارت گاہ خلق ہے۔ مذکورہ دونوں مزارات باہم متصل ہیں۔ شہزادہ دارا شکوہ اپنے والد، شہنشاہ شاہجہاں کے ہمراہ ان مزارات پر حاضری دے آیا ہے۔ آپ کے والد سیدنا حضرت امام

حسنؓ کی اولاد سے اور صوفی منش انسان تھے۔ اس طرح آپ خاندانی اعتبار سے حسنی۔ حسینی سید ہوئے۔

کہتے ہیں کہ جلاب اور ہجویر، غزنی شہر کے دو مشہور محلوں کے نام ہیں۔ آپ پیدا تو جلاب میں ہوئے لیکن خاندان کے ہجویر میں نقلِ مکانی کر جانے پر پرورش ہجویر میں ہوئی۔ اس لئے آپ کے نام کے ساتھ جلابی یا ہجویری الفاظ لگائے جاتے ہیں۔

آپ کی سنِ ولادت کے بارے میں محققین کے درمیان اختلاف رائے ہے جو سنہ ۳۸۱ھ (۹۹۱ء) سے ۴۰۱ھ (۱۰۱۰ء) کے درمیانی عرصے میں بتایا جاتا ہے۔ زیادہ تر کا اتفاق سنہ ۴۰۰ھ (۱۰۰۹ء) پر ہے۔

آپ ایک جید عالم و عارف اور صاحبِ صحو (۱) بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا ''میرے شیخ ''جنیدی'' مسلک رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ سکر (۲) بچوں کا کھیل ہے جب کہ صحو مردوں کا کارنامہ۔ میں اپنے شیخ کے قدم بہ قدم ہوں کہ صاحبِ سکر کمال حال صحو ہوتا ہے اور ادنیٰ درجہ صحو کا، دیدار سے محرومی ہے کیوں کہ بشریت کا حجاب غالب ہے۔ پس وہ صحو جو آفت معلوم ہو، وہ عین سکر سے بدرجہا بہتر ہے۔'' آپ امام اعظم ابو حنیفہ کوفیؒ کے پیرو اور شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی الجنیدیؒ (۳) کے مرید تھے اور آپ نے شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ (۴)، شیخ ابوالقاسم قشیریؒ (۵) اور شیخ ابوالقاسم گورگانیؒ (۶) وغیرہ متعدد بزرگوں سے ملاقاتیں کیں اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔ آپ خواجہ احمد حمادّ سرخسیؒ (۷) اور خواجہ ادیب کندیؒ (۸) کے ہم عصر تھے۔

آپ کے خوارق و کرامات بے شمار ہیں۔ بارہا آپ نے تجرید و توکّل پر سفر کیا۔ کافی سیر و سیاحت کے بعد، مصائب و مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آپ سلطان مسعود ابن محمود غزنوی (۹) کے آخیر عہد حکومت [سلطان مسعود کو ۴۳۲ھ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس نے ۹ سال ۹ ماہ حکومت کی۔ اس طرح اس کا دورِ حکومت ۴۲۳ھ تا

۴۳۳ھ بیٹھتا ہے۔] میں [۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) میں] دو ساتھیوں، حضرت بوسعید اور حضرت سید حماد کے ہمراہ لاہور وارد ہوئے (۱۰) اور وہاں کی سکونت اختیار کی۔ ان دنوں سرزمین لاہور بدترین حالات سے دوچار تھی۔ ہر طرف بدعقیدگی، بت پرستی، شعبدہ بازی اور جادوگری کا دور دورہ تھا۔ گرچہ آپ سے پہلے سید فخر الدین حسین زنجانی اور سید اسمٰعیل بخاریؒ (۱۱) جن کا شمار اکابر محدثین ومفسرین میں سے ہوتا ہے، ۳۹۶ھ (۱۰۰۵ء) میں لاہور تشریف لا چکے تھے اور جن کی مجلسِ وعظ میں سامعین کا ہجوم ہوتا تھا اور ہر روز صدہا مشرکین خلعت اسلام سے مشرف ہوتے تھے لیکن لاہور اور علاقے کو اسلام کا مرکز اور مضبوط قلعہ جناب آپ ہی کی شبانہ روز محنت اور مساعی جمیلہ سے نصیب ہوا۔ آپ کی برکت سے اس علاقے میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ آپ کے کمارت آج تک اظہر من الشمس ہیں۔ لاہور میں آپ نے ایک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا اور کچھ عرصے تک درس دیتے رہے۔ اس کے بعد تصنیف (۱۲) و تالیف میں مشغول ہوگئے۔ آپ کی تبلیغ کی بدولت بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ انھیں میں سے ایک راجہ بھی تھا جو سلطان مودود ابن مسعود غزنوی [۴۳۱ھ تا ۴۴۱ھ] کی طرف سے لاہور کا نائب تھا۔ اس کا نام اسلام قبول کرلینے کے بعد آپ نے شیخ ہندیؒ رکھ دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ کے مزار شریف کے خدام ومجاور اسی کی نسل سے ہیں۔

آپ سماع کے سخت مخالف تھے (۱۳) کہتے ہیں کہ آپ صاحب اشعار بھی تھے۔ بقول صاحب ''آبِ کوثر'' آپ کا کوئی دیوان یا باضابطہ کلام تو دستیاب نہیں البتہ نثری کتابوں میں چند اشعار مل جاتے ہیں، جیسے۔

''اشتیاقت روز وشب دارم دِلا — عشقِ تو دارم نہاں و برملا
جاں بخواہم داد اندر کوئے تو — گر مرا آزار آید یا بلا
سوزِ تو دارم میانِ جان و دل — مید ہم از عشقِ تو ہر سو صدا

دلبرا از تو ہے خواهم لقا گن تو "آرے" دمکن ہرگز تو "لا"

اے علی تو فرشی درشہر و گو دہ ز عشق خویشتن ہر سو صلا"

صاحب "گلزار ابرار" نے "کشف المحجوب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ نے اپنے کلام کا ایک دیوان ترتیب دیا تھا جس کی غزلوں کے مقطع میں تخلص نہیں کہا گیا تھا۔ چنانچہ ایک بدنیت نے ان غزلیات میں اول تا آخر اپنا تخلص داخل کر دیا تھا۔

آپ کی ازدواجی زندگی سے متعلق تصویر واضح نہیں البتہ "کشف المحجوب" کے مطالعے سے ضرور اس ضمن میں کچھ روشنی پڑ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا: (ترجمہ) "گیارہ سال تک حق تعالیٰ نے مجھے شادی کی آفت سے بچائے رکھا۔ پھر تقدیر سے میں آزمائش میں ڈالا گیا۔ میرا ظاہر و باطن ایک پری صفت کا اسیر ہوا۔ بغیر اس کے کہ میں نے اسے دیکھا ہو، ایک سال تک میں اس کے خیالات میں غرق رہا۔ قریب تھا کہ یہ چیز میرے دینی معاملات میں خلل انداز ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کمال لطف و فضل سے عصمت کو دل بیچارہ کے استقبال کے لئے بھیجا اور اپنی رحمت سے مجھے اس مصیبت سے نجات دلائی۔" آپ نے اپنی تصنیف میں عورتوں کی خوب خبر لی ہے۔ لکھتے ہیں (ترجمہ) "بہشت میں سب سے پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا، اس کا اصل یہی عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا، یعنی ہابیل و قابیل کی لڑائی، اس کا سبب بھی یہی ذات شریف تھی اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا اور آج کے دن [یعنی ۵۶۵ھ (۱۱۶۹ء) کے قریب تک] دینی اور دنیاوی فتنوں کے تمام اسباب کا ذریعہ یہی عورتیں ہیں۔"

آپ کا وصال ۱۵؍صفر المظفر بروز یکشنبہ ۴۶۴ھ (۱۰۷۱ء) کو ہوا۔ [انا للہ و

انا الیہ راجعون]۔

صاحب "خزینۃ الاصفیاء" نے "علی سید ولی ہجویری" ۴۶۴ھ، "گنجینۂ اسرار محبوبی" ۴۶۴ھ، "حبیب اولیاء گنجینۂ نور" ۴۶۴ھ، "عالی قطب لاہور" ۴۶۴ھ، "گلشن دیں" ۴۶۴ھ، "پیر لاہوری" ۴۶۴ھ سے آپ کا سنہ وصال نکالا ہے۔

آپ کا مزار شریف لاہور میں مرجع خلائق ہے۔ ہر جمعرات کو خاص طور سے ہزاروں عقیدت مند آپ کے روضۂ اطہر پر حاضری دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو شخص چالیس جمعرات یا چالیس دن کامل آپ کے روضہ کا طواف کرلے، اللہ تبارک تعالیٰ اس کی ہر جائز مراد پوری کر دیتا ہے۔ احقر کو بھی حاضری کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

آپ کی عظمت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی، شیخ الاسلام شیخ فرید الدین گنج شکر، حضرت میاں میر قادری لاہوری، حضرت حاجی نوشہ گنج بخش قادری اور محدث کبیر حضرت شاہ محمد غوث قادری لاہوری جیسے بزرگ آپ کے مزار مبارک پر معتکف رہ کر فیض حاصل کر چکے ہیں۔ خواجہ بزرگ نے تو اپنی عقیدت مندی کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

علامہ اقبالؔ نے آپ کی تبلیغی خدمات کا برملا اعتراف کرتے ہوئے جو منظوم خراج تحسین پیش کیا اس کے چند اشعار پیش ہیں ؎

سید ہجویر مخدوم امم — مرقد او پیر سنجر را حرم
بندہائے کوہسار آساں گسیخت — در زمین ہند تخم سجدہ ریخت
عہد فاروق از جمالش تازہ شد — حق ز حرف او بلند آوازہ شد
پاسبان عزت ام الکتاب — از نگاہش خانۂ باطل خراب
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت — صبح ما از مہر او تابندہ گشت

سلسلۂ نسب

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ [۲۳ ق ھ (۵۹۹ء) ۔ ۴۰ھ (۶۶۰ء)]

۲۱ رمضان المبارک، شب یکشنبہ، نجف اشرف

حضرت امام حسنؓ [۲ھ (۶۲۴ء) ۔ ۵۰ھ (۶۷۰ء)]

۱۵ رمضان المبارک ۔ ۴ محرم الحرام، جنت البقیع

حضرت زیدؒ

حضرت حسین اصغرؒ (۱۴)

حضرت ابوالحسن علیؒ

حضرت شجاعؒ

حضرت عبدالرحمٰنؒ

حضرت سید علیؒ

حضرت عثمانؒ

حضرت ابوالحسن علی ہجویریؒ

[مزار شریف سے سرہانے کی جانب، چند گز کے فاصلے پر، ایک مقام کو مقامی لوگ ''قرآن محل'' کہتے ہیں۔ مذکورہ نسب نامہ ایک تختی پر کندہ متذکرہ ''قرآن محل'' میں آویزاں ہے۔]

سلسلۂ طریقت

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ [م ۴۰ھ (۶۶۰ء)] ۲۱ ر رمضان المبارک، شب یکشنبہ، نجف اشرف]

حضرت خواجہ حسن بصریؒ [م ۱۱۰ھ (۷۲۸ء)] ۴ محرم الحرام بروز سہ شنبہ صحرائے بصرہ (قریب شہر)]

حضرت حبیب عجمیؒ [م ۱۵۶ھ (۷۷۲ء)] ۱۷ ر رجب المرجب بروز جمعہ، بغداد شریف کہنہ]

حضرت سلیمان داؤد بن نصیر طائیؒ [م ۱۶۵ھ (۷۸۱ء)] ۲۸ ر ربیع الاول، بغداد شریف]

حضرت اسد الدین معروف کرخیؒ [م ۲۰۰ھ (۸۱۵ء)] ۲ ر محرم الحرام بروز یکشنبہ، بغداد شریف کہنہ

حضرت شیخ سری سقطیؒ [م ۲۵۰/۲۵۳ھ (۸۶۴/۶۷ء)] ۳ ر رمضان المبارک، بروز پنجشنبہ، بغداد شریف کہنہ، گورستان سونیزیہ]

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ [م ۲۹۷ھ (۹۰۹ء)] ۵ ر ربیع الاول بروز چہار شنبہ، بغداد شریف کہنہ]

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ [م ۳۳۴ھ (۹۳۵ء)] ۲۶ ر ذی الحجہ بروز پنجشنبہ، بغداد شریف کہنہ]

حضرت شیخ ابوالحسن حُصریؒ [م ۳۷۱ھ (۹۸۱ء)] ذی الحجہ بروز جمعہ، بغداد شریف کہنہ]

حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ [م ۴۶۰ھ (۱۰۶۷ء)]

حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ
[م ۴۶۴ھ (۱۰۷۱ء)] ۱۰ ر صفر المظفر]

سید فخر الدین حسین زنجانیؒ
[م ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء)] ۱۹ ر شعبان المعظم]

شیخ ہندیؒ

(روحانی)

سید شادی شاہ قادریؒ
[م ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۵ء)] لاہور]

سید شاہ غلام نبیؒ
[م ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء)]

شیخ حسین لاہوریؒ
[م ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء)] لاہور]

اشاریہ

(۱)،(۲) **صحو، سُکر** = تفصیل کے لیے احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) **شیخ ابوالفضل بن حسن الختلیؒ** = آپ ختلان کے رہنے والے تھے اسی لیے ختلی کہلائے اور وصال بیت الجن میں ہوا جو عقبہ کے علاقے میں دمشق کے قریب ایک قصبہ ہے۔آپ علم تفسیر، روایات و آیات کے زبردست عالم تھے۔آپ کی کرامات بہت مشہور ہیں۔آپ ساٹھ سال تک گوشہ نشین رہے اور خلقت سے بھاگتے رہے یہاں تک کہ آپ نے اپنا نام تک گم کر دیا تھا۔آپ اکثر قبرستان میں رہتے تھے اور درویشانہ رسوم ولباس اختیار نہیں کرتے تھے۔چہرہ بہت بارعب و جلال تھا۔جس وقت ۴۶۰ھ (۱۰۶۷ء) میں آپ کا وصال ہوا سر داتا گنج بخشؒ کی گود میں تھا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) میں لاہور وارد ہوئے اور شیخ ابوالفضل کا وصال ۴۶۰ھ (۱۰۶۷ء) میں بیت الجن میں ہوا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخش لاہور وارد ہونے کے بعد بھی حضرت شیخ ابوالفضل کے پاس جاتے رہے تھے۔

(۴) **شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ** = تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

منقول ہے کہ ایک بار داتا گنج بخشؒ قصبہ مہنہ میں شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کے مزار کے پاس بیٹھے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک کبوتر اڑتا ہوا آیا اور شیخ کے مزار کے غلاف کے نیچے چلا گیا۔جب داتاؒ نے غلاف اٹھا کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا تو داتاؒ متعجب ہوئے۔رات کو خواب میں جب داتاؒ نے شیخ سے یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ کبوتر میرے معاملہ کی صفائی ہے جو روزانہ میری قبر میں داخل ہوتی ہے۔ [''مرآۃ الاسرار'' (اردو ترجمہ) ص ۴۸۲]

(۵) **شیخ ابوالقاسم قشیریؒ** = تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم

("منبع الاسرار") میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۶) **شیخ ابوالقاسم گورگانیؒ** = تفصیلات احقر کی کتاب "تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ" جلد سوم ("منبع الاسرار") میں ملاحظہ فرمائیں۔

ایک بار حضرت داتا گنج بخشؒ نے چند درویشوں کی موجودگی میں شیخ ابوالقاسم گورگانیؒ سے پوچھا کہ درویش (۱۵) کے لیے کم از کم کیا ضروری ہے تاکہ فقر (۱۶) کا سزاوار ہو سکے۔ شیخ نے فرمایا کہ تین چیزیں بہت ضروری ہیں۔ اول صحیح گدڑی سی سکے، دوم صحیح بات کہہ اور سن سکے نیز سوم صحیح قدم زمین پر رکھ سکے۔ اس کے بعد داتاؒ نے موجود درویشوں سے کہا کہ وہ فرداً فرداً اس موضوع پر کلام کریں۔ جب سب بول چکے تو حضرت داتاؒ نے فرمایا کہ صحیح گدڑی سینے کا مطلب یہ ہے کہ گدڑی فقر کے لیے سیے نہ کہ زینت کے لیے۔ جب گدڑی فقر کے لیے سی جائے گی اگرچہ وہ ٹیڑھی بھی ہو تو صحیح سی جائے گی۔ صحیح سخن سے مراد ہے کہ اس کے اندر حال ہو نہ صرف قال یعنی ازروئے تحقیق ہو نہ از گمان، اور سخن وجدانِ حق سے خالی نہ ہو اور زندگی پر حاوی ہو، ریاکاری اور دکھاوا نہ ہو۔ صحیح قدم زمین پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ وجد حق کے ساتھ گامزن ہو نہ کہ لہو ولعب کے ساتھ۔ داتاؒ کی اس تشریح پر شیخؒ نے فرمایا کہ علی نے بالکل درست کہا ہے۔ ["مرآۃ الاسرار" (اردو ترجمہ) ص ۳۸۲]

(۷) **خواجہ احمد حماد سرخسیؒ** = آپ عابدانِ وقت اور مجذوبانِ وقت میں سے ہوئے ہیں۔ منقول ہے کہ ایک بار حضرت داتا گنج بخشؒ نے ان سے ان کی توبہ کی ابتداء کی بابت معلوم کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایک بار میں سرخس سے اونٹ پر سوار ہو کر صحرا کی سمت گیا اور ایک مدت تک وہیں رہا۔ وہاں میں ہمیشہ بھوکا رہتا تھا اور اپنا کھانا دوسروں کو دے دیتا تھا۔ مجھے درویشوں سے بہت عقیدت تھی۔ ایک دن ایک شیر نے میرا ایک اونٹ مار ڈالا اور پہاڑی پر چڑھ کر آوازیں دینے لگا۔ اس کی آواز کو سن کر تمام جانور جمع ہو گئے۔ شیر نے اونٹ کو پھاڑا اور بنا کچھ کھائے پھر سے پہاڑی پر جا بیٹھا۔ تمام جانوروں نے پیٹ بھر کر اونٹ کھایا اور پھر وہاں سے چلے گئے۔ اس کے بعد شیر پہاڑی پر سے اترا اور اونٹ کو کھانے لگا کہ اسی دوران ایک لومڑی آئی۔ اسے دیکھ کر شیر پھر سے پہاڑی پر چلا گیا۔ لومڑی نے پیٹ بھر کر

اونٹ کھایا اور وہاں سے چلی گئی۔ تب شیر دوبارہ پہاڑی پر سے آیا اور اس نے بچا کھچا اونٹ کھایا۔ میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ جاتے وقت شیر نے فصیح زبان سے مجھ سے کہا "اے احمد! کتوں کا ایثار لقمہ ہے اور مردوں کا ایثار جان ہے۔" میں نے شیر سے یہ بات سنی تو تمام کاموں سے دست بردار ہو گیا۔

["مرآۃ الاسرار" (اردو ترجمہ) ص ۴۸۲، "نفحات الانس" (اردو ترجمہ) ص ۵۵۲]

(۸) **خواجہ ادیب کندیؒ** = آپ بیس سال تک کھڑے رہے اور نماز میں تشہید (التحیات) کے سوا کبھی نہ بیٹھے۔ پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ ابھی میں اس منزل اور مرتبہ پر نہیں پہنچا کہ خداوند قدوس کے مشاہدے میں بیٹھا کروں۔

["مرآۃ الاسرار" (اردو ترجمہ) ص ۴۸۳، "نفحات الانس" (اردو ترجمہ) ص ۵۵۳]

(۹) **سلطان مسعود ابن محمود غزنوی** = سلطان کو ۴۳۳ھ (۱۰۴۱ء) میں قتل کر دیا گیا۔ اس نے ۹ سال ۹ ماہ حکومت کی۔ تفصیلات احقر کی کتاب "تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ" جلد چہارم ("تذکرۂ جہانیاں") میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۰) آپ اپنے دوستوں (پیر بھائیوں) حضرت ابو سعیدؒ اور حضرت سید حماد لطفیؒ کے ہمراہ لاہور میں وارد ہوئے اور پہلی شب لاہور کے شمال میں دریائے راوی کے کنارے بسر کی۔ صبح کو لاہور شہر میں داخل ہوئے۔ اسی دن حضرت سید حسین زنجانیؒ، قطب لاہور کا وصال ہو گیا۔ چنانچہ ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت فرمائی۔ اس کے بعد شہر کے مغربی حصہ میں تشریف لے جا کر اسلامی پرچم نصب کر کے فرمایا کہ یہ پرچم اسی طرح اس سرزمین پر انشاء اللہ لہراتا اور سایہ فگن رہے گا۔ [اب دریائے راوی اپنے پرانے مقام سے کافی ہٹ چکا ہے۔]

(۱۱) **علامہ سید اسمٰعیل بکاریؒ** = لاہور اور خطۂ پنجاب میں سب سے پہلے جس مبلغ اسلام کا نام آتا ہے وہ علامہ سید اسمٰعیل کا ہے۔ آپ سلطان محمود غزنوی کے عہد حکومت [۳۸۶ھ تا ۴۲۱ھ] میں غالباً ۳۹۶ھ (۱۰۰۵ء) میں لاہور وارد ہوئے تب لاہور پر ایک ہندو راجہ حکومت کرتا تھا اور سلطان محمود کو خراج دیتا تھا۔

آپ علومِ ظاہری اور باطنی، دونوں میں دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی مجلس وعظ میں سامعین کا ایک اژدہام ہوتا تھا اور ہر روز صد ہا مشرکین بگوشۂ اسلام ہوتے تھے۔

۴۶۸ھ (۱۰۵۶ء) میں وصال ہوا۔ مزار شریف لاہور میں واقع ہے "مقتدیٰ محبوب" اور "پیرو جیہا اسماعیل" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

["خزینۃ الاصفیاء" ص ۸۸۴، "آب کوثر" ص ۸۴]

(۱۲) حضرت داتا گنج بخشؒ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً "کشف المحجوب"، "کشف الاسرار"، "منہاج الدین"، "البیان لاہل العیان" وغیرہ وغیرہ۔ یہ کتابیں اس وقت لکھی گئیں جب تصوف کی مشہور کتابیں مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی "عوارف المعارف" اور شیخ ابن العربیؒ کی "فصوص الحکم" نہیں لکھی گئی تھیں۔ ["آب کوثر" ص ۸۷]

"کشف المحجوب" آپ نے اپنے رفیق شیخ ابوسعید ہجویریؒ کی خواہش پر لکھی تھی۔ شیخ ابوسعید آپ کے ہمراہ غزنی سے لاہور تشریف لائے تھے۔ "کشف المحجوب" کے بارے میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا فرمانا ہے کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کو چاہئے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔ اس کی برکت سے اسے مرشد مل جائے گا۔

(۱۳) **سماع**:۔ تفصیل احقر کی کتاب "تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ" جلد سوم ("گنج الاسرار") میں ملاحظہ فرمائیں۔

منقول ہے کہ کرمان میں ایک دفعہ حضرت داتا گنج بخشؒ شیخ ابواحمد مظفرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سفر کے کپڑے تھے اور پریشان حال تھے۔ شیخؒ نے ان سے پوچھا کہ اے ابوالحسنؒ! تمہیں کس چیز کی خواہش ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے اس وقت سماع کی طلب ہے۔ پس قوال بلا لیا گیا۔ درویشوں کی ایک جماعت بھی آ گئی۔ سماع شروع ہوا۔ سماع کے الفاظ نے حضرت داتاؒ کو مضطرب کر دیا۔ کچھ دیر بعد، جوش کم ہو جانے پر جب شیخؒ نے پوچھا تو حضرت داتاؒ نے فرمایا کہ سماع سن کر مجھے بہت مسرت ہوئی۔ اس پر شیخؒ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ سماع اور کوے کی آواز میں تیرے لئے کوئی فرق نہ رہے گا کیوں کہ قوت سماع اس وقت تک ہے جب تک مشاہدہ (۱۷) حاصل نہ ہو اور جب مشاہدہ حاصل ہو جاتا

ہے تو سماع کی خواہش مٹ جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت داتاؒ نے بعد میں سماع سے توبہ کر لی تھی جس کی وجہ حضرت داتاؒ نے یہ فرمائی کہ سماع میں بڑے خطرے ہیں اور بڑی عافت یہ ہے کہ عورتیں کسی اونچے مقام سے سماع کے حال میں درویشوں کو دیکھتی ہیں اور نوجوان اور نوخاستہ ان مجلس میں شریک ہوتے ہیں جس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

[''آبِ کوثر'' ص ۸۸۔۸۹]

(۱۴) **حضرت حسین اصغرؒ** = احقر کے خیال میں یہ نام حضرت حسن اصغرؒ ہونا چاہیے۔

(۱۵)،(۱۶)(۱۷) **درویش، فقرہ، مشاہدہ** = تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') ملاحظہ فرمائیں۔

آں محرم رازِ نہانی، آں مستغرق ذاتِ ربانی، آں دردام مشاہدہ اسیر

حضرت شیخ محمد میرؒ

[المشہور بہ میاں میر بالا پیرؒ] [م ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) ۷ ربیع الاوّل بروز سہ شنبہ]

آپ کی والدہ محترمہ کا نام بی بی فاطمہؒ بنت قاضی قادنؒ اور والدِ بزرگوار کا نام قاضی سامیدہؒ بن قاضی قلندرؒ تھا جو سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کی نسل سے تھے۔ آپ کے چار بھائی اور دو بہنیں اور بتائی گئی ہیں۔ بھائیوں کے نام یہ تھے: میاں قاضیؒ، قاضی عثمانؒ، قاضی طاہرؒ نیز قاضی محمدؒ اور بہنوں کے نام یہ تھے: بی بی بادیؒ اور بی بی جمالؒ خاتونؒ۔ آپ کے والدین اور ایک بہن① صاحب کرامات ہوئے ہیں۔

منقول ہے کہ جب آپ کے بڑے بھائی پیدا ہوئے تو آپ کی والدہ کو بذریعہ کشف یہ علم ہو گیا تھا کہ یہ بچہ عارف نہیں ہوگا۔ چنانچہ جب آپ ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) میں بمقام سیوستان (سیستان) تولد ہوئے تو آپ کی والدہ نے خدا سے دعا کی کہ خدایا! میرے اس فرزند کو عارفِ کامل، تارک الدنیا اور اپنی یاد میں مستغرق بنا دینا۔ پس غیب سے ندا آئی کہ ہم نے تیرے اس فرزند اور ایک دختر کو عارف بنانا قبول کر لیا۔ آپ کے بعد بی بی جمالؒ خاتونؒ پیدا ہوئیں جو عارفۂ وقت ہوئیں۔

آپ نے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی لیکن سات برس کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ پانچ سال میں آپ تحصیلِ علومِ ظاہری سے فارغ ہوئے اور پھر آگے چل کر یہی یتیم بچہ اپنے وقت کا قطب و پیشوا، امامِ طریقت، واقفکارِ اسرارِ حقیقت، علومِ ظاہری میں یکتائے روزگار اور عارفِ کامل ہوا۔

آپ سلسلۂ "قادریہ" میں شیخ خضر سیوستانیؒ جو سیوستان کے صاحبِ کمال و یکتائے

روزگار بزرگ ہوئے ہیں، سے بیعت تھے اور انھیں کی ایما پر ہندوستان میں لاہور تشریف لائے۔ عالم ملکوت کا کشفِ حال کا علم آپ نے اپنی والدہ سے حاصل کیا تھا اور حضرت غوث پاک کے اویسی تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ بنا وضو کے غوثِ اعظمؒ کا نام نہیں لیتے تھے۔ آپ فقر وغنا، توکل وقناعت، زہد وعبادت اور ترک دنیا میں اپنے زمانے میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ شب وروز ذکرِ الٰہی میں مستغرق رہتے، شب کو نہ سوتے، دن کو نہ کھاتے، صائم رہتے، شروع میں تیسرے دن اور بعد میں ایک ماہ بعد افطار کرنے لگے تھے۔ آپ کی باتیں مستقل وعظ ونصائح ہوتی تھیں۔ موقع کے مناسب اشعار بھی سناتے تھے۔ اکثر یہ شعر سنایا کرتے تھے۔

شرط اوّل در طریق عاشقی دانی کہ چیست
ترک کردن ہر دو عالم را و پشت پا زدن

آپ کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز سے پہلے مریدین کے ہمراہ جنگل جاتے اور وہاں جا کر الگ الگ درختوں کے نیچے بیٹھ جاتے اور پھر نماز کے وقت باجماعت نماز ادا کرتے اور واپس تشریف لاتے۔ اکثر رات کو حجرہ میں تنہا بیٹھ کر دروازہ بند کر لیتے اور پوری رات عبادت میں بسر کر دیتے۔ آپ کا ظاہری اور باطنی حقیقت اور قابلیت میں اتنا بلند مقام تھا کہ بڑے سے بڑے فاضل شخص کو بھی آپ کے سامنے مجالِ سخن نہ ہوتی تھی۔

منقول ہے کہ ایک بار جب ملکۂ نور جہاں نے مشہد مقدس سے ایک مجتہد کو مناظرہ کے لئے ہندوستان بلوایا تو ان کا شاہی فرمان بموجب لاہور میں زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ استقبال کرنے والوں میں صوبیدار، شہر کے امراء اور علماء کے ہمراہ آپ بھی تشریف رکھتے تھے۔ جب مجتہد محترم کی نظر آپ کے روئے منور پر پڑی تو انھوں نے آپ سے متعارف ہو کر مصافحہ کیا اور صوبیدار سے خواہش ظاہر کی کہ ان کی آرام گاہ کا انتظام آپ کی خانقاہ کے قریب ہی کیا جائے۔ الغرض آپ کی خانقاہ کے قریب ہی ایک

مکان آراستہ کردیا گیا۔ اگلے دن صبح کو جب ایک جمِ غفیر مُصر ہو کر آپ کو مجتہد کی قیام گاہ پر لے گیا تو مجتہد مکرم آپ سے نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ آپ نے مجتہد سے فرمایا کہ مخلوق رجوع ہو کر آپ سے کچھ سننا چاہتی ہے اور یہ فقیر بھی مشتاق ہے۔ مجتہد نے جواب دیا کہ لیکن میں آپ کا مشتاق ہوں۔ آپ نے برجستہ فرمایا کہ ہمیشہ غلبہ کثرتِ رائے سے ہوتا ہے۔

الغرض مجتہد صاحب نے بیان شروع فرمایا۔ اہل بیت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناء کے بعد انھوں نے کربلائے معلی کی تعریف میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کربلا کو وہ عظمت بخشی ہے کہ اس کے گرد گرد بارہ بارہ کوس تک دوزخ کی آنچ حرام ہے۔ اس پر آپ نے بآواز بلند فرمایا کہ حاضرین والا تمکین! یہ بزرگی کربلا کو اس وجہ سے ہے کہ وہاں نواسے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ابدی نیند سوئے ہیں۔ سبحان اللہ! جائے غور ہے کہ جس جگہ خود وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم معہ اپنے تینوں ستونِ دین کے آسودہ ہیں اگر اس جگہ کے واسطے یہ کہا جائے کہ اس کے گرد سو سو کوس تک دوزخ کی آنچ حرام ہے، تو بجا ہوگا۔ یہ سن کر مجتہد محترم خاموشی سے دردِ سر کا حیلہ کر کے مسند سے اتر آئے اور جلسہ برخاست ہوگیا۔ اس کے بعد وہ صوبیدار ہو رہے یہ کہہ کر وطن واپس ہوگئے کہ شہنشاہ کو لکھ دینا کہ مجھے یہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی۔

منقول ہے کہ ایک بار شاہجہاں نے جمعہ کے دن آپ کی زیارت کے بعد آپ کو پچاس ہزار روپیہ نذر کرنا چاہا تو آپ نے یہ کہتے ہوئے کہ مال سلطنت مشکوک ہے، لینے سے صاف انکار فرمادیا۔ اس کے بعد شہنشاہ نے لاہور ہی میں ایک دوسرے بزرگ کو وہ روپیہ نذر کردیا۔ جب اگلے جمعہ کو شاہجہاں آپ کی زیارت کو آیا اور اس نے دوسرے بزرگ کے روپیہ قبول کر لینے کی بابت بتایا تو آپ نے فرمایا کہ وہ بزرگ مثل دریا کے ہیں اور یہ فقیر مثل ایک کوزے کے کہ ناخن ڈوبنے سے بھی اس کا پانی مکروہ ہو جاتا ہے۔ وہاں

سے رخصت ہو کر شاہجہاں پھر انھیں بزرگ کے پاس پہنچا اور ان کے نذرانہ قبول کر لینے اور میاں میرؒ کے قبول نہ کرنے کی بابت پوری بات بتاتے ہوئے ان بزرگ سے اصرار کیا کہ اس میں کیا اسرار ہے تو ان بزرگ نے فرمایا کہ میاں میرؒ کا اتقاء زیادہ ہے۔

ایک بار آپ باغ زریں خاں میں مشغول عبادت تھے کہ ایک فاختہ ایک درخت پر بیٹھی ''حق سرہٗ'' کا ورد کر رہی تھی کہ ایک شکاری نے غلیل سے اس پر وار کیا اور وہ مر کر نیچے زمین پر گر گئی۔ شکاری اس کو مرا ہوا دیکھ کر وہاں سے چلا گیا۔ آپ نے اس مردہ فاختہ کو خادم سے اٹھوا کو منگوا لیا اور جب اپنا دستِ حق پرست اس پر پھیرا تو وہ خدا کے فضل و کرم سے زندہ ہو کر اسی درخت کی ایک شاخ پر جا بیٹھی اور پھر سے یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئی۔ شکاری نے جب پھر اس کی آواز سنی تو اس نے پھر اس کو نشانہ بنانا چاہا لیکن آپ نے منع فرما دیا۔ شکاری نے کوئی توجہ نہ دی لیکن جیسے ہی غلیل چلانی چاہی کہ اس کے ہاتھ میں شدت کا درد ہوا اور وہ زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ تب آپ نے اس کے پاس جا کر فرمایا کہ اے بے درد! یہ درد تیری بے دردی کا ثمرہ ہے۔ وہ شخص بہت رویا اور اس نے آپ کی قدم بوسی کے بعد شکار سے توبہ کی۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا کہ درد موقوف ہو گیا۔ اس کے بعد وہ شخص آپ کا مرید ہو کر مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچا۔

آپ کے انفاس پاک کو اللہ نے وہ تاثیر بخشی تھی کہ آپ کا دم کیا ہوا پانی کیسے ہی سخت بیمار کو پلا دیں تو اس کو فوراً شفاء ہو جاتی تھی، گونگا گویا ہو جاتا تھا اور جس کو شکایت ضعفِ بصر ہوتی اس کو اس پانی کے لگاتے ہی اس کے چشم روشن ہو جاتے تھے۔ آپ کی بہت سی خوارق وکرامات مشہور ہیں۔

ایک بار کسی شخص کی باندی کچھ مال اسباب لے کر فرار ہو گئی۔ اس نے بہت تلاش کیا لیکن جب وہ نہ ملی تو وہ آپ کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا کہ جا! وہ تیرے گھر ہی میں ہے۔ اس شخص نے جب گھر جا کر دیکھا تو باندی کو معہ اسباب گھر ہی میں پایا۔ پوچھنے

پر اس باندی نے بتایا کہ میں بہت دور چلی گئی تھی کہ کسی نے میرا ہاتھ بازو سے پکڑا اور مجھے یہاں چھوڑ گیا۔

ایک بار کسی بدگو کی شکایت پر شہنشاہ جہانگیر نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور مرزا حسام الدینؒ (خلیفہ شاہ محمد باقی باللہؒ) کو کشمیر طلب کرلیا۔ جب یہ دونوں بزرگ لاہور پہنچے اور آپ سے ملاقات کی تو آپ نے فرمایا کہ نہ تم (شیخ عبدالحق) کشمیر جاؤ گے، نہ تمہارا بیٹا (نورالحق) کابل جائے گا اور نہ تم (مرزاؒ) دہلی سے جدا ہوں گے۔ اس کے بعد چوتھے دن ہی خبر آئی کہ شہنشاہ کا انتقال ہوگیا۔

تقریباً ساٹھ سال لاہور میں قیام کرنے کے بعد ۸۵ برس (شمسی) کی عمر میں ۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ (۱۵۵۹ء) کو (عہد شاہجہانی میں) لاہور کے محلہ خانی پورہ (بیگم پورہ) میں آپ کا وصال ہوا۔ [اناللہ وانا الیہ راجعون]

"میاں میر چشمۂ انوار"، "رہبر متقی"، "شیخ والا جاہ" سے آپ کا سنہ وِلادت اور

۹۵۷ھ	۹۵۷ھ	۹۵۷ھ

"تاج الاصفیاء عابد میاں میر"، "فیض حق ولی"، "میاں میر دستگیر" "ہادی صدق میر اشرف"

۹۵۷ھ	۹۵۷ھ	۹۵۷ھ	۹۵۷ھ

سے سنہ وصال نکالے گئے ہیں۔

اُن دنوں نواب وزیر خان صوبیدار لاہور تھا۔ چونکہ شہزادہ دارا شکوہ آپ کا بہت معتقد تھا اس لئے اس نے موضع ہاشم پور جو اب لاہور ہی کا حصہ ہے، میں آپ کا مزار مبارک تعمیر کرایا یہ علاقہ اب آپ کے نام سے "چھاؤنی میاں میر" کہلاتا ہے۔ گرچہ آپ کا مزار بہت سادہ ہے لیکن ایک وسیع وعریض علاقے میں پھیلا ہے جس میں دیگر متعدد بزرگوں واولیاء اللہ کے مزارات واقع ہیں۔ علاقے کے اطراف پُرشکوہ چہار دیواری اور داخلے کے لئے چہار دیواری کی مناسبت ہی سے دروازے ہیں۔ صدر دروازہ کے سامنے

بہت سے ہوٹل ہیں جن پر غرباء، فقراء میں کھانا تقسیم کرنے کے لئے بڑی بڑی دیگوں کا مناسب انتظام ہے۔ احقر کو حاضری اور فاتحہ خوانی کی سعادت نصیب ہو چکی ہے۔ آج بھی آپ کا مزارِ پُر انوار لاہور میں مشہور حاجت روائے خلق ہے۔

یہاں اس واقعہ کا ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب رنجیت سنگھ لاہور کا راجہ ہوا تو اس نے بہت سی شاہی عمارات، خانقاہوں، مساجد و مقابر سے پتھر نکلوا کر امرتسر روانہ کئے۔ ایک دن حسب معمول جب وہ آپ کے مزارِ مبارک پر گیا اور معماروں کو حکم دیا کہ اس کا گھوڑا اچانک بگڑا اور وہ زمین پر آ رہا۔ وہ اٹھا اور ہنس کر بولا کہ یہ بادشاہوں کے پیر کا مقبرہ ہے، اس کو نہ چھیڑو اور پھر اس نے چھ سو روپیہ سالانہ برائے عرس شاہی خزانہ سے مقرر کر دیا جو انگلش دورِ حکومت میں بھی برابر جاری رہا۔

سلسلۂ طریقت

غوث الثقلین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی [م ۵۶۱ھ (۱۱۶۶ء)]

شیخ محمد بن مبارکؒ [م ۵۷۲ھ (۱۱۷۶ء)]

شیخ مرتضیٰ بجوڑی

شیخ داؤد ابراہیم

سید ابدال شہباز

شاہ جمال مجرد

سید علی قادری

شیر ادریس خواجہ باقیؒ

شیخ خضر سیوستانیؒ [م ۹۹۴ھ (۱۵۸۶ء)]

شیخ محمد میرؒ

[المشہور بہ میاں میر بالا پیر]

روحانیت

شاہ محمد غوث گیلانی قادری [م ۱۱۵۲ھ]

۲۲۱

شیخ نعمت اللہ سرہندیؒ [م ۱۰۱۰ھ]

حاجی مصطفیٰ سرہندیؒ

[م ۱۴ صفر ۱۰۳۹ء بروز چہار شنبہ]

ملا خواجہ کلاںؒ

ملا عبدالغفور دانشمندؒ

شیخ نتھا شاہ [م ۱۰۳۶ھ] (ص ۲۲۴)

میر عنایت اللہ [م ۱۰۳۲ھ]

خواجہ بہاریؒ [م ۱۰۲۰ھ لاہور] (ص ۲۲۶)

شیخ احمد دہویؒ

شیخ اسماعیلؒ

شیخ احمد سنائیؒ

میاں حامدؒ [م ۱۰۳۳ھ] (ص ۲۲۵)

شیخ شاہ محمد ملا شاہ [م ۱۰۶۹ھ]

[آگے اگلے صفحہ پر]

[گذشتہ صفحے سے]

شیخ شاہ محمد ملا شاہ [م ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۸ء)] (ص ۲۲۷)

شہزادہ محمد دارا شکوہؒ
[م ۱۰۷۰ھ (۱۶۵۹ء)]
[تفصیل احقر کی کتاب "تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ" کی جلد چہارم میں ملاحظہ فرمائیں]

شیخ محسن شاہؒ
شاہ عبدالرشید لاہوریؒ
شاہ بلاق لاہوریؒ [م ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء)]
سید عبدالکریمؒ المشہور بہ پیر بہادن شاہؒ
[بن سید بلاق لاہوریؒ (ص ۲۳۶)]

مقبولِ امامت، مخصوص بکرامت، محرمِ رازِ سبحانی

سید فخر الدین حسین زنجانیؒ

[م ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) ۱۹ شعبان المعظم]

آپ کا اصل نام سید فخر الدین حسین اور والد محترم کا نام سید علی محمد اور والدہ محترمہ کا نام حضرت مریم صغریٰ تھا جن کا چند واسطوں سے تعلق سیدنا حضرت امام حسین سے ہے۔ ۲۶ شعبان المعظم ۳۴۷ھ (۹۵۸ء) کو ایران کے مشہور تاریخی شہر زنجان میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے زنجانی کہلائے۔ [زنجان، ایران کے شمال میں وہ البرز کے دامن میں واقع ہے۔ یہ علاقہ بڑا زرخیز اور قدرتی دولت سے مالا مال ہے۔]

آپ کے اسلاف خلافت راشدہ کے دور میں عراق آکر آباد ہو گئے تھے اور وہاں سے آپ کے اجداد حضرت سید جعفر برقعیؒ تیسری صدی ہجری میں زنجان تشریف لے آئے تھے۔ انھیں سے سادات زنجانیہ کا سلسلہ نسب آگے بڑھا۔

آپ کی تین بہنیں [کلثوم، زینب اور فاطمہ] اور تین بھائی [یعقوب، موسیٰ اور علی] تھے۔ آپ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ حضرت یعقوب زنجانیؒ [پیدائش ۳۵۲ء] اور حضرت موسیٰ زنجانیؒ [پیدائش ۳۵۹ھ] آپ ہی کے ہمراہ زنجان سے لاہور تشریف لے آئے تھے۔ حضرت یعقوب زنجانیؒ اپنے والد سے اور حضرت موسیٰ زنجانیؒ آپ ہی سے بیعت تھے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم زنجان میں ہی ایک امام مسجد سے حاصل کی جو بہت عالم و فاضل بزرگ تھے۔ انھیں کی صحبت فیض سے آپ کے دل میں روحانیت باطنی و اسرار و رموز جاننے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ ان دنوں گازرون میں حضرت ابوالفضل ختلیؒ کا

چرچا عام تھا۔ چنانچہ آپ اپنے والد کے ہمراہ گاذرون جاکر ان سے بیعت ہوگئے۔

پیر مرشد نے خرقۂ خلافت سے آپ کو سرفراز فرماتے ہوئے ہندوستان جاکر تبلیغ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے والدین سے بھی اجازت حاصل کر لینے کے بعد ۳۸۵ھ (۹۹۵ء) میں سفر کا آغاز کیا اور قزوین، رے، سبزوار (رے سے پینتیس میل کے فاصلے پر واقع)، تمسان اور اقطان ہوتے ہوئے نیشاپور پہنچے جہاں سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) نے آپ سے ملاقات کی۔ نیشاپور سے روانہ ہوکر آپ ہرات، کا کا خیل، ہزارہ، جنجوعہ، مہمند، چنبہ، بلمند ہوتے ہوئے غزنی پہنچے۔ غزنی سے براستہ کابل، جلال آباد تشریف لائے۔ وہاں سے درۂ خیبر میں سے گزرتے ہوئے پشاور سے بیس میل فاصلے پر واقع ایک مقام لقمان میں قیام پذیر ہوئے۔ چند روز آرام کے بعد آپ وہاں سے پشاور، اور پشاور سے بذریعہ کشتی دریائے سندھ کو عبور کر کے مارگلہ کے مقام پر پہنچے اور پھر بالآخر ۳۸۷ھ (۹۹۷ء) میں اپنی منزل مقصود لاہور میں قدم رنجہ فرما کر شہر کے مشرقی علاقے میں دریا کے کنارے قیام فرمایا۔ بعد میں یہ علاقہ آپ کی نسبت سے "چاہ میراں" کہلایا۔ آپ کے بھائی، یعقوب زنجانیؒ جو عیال دار تھے، نے جنوبی لاہور (موجودہ شاہ عالمی) اور موسیٰ زنجانیؒ نے مستی دروازے کے اندر اقامت اختیار کر لیں۔

لاہور ان دنوں کفر کے اندھیروں میں غرقاب تھا۔ چنانچہ آپ نے تین سال تو بہت مشکلات میں گزارے لیکن پیہم جدوجہد کرتے رہے اور صبر کا دامن نہ چھوڑا اور پھر بالآخر اللہ کے حکم سے اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے لاہور میں کل ملا کر چوالیس سال تبلیغ فرمائی۔ اس دوران آپ کے دونوں بھائی تاحیات آپ کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ [حضرت یعقوبؒ کا انتقال ۴۶۰ھ میں اور حضرت موسیٰؒ کا انتقال ۴۴۰ھ میں ہوا۔]

حضرت موسیٰ زنجانی پر شروع میں تو سکر و جذب کی کیفیت طاری رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ صحو کی حالت میں آتے گئے۔ عمر کے آخری حصے میں مستی دروازے سے

شمالی لاہور، یعنی ریلوے اسٹیشن کی آبادی جواب پاک نگر (پہلے بھارت نگر) کہلاتی ہے، میں تشریف لے آئے۔ وہیں ۸۱ سال کی عمر میں وصال پایا۔

آپ نے شادی نہیں کی تھی۔ اس لیے حضرت یعقوب زنجانی کی اولاد ہی خود کو آپ کی نسل سے بتاتی ہے۔

آپ کی درگاہ کے قریب جو کنواں ہے اور ''میراں دی کھوئی'' کے نام سے مشہور ہے، وہ آپ کے مریدین نے عقیدت مندوں کی سہولت کی خاطر کھدوایا تھا۔ شروع میں اس کا پانی کھاری تھا۔ جب آپ نے اس کی منڈیر پر کھڑے ہو کر دعا فرمائی تو وہ خدا کے فضل سے میٹھا ہو گیا۔

آپ نے اپنی زندگی میں ایک پیش گوئی فرمائی تھی جو اللہ کے کرم و فضل سے حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آپ نے فرمایا تھا ''زنجان سے ہمارے آنے کے بعد وہاں ایک ولی کامل پیدا ہوگا جس کو کشف و کرامات میں بہت بلند مرتبہ حاصل ہوگا اور دنیا اس کو سعد بن علی زنجانی کے نام سے جانے گی۔ ان کے والد کا نام بھی میرے والد محترم کی طرح علی ہوگا۔ چنانچہ زنجان میں حافظ الحدیث سعد بن علیؒ کی ولادت ہوئی اور انھوں نے اپنی زندگی میں امۃ المسلمہ اور اسلام کی بے پناہ خدمت کی۔ ان کا وصال ۴۷۱ھ (۱۰۷۸ء) میں ہوا۔

زندگی کے آخری ایام میں آپ بیمار رہنے لگے تھے۔ چنانچہ آپ کے حجرے سے آپ کا چہیتا عقیدت مند و مرید، رام چندر آپ کو اپنے گھر لے گیا جہاں ۱۹ رشعبان المعظم ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) بروز جمعرات آپ کا وصال ہو گیا۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون)۔ جب آپ کا جنازہ لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس کو روکا اور آپ کا چہرۂ پرنور دیکھا اور پھر انھوں نے ہی نماز جنازہ پڑھائی۔ [قطب کی نماز جنازہ قطب ہی پڑھتا ہے۔ اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت داتا گنج بخش کو لاہور بھیجی

تا کہ وہ نمازِ جنازہ بھی پڑھا سکیں اور حضرت زنجانیؒ کے وصال کی وجہ سے جو قطبیت کی جگہ خالی ہوگئی تھی وہ بھی پُر کرسکیں۔]

آپ کا مزار اقدس چاہ میراں کی خوبصورت آبادی میں سطح زمین سے بلند سبز گنبد کے ساتھ ایستادہ ہے جہاں ہر وقت زائرین کا میلہ لگا رہتا ہے۔

صاحب ''خزینۃ الاصفیاء'' اور صاحب ''گلزارِ ابرار'' نے بھی سید فخر الدین حسین زنجانیؒ کے نام کے ایک بزرگ کا تذکرہ کیا ہے جو لاہور میں وارد ہوئے۔ صاحب ''خزینۃ الاصفیاء'' نے ان کا سنہ وصال ''عارف حسین زنجانی'' سے نکالا ہے۔[ص ۹۰۵]

۶۰۰ھ

صاحب ''گلزارِ ابرار'' نے شیخ جمالی دہلویؒ کی تصنیف ''سیر العارفین'' کے حوالے سے لکھا ہے ''جب خواجہ معین الدین چشتیؒ [م ۶۳۴ھ (۱۲۳۶ء)] ہند وارد ہوئے تو انھوں نے چند روز لاہور میں سید فخر الدین حسین زنجانیؒ کی مصاحبت میں بھی قیام فرمایا۔[خواجہ بزرگ ۵۶۱ھ (۱۱۶۵ء) میں لاہور، دہلی وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے اجمیر شریف وارد ہوئے تھے۔] ان دونوں کے درمیان باہم رازداری اور خدا شناسی کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ شیخ سعد الدین حمویؒ (م ۱۲۵۲ء) اگرچہ شیخ نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ (م ۱۲۲۱ء) کے مرید تھے لیکن سلوک اور توحید کے مدارج انھوں نے سید فخر الدینؒ کی ہی بدولت طے کیے اور کمال کو پہنچے۔'' [''اذکارِ ابرار'' (اردو ترجمہ) ''گلزارِ ابرار'') ص ۲۵]

ان سید فخر الدین حسن زنجانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ نجم الدین کبریٰؒ اور شیخ سعد الدین حمویؒ کے سنہ وصال کے حوالوں سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بزرگ ایک ہی دور میں ہوئے ہیں اور اس سے صاحب ''خزینۃ الاصفیاء'' اور صاحب ''گلزارِ ابرار'' کے تذکروں کی تصدیق ہوجاتی ہے لیکن یہ دور حضرت داتا گنج بخشؒ سے کافی بعد [تقریباً دوسو سال] کا دور ہے۔ اس لئے یہ بات مشکوک ہوجاتی ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ اور

حضرت سید فخر الدین حسین زنجانی یک ہی بزرگ شیخ ابوالفضل بن حسن ختلیؒ سے بیعت تھے نیز حضرت داتا گنج بخشؒ، سید فخر الدین زنجانی کے وصال پر لاہور تشریف لائے۔ لیکن صاحب ''خزینۃ الاصفیاء'' نے سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف ''فوائد الفواد'' کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ سید فخر الدین حسین زنجانی بھی شیخ ابوالفضل بن حسن ختلیؒ سے بیعت اور ان کے حلقہ میں سے نیز قطبیت لاہور پر فائز تھے۔ اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو صاحب ''سیر العارفین'' کا قول اور ''خزینۃ الاصفیاء'' میں سید فخر الدین حسین زنجانی کا دیا گیا سنہ وصال (۶۰۰ھ) غلط ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کی رو سے ''فوائد الفواد'' میں دی گئی تفصیل، یعنی سید فخر الدین، شیخ ابوالفضل سے بیعت تھے، صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید فخر الدین اور داتا گنج بخشؒ آپس میں پیر بھائی تھے اور سید فخر الدینؒ کے وصال پر حضرت داتا گنج بخشؒ لاہور تشریف لائے۔ [واللہ عالم بالصواب]

لاہور میں ہی ایک اور بزرگ قاضی حسن زنجانی نام کے ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں جو سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد سے تھے۔ قصبہ سیوہارہ (بجنور) کا علم دوست قاضی خاندان انھیں کی اولاد سے ہے۔ قاضی صاحب، زنجان (عراق عجم) کے رہنے والے اور ایک عارف کامل بزرگ نیز سلسلۂ ''جنیدیہ'' میں اپنے خاندانی بزرگوں سے بیعت تھے۔ آپ کو کئی ہزار احادیث ازبر تھیں۔ آپ کا شہرۂ فضل و کمال سن کر بابر نے آپ کو فرمانہ طلب کیا۔ اس طرح آپ بابر کے مصاحب اور مشیر خاص ہو کر اس کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔ دہلی فتح کر لینے کے بعد بابر نے باغی سرداروں کی سرکوبی کے لئے آپ اور سید ابراہیم ترمذی کی قیادت میں ایک دستہ روانہ کیا۔ جہاں آج قصبہ سیوہارہ آباد ہے وہاں آپ کی جمنا رائے سے مقابلہ آرائی ہوئی۔ جمنا رائے مارا گیا اور آپ کی فتح ہوئی۔ بابر نے خوش ہو کر سیوہارہ مع مواضعات کثیر ریاست جمنا رائے آپ کو مع عہدہ

قضاد منصب پنج ہزاری عطا کیا۔

آپ نے سیوہارہ قیام فرمایا اور متعلقین کو بھی دہلی سے سیوہارہ لے آئے۔ بعد ازاں بحکم شاہی قضا اپنے فرزند، قاضی عبدالرحمنؒ کے سپرد کر کے دہلی واپس تشریف لے گئے۔ اس کے بعد لاہور کے عہدۂ قضا پر معمور کر دیے جانے پر آپ لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور میں دارالقضا اور سیوہارہ میں ایک محل کی تعمیر کا کام شروع کرایا تھا کہ ۹۷۵ھ (۱۵٦۷ء) میں بہ عمر سو سال پیام اجل پہنچا۔ آپ دو سال لاہور رہے۔ آپ کا مزار مبارک محلہ میر نگ میں شاہ سریٔ کے مزار کے قریب تھا جس کے آثار بھی اب معدوم ہو گئے ہیں۔

شمس الفقراء، بدر النقباء، خلعتِ سروری

سید عزیز الدین مکی ثم الاہوریؒ [المشہور بہ پیر مکیؒ] [۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء)]

آپ ساداتِ عظام، اپنے وقت کے اعظم علماء و کبرائے اولیائے کرام میں سے، بغداد کے رہنے والے اور سلسلۂ طریقت میں چند واسطوں سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ سے وابستہ تھے۔

بغداد سے مکہ معظمہ تشریف لے جا کر آپ نے وہاں تقریباً بارہ سال قیام فرمایا اور مجاورت پر مامور رہے۔ ایک دن بیت اللہ میں معتکف تھے کہ "پیر مکی" کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔ اس کے بعد ۵۷۴ھ (۱۱۷۸ء) میں آپ بایمائے ربانی مکہ معظمہ سے عازم ہندوستان ہو کر لاہور میں مقیم ہوئے۔ ان دنوں لاہور غزنوی خاندان کا دارالسلطنت تھا اور اس پر تاج الدولہ خسرو ملک بن معز الدولہ خسرو شاہ حکمرانی کرتا تھا۔

۵۷۶ھ (۱۱۸۰ء) میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر پہلا حملہ کیا اور لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ خسرو ملک شہاب الدین کا مقابلہ نہ کر سکا اور دعا کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے دعا فرمائی۔ اللہ کے حکم سے شہاب الدین بلا فتح کے غورستان واپس چلا گیا۔(۱)

دو سال بعد ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) میں شہاب الدین نے دوبارہ لاہور پر حملہ کیا۔ اس نے لاہور اور اس کے اطراف کو خوب جی کھول کر لوٹا اور سیالکوٹ کا قلعہ تعمیر کر کے اور وہاں کی حکومت اپنے ایک امیر کے سپرد کر کے پھر سے غورستان واپس لوٹ گیا۔(۲)

۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں تیسری بار حملہ کرنے کی بجائے شہاب الدین نے ایک شاطرانہ چال چلی اور ظاہری طور پر دوستی کا ڈھونگ رچاتے ہوئے وہ دھوکے سے ایک رات

چپ چاپ لاہور پہنچ گیا۔ خسرو ملک نے مجبوراً امان طلب کر لی اور اس طرح لاہور پر غوری کا قبضہ بنا کسی جنگ و جدل کے ہو گیا اور ساتھ ہی غزنی کی عظیم الشان حکومت محمود کے خاندان سے نکل کر خاندانِ غوری کے ہاتھ آ گئی۔

آپ بدستور لاہور میں وعظ و نصیحت فرماتے رہے اور بالآخر ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) میں انتقال فرمایا۔ ''آفتابِ حسینؒ'' اور ''پیر حسن پیر مکی'' سے آپ کا سنہ وصال

۶۱۲ھ ۶۱۲ھ

نکلتا ہے۔

جس شاہراہ پر داتا گنج بخشؒ کا مزار مبارک ہے، اسی پر کچھ فاصلے سے، ایک گلی کے اندر غالباً آپ ہی کا مزارِ شریف واقع ہے۔ احقر کو حاضری کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

احقر کو آپ کی بابت بتایا گیا کہ آپ داتا گنج بخشؒ کے استاد تھے اور جب داتا گنج بخشؒ لاہور وارد ہوئے تو ان کو آپ نے آبِ دریا پر اپنی چادر بچھا کر دریا عبور کرایا۔ یہ روایت بالکل من گھڑت اور جھوٹی معلوم دیتی ہے کیوں کہ آپ کا سنہ وصال ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) ہے جب کہ داتا گنج بخشؒ کا سنہ وصال ۴۶۴ھ ہے۔ یعنی آپ داتا گنج بخشؒ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد کے بزرگ ہیں۔

حواشی

(۱) لاہور میں جب معز الدولہ خسرو شاہ [بن یمین الدولہ بہرام شاہ بن علاؤ الدولہ مسعود بن ظہیر الدولہ ابراہیم بن ناصر الدولہ مسعود بن امین الملت یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی] کا سات سال حکومت کرنے کے بعد ۵۵۵ھ (۱۱۶۰ء) میں انتقال ہوا تو اس کا بیٹا خسرو ملک اس کا جانشین ہوا۔ خسرو ملک نے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور بڑے عدل و انصاف

سے حکومت کی اور وہ ہندوستانی علاقے جو غزنوی مملکت کے قبضے سے نکل گئے تھے دوبارہ اپنے قبضے میں کئے۔ اُدھر شہاب الدین محمد غوری نے غزنی پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستان پر پہلی بار حملہ کیا اور ۵۷۶ھ (۱۱۸۰ء) میں افغانستان، پشاور، سندھ اور ملتان فتح کرنے کے بعد لاہور کا رخ کیا۔ خسرو ملک اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور لاہور کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ شہاب الدین نے خسرو ملک کے ایک ذو عمر بیٹے، ملک شاہ اور لاہور کے ایک ہاتھی کو اپنے قبضے میں کیا اور پھر واپس غورستان لوٹ گیا۔

[''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اوّل ص ۲۰۳]

(۲) جن کے مزارات پر حاضری کاش کہ ممکن ہو سکتی!

ا۔ "قادریہ" سلسلہ سے وابستہ صوفیاء کرام

حضرت سید محمود حضوری لاہوریؒ = آپ سید شمس الدینؒ المشہور بہ شمس العارفین غوریؒ کے فرزند اور امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد سے تھے۔ حضوری اس لئے کہلاتے ہیں کہ زیارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد غور سے بغرض سیر ہندوستان وارد ہوئے اور لاہور کے محلّہ حاجی سوالی میں مقیم ہو گئے۔ آپ مرید اپنے پدر بزرگوار کے، وہ اپنے پدر سید یعقوبؒ کے، وہ خلیفہ سید عبداللہ شاہ قادریؒ کے، وہ خلیفہ سید علیؒ کے، اور وہ خلیفہ سید السادات سید عبدالوہابؒ کے تھے۔

آپ کی وفات ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں ہوئی۔ "صاحب مشتاق" سے سنہ وصال
۹۴۲ھ
نکلتا ہے۔ مزار شریف درگاہ سید جان محمد حضوریؒ میں واقع ہے۔

حضرت سید عبدالقادر گیلانی لاہوریؒ = آپ مرید اپنے پدر بزرگوار سید جلال الدینؒ کے تھے۔ بغداد سے آکر لاہور میں مقیم ہوئے۔ وفات ۱۸ ربیع الاوّل ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) کو ہوئی۔ "عبدالقادر ثانی" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف
۹۴۲ھ
متصل محلّہ قدیمی پیر عزیز نیرنگ میں واقع ہے۔

حضرت شیخ ابواسحاق قادری لاہوریؒ = آپ خلیفہ داؤد کرمانی چونی والؒ کے اور عوام

ظاہری و باطنی میں یگانۂ عصر، ریاضت و مجاہدہ میں بے مثال، سخاوت میں شہرۂ آفاق نیز صائم الدہر اور قائم اللیل بزرگ تھے۔ بادشاہ بوالمعالی والی کرمان آپ کا مرید تھا۔ آخیر وقت میں محلہ مغلاں (المشہور بہ محلہ پیر عزیز نیرنگ)، لاہور میں سکونت پذیر ہو کر ۵ رمحرم الحرام ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں وفات پائی۔ ''شاہ عالی فقیر بو اسحاق'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ اپنے مکان میں دفن

۹۸۵ھ

ہوئے۔ وہیں آپ کے صاحبزادگان کے بھی مزارات ہیں۔ آپ کا مزار شریف محلہ نیرنگ سے جانب مشرق واقع ہے۔

حضرت شاہ نور حضوری لاہوریؒ = آپ اپنے والد سید محمود حضوری غوریؒ کے مرید تھے۔ والد کے انتقال کے بعد لاہور وارد ہوئے۔ وصال ۹۹۷ھ (۱۵۸۸ء) میں ہوا۔ ''ہادی احسن منور شاہ نور'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۹۷ھ

حضرت شیخ حسین لاہوریؒ = آپ خلیفہ حضرت بہلول دریائیؒ کے تھے۔ آپ کے دادا شیخ عثمانؒ جن کا دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے قبل نام کلسن رائے کا نستھ تھا، لاہور کے باشندہ تھے جو سلطان فیروز شاہ کے عہد میں مسلمان ہوئے۔ آپ کا طریقہ ''ملامتیہ'' تھا۔ جمادی الثانی کی چاندرات ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) میں وصال ہوا۔ ''شیخ محمود'' اور ''شیخ زماں'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۰۸ھ ۱۰۰۸ھ

آپ کے تقریباً نو ہزار خادم تھے جو سب کے سب ولی ہوئے۔ خلفاء کی تعداد ۱۶ بتائی گئی ہے۔ ان میں سے جن کے مزارات لاہور میں واقع ہیں ان کے نام اس طرح سے ہیں

شاہ غریبؒ (شیخ حسنؒ کے مزار کے متصل مزار شریف واقع ہے۔)، مادھو دیوانؒ (محبوب ترین خلفاء میں سے تھے۔) گورکھ دیوانؒ، الہ دیوانؒ، مولا بخش خاکیؒ، شاہ رنگ بلاولؒ، بدھو بلاولؒ اور شاہ بلاولؒ (آخری تینوں شیخ حسن کے مزار کے گرد آسودہ ہیں۔)

حضرت شاہ شمس الدین قادری لاہوریؒ = آپ خلیفہ شیخ ابو اسحاق قادری لاہوریؒ کے اور وہ خلیفہ اعظم شیخ داؤد چونی والؒ کے تھے۔ آپ عالم باعمل اور اپنے عہد میں یگانۂ روزگار تھے۔ شہنشاہ جہانگیر آپ کا بہت معتقد تھا۔ سنہ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں وصال ہوا۔ ''شمعِ بوتراب''، ''فخر عالم''، ''شیخ عالی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۲۱ھ ۱۰۲۱ھ ۱۰۲۱ھ

حضرت سید شاہ بلاول قادری لاہوریؒ = آپ سید عثمانؒ بن سید عیسیٰؒ کے فرزند اور خلیفہ سید شمس الدین قادری لاہوریؒ کے تھے۔ سید شمس الدینؒ، شیخ ابو اسحاقؒ کے اور وہ شیخ داؤد جہنی والؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ کے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ہرات سے ہند وارد ہوئے تھے۔ اور انھوں نے لاہور کے قریب واقع شیخو پورہ جاگیر میں پایا تھا۔ آپ صائم الدہر اور قائم اللیل بزرگ تھے۔ ۷۰ برس کی عمر میں ۲۶ رشعبان المعظم ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء) بوقت عشاء وصال ہوا۔ ''مقتولِ عشق''، ''واعظِ بلاولؒ''، ''سید ثابت بلاولؒ''، ''بلالؒ پیر محبوب بہشت''

۱۰۴۶ھ ۱۰۴۶ھ ۱۰۴۶ھ ۱۰۴۶ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

حضرت سید سرور دین حضوری لاہوریؒ = نسبت ارادت اپنے والد سید جان محمد حضوریؒ سے رکھتے تھے۔ ۲۱ رشوال المکرم سنہ ۱۱۰۰ھ (۱۶۸۸ء) بروز جمعہ وصال ہوا۔ ''سحرِ فیض''، ''سردار سرور سید الدین'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۰۰ھ ۱۱۰۰ھ

حضرت شاہ محمد غوث گیلانی لاہوریؒ = مرید اپنے والد سید حسن پشاوریؒ کے، علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ اور صاحب اجازت سلسلۂ چشتیہ، قادریہ اور نقشبندیہ سے تھے۔ روحانیت میر میرانؒ سے بھی تربیت پائی تھی ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں وصال ہوا۔ ''عارف مخدوم سالک'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۵۲ھ

حضرت سید عبدالقادر شاہ گیلانی گداؒ = آپ فرزند سید عمر بن حاجی محمد ہاشم کے، جامع طریقت و شریعت اور محرم اسرار حقیقت و معرفت تھے۔ سید محمد لاہوریؒ سے فیضیاب ہوئے۔ شنبہ کی رات کو ۱۱۵۴ھ (۱۷۴۱ء) میں وصال ہوا۔ ''مہدی متقی مقتدا'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ آپ کے چار ہونہار، لائق و فائق

۱۱۵۴ھ

فرزند تھے۔ نام یہ ہیں سید یوسف شہیدؒ، سید محمد غوثؒ، سید اصغر علی [صاحب ''شجرۃ الانوار''] اور سید ابی صالحؒ۔

حضرت شاہ فرید نوشاہی لاہوریؒ = والد کا نام سید محمد علیؒ بن سید علیؒ بن سید فتح علی تھا جو سادات بھاکری حسینی سے تھے اور دریائے چناب کے کنارے واقع رسول نگر میں رہتے تھے۔ آپ خلیفہ شیخ پیر محمدؒ [المشہور بہ سچیارؒ] [م۱۱۵۲ھ گجرات] کے تھے اور پیر روشن ضمیر کے حسب الارشاد لاہور تشریف لا کر خدمت خلق میں مشغول ہو گئے تھے۔ اکثر ملازمت بھی کی لیکن بعد میں دل برداشتہ ہو کر شیخ پیر محمدؒ سے بیعت ہو گئے تھے۔ لاہور میں کوٹلہ شاہ فرید آپ ہی کا آباد کیا ہوا ہے۔ ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) میں وصال ہوا۔ ''آفتاب فقر فرید'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۵۸ھ

حضرت شیخ محمد سلطان لاہوریؒ [المعروف بہ مرگ نمیؒ] = آپ سالک مجذوب و

صاحب سکر بزرگ اور شیخ سندی شاہؒ کے مرید تھے۔ شیخ سندی شاہ شیخ عاقل شاہ کے، وہ شیخ ملاّ شاہؒ کے، وہ شیخ خادم علی شاہؒ کے، وہ خادم سلیمان شاہ کے، وہ خادم نور جمال دہویؒ کے، وہ شیخ محمد شفیع سدھوریؒ کے، وہ شیخ محمد حیاتؒ کے اور وہ حضرت شاہ قمیص گیلانی قادریؒ کے مرید تھے۔

آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت اور دلکش تھیں۔ اسی وجہ سے آپ کے پیر مرشد آپ کو "مرگ نین" [ہرن کی سی آنکھوں والا، یعنی بڑی بڑی آنکھوں والا] کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔

آپ کا ۹ رشوال المکرم ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) کو وصال ہوا۔ "شیخ سلطان محمود"

۱۱۵۸ھ

سے سنِ وصال نکلتا ہے۔ شاہنواز خاں صوبہ دار لاہور نے آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

حضرت شیخ مصاحب خاں خورد لاہوریؒ = مرید سردار شاہ قادریؒ [م ۱۱۸۴ھ بابک وال] کے تھے۔ اس وقت لاہور سے تقریباً ۲ کوس (۱۲،۱۸ کلومیٹر) [ہندوستان کے مختلف حصوں میں کوس مختلف ہوتے تھے۔ شمالی ہندوستان اور پنجاب کے علاقے میں ایک کوس = ۲،۰۳ کلومیٹر، دریائے گنگا کے کنارے والے علاقے میں ایک کوس = ۳،۶۵ کلومیٹر اور دکن کے علاقے میں ایک کوس = ۶،۴۸ کلومیٹر] فاصلے سے واقع بکوال میں رہتے تھے۔ ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) کو وصال ہوا۔ "زندہ دل مہربان مصاحب خاں" سے سنِ وصال نکلتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی

۱۱۹۰ھ

درّانی آپ کا بہت معتقد تھا۔

حضرت شیخ جان محمد لاہوریؒ = آپ خلیفہ شیخ مصاحب خاں خوردؒ کے تھے۔ ۱۲۰۶ھ

(۱۷۹۱ء) میں بابک وال میں انتقال ہوا۔ ''غنی جان محمدؐ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۰۶ھ

حضرت شیخ عبداللہ شاہ بلوچ لاہوریؒ = مرید شیخ شرف الدین پانی پتیؒ کے تھے اور وہ مرید خاندان میاں میر لاہوریؒ کے تھے ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں وصال ہوا۔ ''مہدی اعظم عبداللہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۱۲ھ

حضرت سید شادی شاہ قادری لاہوریؒ = اصلاً علاقہ گجرات پنجاب میں رہتے تھے۔ بعد میں چلہ کشی کے ارادہ سے لاہور میں آکر مخدوم داتا گنج بخشؒ کے مزار مبارک پر مقیم ہوئے۔ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں وصال ہوا۔ ''میر شادی شاہ فردوس'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۲۱ھ

حضرت سید علی شاہ قادریؒ = سادات عظام گیلانی سے تھے ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) میں احمد آباد دکن سے لاہور تشریف لا کر دریائے راوی کے کنارے قیام کیا لیکن دریا میں آئی طغیانی کے وقت لاہور شہر میں تشریف لے آئے۔ مرید سید غازی کے، وہ شاہ اعظم کے، وہ شاہ اکرمؒ کے، وہ شاہ خلیل کے، وہ شیخ منّا کے، وہ شاہ مصطفیٰؒ کے، وہ شاہ میاجی کے، وہ سید پیرؒ کے، وہ شاہ کرم علی کے، وہ شاہ مسعودؒ کے، وہ شیخ نور محمدؐ کے، وہ شیخ احمدؒ کے، وہ شیخ صوفی کے، وہ شیخ رحمت اللہ کے، وہ شیخ فضل اللہؒ کے، وہ سید عبدالوہابؒ کے اور وہ ولبد ماجد غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تھے۔

۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں وصال ہوا۔ ''فضلِ نورانی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۲۷ھ

مزار شریف بمقام جھنگی چراغ شاہ، لاہور میں واقع ہے۔

حضرت سید میر میراں شاہ لاہوریؒ = آپ مرید اپنے والد سید مبارک حقانی گیلانیؒ کے تھے۔ اوچ سے آکر لاہور میں خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے تھے ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں وصال ہوا۔ ''مخزن الانوار'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۸۶ھ

حضرت میراں سید مبارک حقانی گیلانیؒ = فرزند و مرید محمد غوث گیلانی اوچیؒ کے، صاحبِ سکر بزرگ تھے۔ لاہور تشریف لاکر خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے تھے۔ ۹۵۶ھ (۱۵۴۹ء) میں انتقال ہوا۔ جسد خاکی لاہور سے اوچ لے جا کر والد کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ ''سید مبارک پیر رہبر'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۵۶

حضرت شاہ سید خیر الدین ابو المعالی قادری کرمانی لاہوریؒ = آپ فرزند سید رحمت اللہ بن سید فتح اللہ کے، ولی کامل اور صحیح النسب ساداتِ کرمانی سے نیز مرید اپنے برادر زادہ شیخ داؤد شیر گڑھیؒ کے تھے۔ خرقۂ خلافت عطا فرمانے کے بعد شیخ نے آپ کو لاہور کی سمت میں مامور فرما دیا تھا۔ چنانچہ آپ لاہور تشریف لائے اور وہاں کی سکونت اختیار کر لی۔ آپ صاحبِ دیوان اور صاحبِ تصانیف بھی تھے۔ ۱۶ ربیع الاول ۱۰۲۴ھ (۱۶۰۹ء) کو وصال ہوا۔ ''افضل اقطاب'' سے سنہ

۱۰۲۴ھ

وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف لاہور میں موتی دروازہ کے باہر مرجع خلائق ہے۔

میاں نتھا شاہ قادریؒ = آپ خلیفہ میاں میر بالا پیرؒ کے اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ ہوئے ہیں۔ پیشے سے آپ تیلی اور ناخواندہ تھے لیکن جو بھی عبارت سامنے آتی اس کو بخوبی پڑھ لیتے تھے۔ ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۷ء) میں وفات پائی۔

''محبوب بہشت بریں'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ آپ کے وصال پر میاں میرؒ نے

۱۰۲۷ھ

آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ رونق فقیر کی میاں نتھاؒ لے گئے اور وصیت فرمائی کہ میرے انتقال کے بعد مجھے بھی میاں نتھاؒ کے پاس دفن کر دینا۔ چنانچہ میاں نتھاؒ کا مزار مبارک درگاہ میاں میرؒ کے احاطے میں واقع ہے۔

حضرت ملا حامد قادریؒ = آپ علوم ظاہری و باطنی اور رموز حریت و حقیقت میں یکتا اور کلام اللہ پڑھنے میں لاثانی تھے۔ پہلے میاں میرؒ کے سخت مخالف تھے لیکن بعد میں ان کے مرید ہو کر عبادت معبود میں مشغول ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں ولایت کمال کو پہنچے۔ ۲۷ رمضان المبارک ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) کو وصال ہوا۔ ''مقتدائے اہل بخت'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف روضہ میاں میرؒ میں

۱۰۴۴ھ

واقع ہے۔

حضرت سیّد اسماعیل گیلانیؒ = آپ مرید اپنے والد سید عبد اللہ ربانیؒ کے تھے۔ جب آپ کا شہرہ ہوا تو اکبر نے برائے زیارت آپ کو لاہور میں طلب کیا اور ایک خطہ پختہ زمین زرخیز و زرعی فیروزپور کے علاقے میں نذر کی۔ ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں وصال ہوا۔ ''نیر نور میر اسماعیل'' سے آپ کا سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۷۸ھ

مزار شریف لکھی محلہ میں متصل درگاہ حضرت میراں محمد شاہ موج دریا بخاریؒ واقع ہے۔

حضرت شیخ مادھو قادری لاہوریؒ = آپ اکمل خلیفہ شیخ حسین لاہوریؒ کے تھے۔ آپ کے والد برہمن اور شاہدرہ کے رہنے والے نیز پاک صورت و طینت انسان تھے۔

۲۲ ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) کو وصال ہوا۔ ''بحر معرفت مادھو''
۱۰۵۶ھ

''مہ اعظم''، ''شمع مروت'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۵۶ھ ۱۰۵۶ھ

حضرت خواجہ بہاریؒ = آپ میاں میرؒ کے خلیفہ، عالم، فقیہ اور محدث تھے۔ پہلے حاجی پور میں رہتے تھے، بعدہٗ لاہور آکر شیخ محمد فاضلؒ سے حدیث صحیح کی اور اس کے بعد میاں میرؒ کے مرید ہوگئے۔ آپ کی بہت سی کرامات مشہور ہیں سنہ ۱۰۶۰ھ (۵۰-۱۶۴۹ء) میں وصال ہوا۔ ''سلطان اولیٰ خواجہ بہاری'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۶۰ھ

سید غلام غوثؒ و شاہ حاکمؒ = دونوں بزرگ صاحب کرامات گزرے ہیں۔ سید غلام غوثؒ کی وفات سنہ ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں اور شاہ حاکمؒ کا وصال سنہ ۱۰۴۰ھ (سنہ ۱۶۳۰ء) میں ہوا۔ ''شیخ حق آگاہ'' اور ''مکمل شیخ'' سے سنہ وصال نکلتے ہیں۔ لاہور سے
۱۰۴۰ھ ۱۰۴۵ھ

کچھ فاصلے پر دریائے راوی کے کنارے بمقام علی پور دونوں بزرگوں کے مزارات واقع تھے۔ جب دریا کٹاؤ کرتا ہوا مزارات کے قریب آیا تو نعش ہائے سید غلام غوثؒ، شاہ حاکمؒ اور سید عوض علیؒ قبر سے نکال کر دیگر جگہ مدفون کردی گئیں۔ جب میتیں نکالی گئیں تو اللہ کے کرم و فضل سے بالکل تر و تازہ تھیں حتیٰ کہ کفن تک بھی میلا نہ ہوا تھا۔

سید جان محمد حضوری لاہوریؒ = آپ مرید اپنے والد شاہ نورؒ بن سید محمود حضوریؒ [اولاد امام موسیٰ کاظمؒ] کے اور صاحب عظمت و ہیبت نیز مرجع خلائق بزرگ ہوئے

ہیں۔ ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) میں وصال ہوا۔ "فیض دین سائیں" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۶۵ھ

حضرت سید عبدالرزاق شاہ چراغ لاہوریؒ = آپ مرید اپنے والد سید عبدالوہاب بن سید عبدالقادر ثالث بن سید محمد غوث بالا پیر بن سید زین العابدین بن سید عبدالقادر ثانی بن سید محمد غوث اوچی کے تھے۔ جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے جد (دادا) نے فرمایا کہ ہمارے گھر چراغ پیدا ہوا ہے۔ پس تبھی سے شاہ چراغ مشہور ہوئے۔ آپ کو سیاحت کا بہت شوق تھا۔ شاہجہاں آپ کا بہت معتقد تھا۔ ۲۲ ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) کو وصال ہوا۔ "مراتب تجلی قطب معنی"
۱۰۶۸ھ
سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ شاہجہاں نے آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ والد کے پہلو میں دفن ہیں۔

حضرت سید مصطفیؒ = مرید اپنے والد، سید عبدالرزاق شاہ چراغ کے تھے۔ ۱۳ شعبان المعظم ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) کو وصال ہوا۔ "سید مصطفیٰ جمال بہشت" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ والد کے پہلو میں دفن ہیں۔
۱۰۸۲ھ

حضرت شیخ شاہ محمد ملا شاہ قادریؒ = خلیفہ اعظم میاں میرؒ کے تھے۔ آپ کی کنیت اخوند اور لقب لسان اللہ تھا۔ آپ کے والد، ملا عبدعلی قریہ روستاق اقلیم بدخشاں میں واقع ارکسان کے رہنے والے تھے۔ آپ وہیں پیدا ہوئے لیکن بعد میں طلب حق دامن گیر ہوئی اور کشمیر ہوتے ہوئے لاہور تشریف لے آئے نیز میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے اور وہیں رہنے لگے۔ آپ صاحب دیوان بھی تھے۔ ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۸ء) میں وصال ہوا۔ "محبوب اعظم" اور "قطب شیخ اولیاء"
۱۰۶۹ھ ۱۰۶۹ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف درگاہ میاں میرؒ میں زیارت گاہِ خلق ہے۔

حضرت حاجی عبدالجمیلؒ = آپ خلیفہ شیخ زنگی بلاولؒ کے، وہ مرید شیخ مادھوؒ کے اور وہ مرید شیخ حسین لاہوریؒ کے تھے۔ ''درگاہ قدم'' دہلی دروازہ کے باہر آپ ہی نے تعمیر کرائی تھی ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) میں وصال ہوا۔ ''محبوب شیخ الجمیل'' سے

۱۰۸۲ھ

سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف متصل روضۂ قدم رسولؐ واقع ہے۔

حضرت حاجی محمد ہاشم گیلانیؒ = آپ سادات عظام گیلانی اور سید محمد غوثؒ کی اولاد سے تھے۔ شجرہ اس طرح سے ہے: سید محمد ہاشمؒ بن سید صفی علیؒ بن سید بدرالدینؒ بن سید اسماعیلؒ بن سید عبداللہ ربانی بن سید محمد غوث حلبی اوچی گیلانی۔ آپ ممالک عرب و عجم و شام و عراق کی سیر کرتے ہوئے نیز مشائخ عظام سے مستفید و مستفیض ہوتے ہوئے لاہور وارد ہوئے۔ ۱۲۰ برس کی طویل عمر پائی۔ ۷/محرم الحرام ۱۰۸۷ھ (۱۶۷۶ء) بروز جمعہ وصال پایا۔ ''ماہتاب ہاشمی قطب صفا''

۱۰۸۷ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

حضرت سید محمد فاضل متوکلؒ = آپ سید ہاشم گیلانی کے فرزند اور صاحب توکل و عبادت و ریاضت نیز دائم الصیام بزرگ تھے۔ اورنگ زیب آپ کا بہت معتقد تھا۔ ۲/ذی الحجہ ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) کو وصال ہوا۔ ''قطب الہند فاضل'' سے سنہ

۱۱۱۲ھ

وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف متصل خانقاہ سید اسماعیل محدثؒ ہے۔ آپ کا بلند و بالا گنبد دار مقبرہ اور ایک خوشنما مسجد اورنگ زیب نے تعمیر کرائے تھے۔ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں دیگر مقابر کے ساتھ آپ کے مزار سے بھی پتھر اکھاڑ لیے گئے۔

حضرت شاہ رضا قادری شطاری لاہوریؒ = آپ مرید قاضی شیخ محمد فاضل لاہوری کے تھے، وہ مرید شیخ الہ داد قادری اکبر آبادیؒ کے، وہ مرید شیخ محمد جلالؒ کے، وہ مرید سید نورؒ کے، وہ مرید سید زین العابدین حسینیؒ کے، وہ مرید شیخ عبدالغفورؒ کے، وہ مرید شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ کے اور وہ مرید شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کے تھے۔

۱۲ر جمادی الاوّل ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) کو وصال ہوا۔ ''محبوب جہاں رضا'' اور ''ہادی زمن رضا'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۱۸ھ

۱۱۱۸ھ

حضرت شاہ درگاہی قادری لاہوریؒ = آپ خلیفہ حضرت عبدالرزاق شاہ چراغ گیلانیؒ کے تھے۔ شاہ چراغؒ کے ہمراہ لاہور وارد ہوئے۔ ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں وصال ہوا۔ ''قطب سردار شاہ درگاہی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف

۱۱۲۲ھ

متصل چاہ پاتیانوالہ واقع ہے۔

حضرت سید عبدالوہاب لاہوریؒ = آپ مرید اپنے والد، سید سرور دینؒ بن سید جان محمد حضوریؒ کے تھے۔ ۲۱ر شوال المکرم ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۸ء) بروز جمعہ وصال ہوا۔ ''افضل مکمل عبدوہاب'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۳۱ھ

حضرت سید بدرالدین گیلانی لاہوریؒ = آپ سید علیؒ بن حاجی سید محمد ہاشمؒ کے فرزند تھے۔ والدہ کا نام بی بی سید بی بی تھا جو سادات بخاری سے تھیں۔ محمد معزالدین جہاندار شاہ بادشاہ آپ کا بہت معتقد تھا۔ اس نے آپ کو یک لاکھ روپیہ اور بہت سی جاگیریں نذر کیں۔ ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۳ء) میں آپ کا وصال ہوا۔

''بدر دین پیر دین شریف'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۱۳۶ھ

حضرت شاہ عنایت قادری شطاریؒ = آپ شاہ رضا قادری شطاری لاہوریؒ کے مرید تھے ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸ء) میں وصال ہوا۔ ''تاجِ یقین اہلِ عنایت'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۱۴۱ھ

حضرت شاہ سلیمان قادریؒ = آپ صاحب سجادہ شاہ معروف چشتی قادریؒ کے تھے، سکر اور عشق و محبت میں شان عالی رکھتے تھے۔ صاحب کرامات اور خوارق تھے۔ ۱۲/ذیقعدہ ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) کو وصال ہوا۔
''شیخ دین کامل''، ''سلیمان پیر شاہنشاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۶۵ھ ۱۰۶۵ھ

سید عبدالرزاق بھاکریؒ = آپ اپنے والد سید عبدالخالق بھاکریؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ وفات ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء) میں ہوئی۔ ''حبیب اللہ عاشق عبدرزاق'' سے
۹۴۳ھ
سنہ وصال نکلتا ہے۔ سید جان محمد حضوری کے روضہ کے متصل مزار شریف واقع ہے۔

میر نعمت اللہ [المشہور بہ سید مبارک لاہوریؒ] = سید عبدالقادر ثانی اوچیؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ قادریہ سلسلہ کے اعظم مشائخ میں شمار ہوتا تھا۔ پنجاب میں تشریف لاکر لاہور کی سکونت اختیار کی۔ ہمایوں کے عہد حکومت میں ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) میں وصال ہوا۔ ''ولی میر جہاں والی نعمت'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۹۶۲ھ

رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں ایک امیر دربار، خوشحال سنگھ نے آپ کے مزار

شریف کے متصل اپنی حویلی تعمیر کی اور احاطہ وغیرہ مسمار کر دیا۔ مزار شریف و بھی نقصان پہنچا۔

سید کامل شاہ لاہوریؒ = سادات عظام بخاری سے تھے۔ شیخ اللہ داد مدار کی کی خدمت میں حاضر ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ ۷ رصفر المظفر ۱۰۰۵ھ (۱۵۹۶ء) کو وصال ہوا۔ ''شاہنشاہ کامل قطب عالم'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ موضع بو سابو

۱۰۰۵ھ

متصل بیرون شہر میں مزار شریف واقع ہے۔

پیر عزیز الدین لاہوریؒ [المشہور بہ پیر عزیز فرنگ'' (یا نیرنگ'')] = عہد اکبری میں ولایت غور سے لاہور شریف لا کر مقیم ہوئے۔ فرنگ (یا نیرنگ) مغلوں کی ایک شاخ ہے۔ ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) میں وصال ہوا۔ ''کاشف برکت'' سے سنہ وصال

۱۰۲۳ھ

نکلتا ہے۔

سید عبدالخالقؒ = آپ سید عبدالواسع بن سید عبدالملک بھاکریؒ کے صاحبزادے، عظیم مشائخ قادریہ میں سے، مرید و داماد سید محمود حضوریؒ کے اور صاحب خوارق و کرامات تھے۔ ۹۰۷ھ (۱۵۰۱ء) میں وصال ہوا۔ ''عبد خالق اہل دین''

۹۰۷ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

میر سید شاہ فیروزؒ = جامع علم و حلم و سیادت و نجابت و ریاضت و از سادات عظام گیلانی تھے، لاہور کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ اپنے جد، شاہ عالم سے، وہ شاہ نواز الدین سے، وہ شیخ احمدؒ سے، وہ شیخ حامدؒ سے، وہ شیخ عبدالرزاق سے، وہ سید عبداللہ گیلانی سے، وہ شیخ احمد قادریؒ سے، وہ سید میرؒ سے، وہ سید مسعودؒ سے، وہ سید علی سے، وہ سید صوفیؒ سے اور وہ سید عبدالوہاب نور العین سید الکونین غوث الثقلین عبدالقادر جیلانیؒ سے بیعت تھے۔

آپ کا ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں وصال ہوا۔ "قطب الاصفیاء فیروز شاہ" سے

۹۳۳ھ

سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف تکیہ ڈنڈی میں واقع ہے۔

سید عبداللہ شاہ گیلانیؒ [المشہور بہ پیر روڑانوالہؒ] = سادات عظام گیلانی سے، زہد و ریاضت میں طاق بزرگ ہوئے ہیں۔ پہلے آپ بغداد سے ایران تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے ہند وارد ہو کر لاہور کی سکونت اختیار کر لی۔ ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) میں وصال ہوا۔ "شاہ عبداللہ تاج الاصفیاء" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۶۵ھ

شیخ موسیٰ قادریؒ [المشہور بہ موسیٰ کھوکھرؒ] = شیخ بہلول دریائی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ شیخ حسین لاہوریؒ آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ شیخ بہلولؒ کے چار نامی گرامی خلفاء ہوئے اول شیخ حسین لاہوریؒ، دوم شیخ موسیٰ کھوکھرؒ، سوم شیخ صدر انصاریؒ (مزار شریف قصبہ قصور میں واقع ہے۔) اور چہارم شیخ ارزانیؒ (پٹنہ میں مزار شریف واقع ہے۔)

۵ محرم الحرام ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) بروز پنجشنبہ وصال ہوا۔ "محب مہربان موسیٰ ثانی"

۱۰۲۵ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف بیرون لاہور بطرف جنوب واقع ہے۔

سید عبدالقادر بھاکریؒ = آپ سید عبدالوہابؒ کے فرزند، لاہور کے سادات عظام و اولیائے ذوی الکرام میں سے، جامع علوم ظاہر و باطن و واقف اسرار شریعت و طریقت تھے۔ ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں وصال ہوا۔ "سید محمود عبدالقادر" سے

۱۰۴۵ھ

سنہ وصال نکلتا ہے۔

میر عنایت اللہ [المشہور بہ مسکین شاہؒ] امری لاہوریؒ = میاں میر بالا پیرؒ کے مرید و خلیفہ نیز کمالاتِ ظاہری و باطنی میں یکتا تھے۔ سنہ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں وصال ہوا۔ ''ولی درویش مسکین شاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۵۲ھ

شاہ رستم غازی لاہوریؒ = شاہ عبدالحق سے بیعت تھے جو چند واسطوں سے سید عبدالرزاقؒ خلف الصدق حضرت غوث الاعظمؒ سے بیعت تھے۔ سنہ ۱۰۶۰ھ (۵۰/۱۶۴۹ء) میں وصال ہوا۔ سنہ وصال ''رستم دین رہنما'' سے نکلتا ہے۔

۱۰۶۰ھ

مزار شریف باغ زیب النساء بیگم کے متصل واقع ہے۔

سید جعفر علی گیلانیؒ = آپ حاجی محمد ہاشم علی بن صوفی علی گیلانیؒ کے صاحبزادے، صاحب کرامات اور اپنے والد سے بیعت تھے۔ ۱۹ رجمادی الثانی سنہ ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) بروز پنجشنبہ پیدا ہوئے اور ۹ ررجب المرجب سنہ ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ء) بروز شنبہ وفات پائی۔ ''جعفر مقدس متقی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف انھی والے تکیہ، لاہور میں واقع ہے۔

۱۱۰۷ھ

سید عمر گیلانیؒ = سید محمد ہاشم گیلانیؒ کے مرید و خلیفہ نیز فرزند تھے۔ ۱۶ رشعبان المعظم ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) بروز یکشنبہ وفات پائی۔ ''عمر واصل شرع حق'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۱۵ھ

شاہ شرف لاہوریؒ = آپ کے والد جو قوم سے ہندو کھتری اور رہنے والے قصبہ بٹالہ کے تھے، نے اسلام قبول کر لیا تھا اور بٹالہ ہی میں قانونگوئی کے عہدہ پر مامور ہو گئے تھے۔ آپ بٹالہ سے لاہور آ کر شیخ محمد فاضل قادری شطاریؒ سے بیعت ہو گئے

تھے۔ ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴ء) میں وصال ہوا۔ ''محبوب دین تاج الشرف'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۱۳۷ھ

سید رحیم اللہ بھا کریؒ = آپ اپنے والد، سید عبداللہؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ۷ا محرم الحرام ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) کو وصال ہوا۔ ''خلیلِ عشق'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۱۴۰ھ

سید عبداللہ بھا کریؒ = اپنے والد، سید عبدالقادر بھا کریؒ کے مرید و خلیفہ، مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ لاہور میں علم مشیخت کا طالبانِ حق کو درس دیتے تھے۔ ۹ رمضان مبارک ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء) کو وصال ہوا۔ ''نور اکرامت عبداللہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۹۰ھ

سید حاجی عبداللہ گیلانیؒ = والد کا نام سید اسماعیلؒ بن سید قاسمؒ بن سید صوفیؒ بن سید بدرالدینؒ بن سید اسماعیلؒ بن سید عبداللہ ربانیؒ تھا۔ نواب ذکریا خاں ناظم لاہور آپ کا بہت معتقد اور مرید تھا۔ ۱۱ ربیع الثانی ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸ء) کو وصال ہوا۔ ''اہل نعمت مقتدا'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۱۴۱ھ

شیخ محمد عظیم قادریؒ = سید شاہ مقیم محکم الدینؒ ساکن حجرہ کی اولاد سے تھے اور بیرونِ لاہور دریائے راوی کے کنارے موضع کوٹ بیگم کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں وصال ہوا۔ ''اہلِ ہدا پاک محمد عظیم'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۱۸۱ھ

شیخ محمود قادریؒ = شیخ محمد عظیم قادریؒ کے فرزند اور سید صدرالدینؒ بن سید عبدالرزاقؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں وفات ہوئی۔ ''محتشم محمود میر بے نیاز'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۲۱۶ھ

سید عادل شاہؒ [المشہور بہ سید تھو گیلانی] = آپ سید فاضلؒ بن حاجی محمد ہاشم کے فرزند، عالم و عامل اور عارف و کامل بزرگ تھے۔ ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۸ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں وصال ہو گیا۔ ''محرم اسرار عشق'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۲۲۰ھ

شاہ سردار قادری شاہیؒ = شیخ جان محمد قادریؒ کے مرید، نہایت بزرگ و عابد و زاہد تھے۔ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں وصال ہوا۔ ''سردار ملک سیرت'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۲۲۵ھ

حضرت سید جیو عبدالقادر ثالثؒ = اپنے والد، سید محمد غوث بالا پیرؒ کے مرید تھے۔ محلہ رسولپور میں رہتے تھے۔ ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۳ء) میں وصال ہوا۔

آپ کی دو صاحبزادیاں، بی بی کلاںؒ اور بی بی دولتؒ تھیں جن کی شادیں بالترتیب میراں محمد شاہ موج بخاریؒ اور سید نظام الدین بن سید میر میراں بن سید مبارکؒ بن سید محمد غوثؒ سے ہوئی تھیں۔

حضرت شاہ غلام نبیؒ = مرید اپنے بزرگوں کے تھے لیکن فیضان روحانی حضرت مخدوم گنج بخشؒ سے بھی حاصل کیا تھا۔ ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء) میں وصال ہوا۔

حضرت سید جعفرؒ = آپ مرید اپنے والد، سید ہاشمؒ بن سید صوفی علیؒ گیلانی کے تھے۔ ۹ رجب المرجب ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ء) کو وصال ہوا۔ مزار شریف اہلی والے تکیہ میں واقع ہے۔

حضرت سید عبدالحلیم گیلانی = آپ سید بایزیدؒ کے فرزند تھے۔ آپ کے بزرگ ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ء) میں ایران سے ہند وارد ہوئے اور پھر ۹۳۴ھ (۱۵۲۷ء) میں سید نجم الدینؒ بابر کے ہمراہ دہلی تشریف لے آئے۔ آپ کے دادا، نظام الدینؒ پہلے ہی لاہور آ رہے تھے۔ آپ لاہور ہی میں پیدا ہوئے۔

بعد تحصیل علوم ظاہری شیخ عبداللہؒ جن کا سلسلۂ بیعت غوث الاعظمؒ پر منتہی ہوتا ہے، سے بیعت ہوئے۔ ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ء) میں وصال ہوا۔

سید شاہ بلاقؔ لاہوریؒ = آپ سید عبدالکریم لاہوریؒ المشہور بہ پیر بہاونؒ کے والد اور صاحب جذب و استغراق بزرگ تھے۔ سلسلۂ قادریہ میں چند واسطوں سے نسبت میاں میر بالا پیرؒ سے تھی جو اس طرح سے ہے۔ سید شاہ بلاقؔ مرید شاہ عبدالرشید لاہوریؒ کے، وہ مرید شیخ محسنؒ کے، وہ مرید شیخ محمد المشہور بہ ملا شاہؒ کے اور وہ مرید میاں میر بالا پیرؒ کے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔ مزار شریف لاہور میں متصل چوبارہ چھجو واقع بتایا گیا ہے۔

سید عبدالکریم جو اپنے والد شاہ بلاقؔ کے مرید تھے، کا وصال البتہ ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں ہوا، سنہ وصال "متقی پیشوا سید کریم" سے نکالا گیا ہے۔ مزار شریف بمقام میرپور واقع ہے۔ ۱۲۱۳ھ

۲۔ "نقشبندیہ" ("خواجگان") سلسلے سے وابستہ صوفیاء کرام

حضرت شیخ محمد طاہر لاہوری نقشبندی مجددیؒ = آپ خلیفہ حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ کے تھے۔ پہلے سلسلۂ قادریہ میں شاہ سکندرؒ بن شاہ کمال کیتھلی کے مرید رہ چکے تھے۔ بعد میں طریقہ چشتیہ، نقشبندیہ اور قادریہ میں صاحب اجازت ہوکر لاہور میں مامور ہوئے۔ ۸ محرم الحرام ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) بروز پنجشنبہ بوقت چاشت وصال ہوا۔ "شیخ کمال" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۴۰ھ

آپ کے خلفاء میں سے شیخ ابو احمد قادری نقشبندی لاہوری در شیخ لاہور میں آسودہ ہیں۔

حضرت خواجہ خاوندؒ [المشہور بہ حضرت ایشانؒ] = آپ خواجہ علاؤ الدین عطارؒ کی اولاد سے، مادرزاد ولی اور مرید خواجہ ابو اسحاق سعیدؒ کے تھے۔ فیضان خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ کی روح سے بھی حاصل کیا تھا۔ ۱۲ / شعبان معظم ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) کو وصال ہوا۔ "منبع فیض" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف

۱۰۵۲ھ

شالامار باغ کے متصل واقع ہے۔ بعد وصال بھی آپ کی ہزاروں کرامتیں ظہور میں آئیں۔

حضرت شیخ سعدی بخاری مجددی لاہوریؒ = خلیفہ شیخ آدم بنوریؒ کے تھے۔ وہ خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تھے۔ بعد وصال شیخ کے لاہور میں مقیم ہوکر ہدایت خلق میں مشغول ہو گئے تھے۔ ۳ / ربیع الثانی ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ء) بروز چہارشنبہ

وصال ہوا۔ ''سعدی عارف اکبر فقیر'' سے سن وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف پیر
۱۱۰۸ھ
عزیز فرنگ کے نام سے مشہور ہے۔

حاجی محمد سعید لاہوریؒ = سلسلۂ مجددیہ میں آپ مرید حافظ سعد اللہؒ کے اور سلسلۂ قادریہ میں مرید سید محمود بن سید علی حسینیؒ بسلسلۂ شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کے تھے۔ ۱۱۰ سال کی عمر میں ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) میں وصال ہوا۔ ''سحر معرفت حاجی سعید'' سے سن وصال نکلتا ہے۔
۱۱۶۶ھ

سید محرم علی نقشبندی لاہوریؒ = آپ قطب وقت تھے۔ حضرت مولانا فخر الدین دہلویؒ نے آپ سے ملاقات کر کے آپ کے فقر اور کمال کی بہت تعریف کی ہے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔

شیخ حامد لاہوریؒ = آپ حضرت شیخ آدم بنوریؒ کے خلیفہ تھے۔ ۲۲ر جمادی الآخر ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) بروز پنجشنبہ وصال ہوا۔ ''شیخ حامد کامل'' سے سن وصال نکلتا ہے۔
۱۰۵۴ھ

شیخ محمود شاہ قادری مجددی لاہوریؒ = شیخ عبد الکریم مجددیؒ کے مرید تھے اور وہ شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ کے مرید تھے۔ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں وفات پائی۔ ''شاہ عاقبت محمود'' سے سن وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف حضرت جھوتن شاہ بخاریؒ کے مزار کے متصل ہے۔
۱۲۸۳ھ

۳۔ "سہروردیہ" سلسلے سے وابستہ صوفیاء کرام

سید جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ

سید ناصر الدین محمود نوشہیؒ

سید علم الدینؒ — سید احمد بخاریؒ [المخاطب بہ ذی نوبہار صاحب دستار]

سید جلال الدینؒ — سید رکن الدینؒ [المخاطب بہ ابوالفتح بخاری اوچی]

سید علم الدین ثانی — سید محمد شاہؒ

سید نظام الدین — سید حامد

سید عثی الدینؒ — سید بہاؤالدین

سلطان جلال الدین حیدرؒ — میراں محمد شاہؒ [المشہور بہ موج دریا بخاریؒ] — سید محمود اوچیؒ

سید عثمان جھولا بخاریؒ

سید صفی الدینؒ — سید عبدالرحیمؒ — سید ولد زندہ علی — سید شہاب الدین نہراؒ — سید شاہ محمد جھولا بخاریؒ

سید علاءالملکؒ — سید بہاؤالدینؒ — شاہ عالمؒ — سید بہاون شاہؒ — سید محمود

[سید جھولن شاہ بخاریؒ] — [المشہور بہ

[المشہور بہ گھوڑی شاہ بخاریؒ] — [نورنگ جھولا بخاریؒ]

سید عارف شاہؒ — سید شہبازؒ [متوفی ۱۰۴۱ھ]

سید کھیوکی شاہؒ [متوفی ۱۰۵۰ھ]

[مفصل شجرہ احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') میں ملاحظہ فرمائیں۔]

حضرت سید عثمان لاہوریؒ [المشہور بہ جھولا بخاریؒ] = آپ سادات اوچ کی اولاد سے تھے۔ جب لاہور میں تشریف لائے تو مرجعِ خلائق ہوئے۔ ۱۸ ربیع الاول ۹۱۲ھ (۱۵۰۶ء) کو وصال ہوا۔ ''امیرِ عثمان'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ شہنشاہ

۹۱۲ھ

اکبر نے جب قلعہ تعمیر کرایا تو مزار شریف قلعہ کے اندر آگیا۔ ''پنج پیر'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

سید شاہ محمد جھولا بخاری لاہوریؒ = ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں وصال ہوا۔ مزار شریف موضع بلکھوا، علاقہ لاہور میں واقع ہے۔ ''شہ محمد عارف ربانی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۱۱ھ

سید بہاؤ الدینؒ [المشہور بہ سید جھوتن شاہ بخاریؒ و گھوڑی شاہ بخاریؒ] = آپ مادرزاد ولی تھے۔ محض پانچ برس کی عمر سے ہی ظہورِ کرامات ہونے لگے تھے۔ وفات ۱۰ ربیع الاول ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں ہوئی۔ ''جھوتن شاہ نامور'' یا

۱۰۰۳ھ

''عالم اسرار جھوتن شاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۰۳ھ

سید محمودؒ [المشہور بہ شاہ نورنگ جھولا بخاریؒ] = آپ اہلِ دنیا سے بے نیاز، فقر و تجرید میں شانِ عالی رکھتے تھے۔ ایک دن ارشاد فرمایا کہ جو کوئی میری قبر کی خاک کا تعویذ بنا کر گلے میں ڈالے گا ان شاء اللہ شفایاب ہوگا۔ چنانچہ اہلِ لاہور آپ کے مزار سے سنگریزے لے کر بیمار کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ وفات ۱۰۵۳ھ (۱۶۴۳ء) میں ہوئی۔

''شہ مستقیم محمود'' اور ''شمعِ عشاق سید محمود'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۵۳ھ ۱۰۵۳ھ

سید عماد الملکؒ = آپ اولیائے لاہور سے گزرے ہیں۔ آپ کی وفات ۱۰۲۹ھ (۱۶۱۹ء) میں ہوئی۔ "عماد الملک مخدوم زمانہ" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۲۹ھ

آپ کا مزار سید حجوتی شاہ گھوڑی بخاری کے مزار کے سامنے تھا۔ سکھوں کی عملداری میں جب آپ کا مزار مسمار کیا گیا تو دیکھا کہ نعش بدستور رکھی تھی۔ عُرس بھی میلانہ ہوتا تھا۔

حضرت موسیٰ آہن گر لاہوریؒ = آپ شیخ عبدالجلیل چوہڑ بندگی لاہوری کے خلفائے نامدار میں سے ہوئے ہیں۔ ابتدائی دور میں شیخ شہ اللہ بن یوسف [ولد شیخ الاسلام شیخ بہاؤ الدین ملتانی] سے ملتان میں بیعت ہوئے تھے۔ شیخ شہ اللہ کے وصال کے بعد شیخ عبدالجلیل سے بیعت ہوئے۔ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ لوہار کا کام کرتے تھے۔ سلطان ابراہیم لودی کے عہد میں سنہ ۹۲۵ھ (۱۵۱۹ء) میں وصال ہوا۔ "اہل دین موسیٰ شہ ابرار" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

روضۂ عالی کا رنگ سبز تھا۔ ۹۲۵ھ

حضرت شیخ حسن گنجد [المشہور بہ حسو تیلیؒ] لاہوریؒ = آپ شاہ جمال لاہوری کے خلیفہ تھے۔ اوائل دور میں نمد فروشی کا کام کرتے تھے جو بعد میں شیخ کے کہنے پر چھوڑ دیا تھا۔ سنہ ۱۰۱۲ھ (۱۶۰۳ء) میں وصال ہوا۔ "شیخ اہل نمد" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۱۰۱۲ھ

حضرت شیخ جان محمد لاہوریؒ = مرید اسماعیل میاں کلاں لاہوریؒ کے تھے۔ لاہور میں محلہ پرویز آباد میں رہتے تھے سنہ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں وصال ہوا۔ "شیخ دین جان محمد" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۱۱۲۰ھ

حضرت سید عبدالرزاقؒ [المشہور بہ سید مکیؒ] = آپ مرید میراں شاہ موج دریا کے تھے۔ غزنی سے آکر چندے پشاور میں قیام کیا، بعد میں دہلی میں ملازمت اختیار کر لی۔ آخیر عمر میں اہل دنیا سے متنفر ہو کر اور شب و روز عبادت میں مصروف رہ کر ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں لاہور میں وفات پائی۔ ''محسن فیض'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۴۸ھ

حضرت شیخ محمد اسمٰعیل مدرسؒ [المشہور بہ میاں کلاںؒ] = شیخ عبدالکریمؒ کے مرید تھے۔ ۲۵ برس کی عمر میں لاہور میں محلہ نیل پورہ آکر تعلیم و تلقین میں مصروف ہو گئے۔ ایک جائے قیام مخدوم علی ہجویریؒ پر کیا۔ بعد ازاں محلہ کے نزدیک واقع ایک پرانی مسجد میں درس قرآن فرمانے لگے تھے۔ ۹ شوال المکرم ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴ء) میں وصال ہوا۔ ''شیخ دینِ عالی'' اور ''خواجہ مہدی قطب'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۸۵ھ ۱۰۸۵ھ

حضرت شیخ جان محمد سہروردی لاہوریؒ = ایک مسجد جو لاہور سے باہر تھی، اس میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ مرید شیخ محمد اسمٰعیل مدرس میاںؒ کے تھے ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) میں وصال ہوا۔ ''شیخ دینِ حق'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف متصل مسجد قصاب خانہ قدیم واقع ہے۔
۱۰۸۲ھ

حضرت سید سلطان جلال الدین حیدرؒ = آپ فرزند سید صفی الدین بخاریؒ کے نیز حقیقی بھائی میران محمد شاہ موج دریا بخاریؒ کے اور کمال ظاہری و باطنی اور ترک و تجرید میں اپنی مثال آپ تھے۔ ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء) میں وصال ہوا۔ ''خواجہ کشاف'' اور ''عاشق مقتدا'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۱۶ھ ۱۰۱۶ھ

مزار شریف لاہور میں بی بی حاج و تاج کے پاس ہے۔ عوام آپ کے روضہ کو استاد حضرات بیبیاں کہتے ہیں۔

حضرت شیخ سکندر شاہؒ = آپ فرزند شیخ کرم شاہ قریشی [م ۱۲۰۱ھ (۱۷۸۶ء) شہید] کے نیز درویش صاحب حال و قال اور شاعر بھی تھے۔ ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں وفات پائی۔ "عارف اکبر سکندر شاہ" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۱۴ھ

مزار شریف شیخ عبدالجلیل قطب اعلم کے مزار مبارک کے متصل ہے۔ آپ کے دو بھائی اور تھے جو دونوں ولی اللہ ہوئے ہیں۔ نام ان کے یہ ہیں شاہ مراد قریشی [م ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) موضع ملک مردان کھوکھرہ] اور شیخ قلندر شاہ قریشی حارثی ہنکاریؒ [م ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) ۲۶ رمضان المبارک]۔ شیخ قلندر شاہ کے بھی ایک فرزند شاہ غلام محی الدینؒ تھے جو پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔

آپ کے والد، شیخ کرم شاہ بن ابوالفتح بن ابوالحسن ثانی بن فخر الدین بن ابوالفتح بن برخوردارؒ بن ابوالفتح بن عبدالجلیل قطب اعلم لاہوریؒ تمام عمر بدلت خلق خدا میں مشغول رہے۔ سکھوں کے خروج کی وجہ سے وہ نقلِ مکانی کر کے اپنے ایک عزیز، شیخ نورالحسنین قریشی عقیلیؒ کے پاس مع اہل و عیال چلے گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد لاہور واپسی پر راستے میں شاہجہان پور کے قریب شہید کر دیئے گئے۔ "شہادت یافت" سے ان کا سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۰۱ھ

شاہ مراد قریشی لاہوریؒ = اپنے والد، شیخ کرم شاہؒ سے بیعت، نہایت عابد و زاہد و متقی نیز صاحب تصانیف تھے۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں وصال ہوا۔ "شاہ کرامت بمراد" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۱۵ھ

سید فضل شاہ ساگر سانڈہؒ = شیخ قلندر شاہؒ کے خلفائے نامدار ہوئے ہیں۔ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں وصال ہوا۔ ''داخلِ خلد'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف

۱۲۶۹ھ

موضع سانڈہ متصل لاہور واقع ہے۔

حضرت میراں محمد شاہؒ [المشہور بہ موج دریا بخاریؒ] = آپ کے والد کا نام نامی سید صفی الدینؒ تھا جو سید جلال الدین سرخ بخاریؒ کی اولاد سے تھے اور روحانیت و معرفت میں ید طولی رکھتے تھے۔ آپ ۹۴۰ھ (۱۵۳۳ء) میں اوچ شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ ہی کی دعاؤں کے طفیل اکبر چتوڑ فتح کر سکا۔ [تفصیل ص ۱۳۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔] ۷۳ سال کی عمر میں ۱۷ ربیع الاول ۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴ء) کو خان فقا کہ بٹالہ میں انتقال ہوا مگر حسب وصیت لاہور میں مدفون ہوئے۔ ''محمد شاہ سلطان کاشف دیں'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ آپکی اہلیہ بی بی فاطمہ سیدہ گیلانیؒ (م ۱۰۱۳ھ/۱۰۱۶ھ) بنت سید عبدالقادر ثالثؒ بھی ولیہ تھیں۔

سید شہاب الدین نہراؒ = آپ حضرت میراں محمد شاہؒ کے فرزند اور قطب الوقت نیز صاحب ہدایت و کرامت و خوارق بزرگ تھے۔ ۹۶۵ھ (۱۵۵۷ء) کو پیدا ہوئے اور ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) میں وصال ہوا۔ ''شاہ شہاب الدین نہرا'' سے

۹۶۵ھ

سنہ پیدائش اور ''شہاب الدین ولی ثانی'' سے سنہ وصال نکلتے ہیں۔

۱۰۴۱ھ

حضرت شیخ عبدالجلیل قریشی حارثی الہنکاری لاہوریؒ [المعروف بہ قطب عالم چوہڑ بندگیؒ] = آپ اپنے والد، شیخ ابوالفتحؒ کے مرید، صاحب کرامت اور قطب وقت تھے۔ سلسلۂ نسب اس طرح سے ہے شیخ عبدالجلیلؒ بن ابوالفتحؒ بن عبدالعزیزؒ بن

شہاب الدینؒ بن نور الدینؒ بن سلطان التارکین حمید الدین ابوالعیثؒ حاکم بادشاہ کچھ ہ۔ آپ ''دلائل الخیرات'' بہت پڑھتے تھے اور جس پر مہربان ہوتے اس کو ''دلائل الخیرات'' پڑھنے کی ہدایت فرماتے۔ یکم رجب المرجب ۹۱۰ھ (۱۵۰۴ء) کو آپ کے یہاں ایک مجلس تھی جس میں بہت سے صوفیہ کرام موجود تھے کہ آپ سجدہ میں گئے اور وصال فرما گئے۔ لاہور شہر کی آبادی (اس وقت) سے باہر لا کر دفن کر دیے گئے۔ ''مہتاب جہاں تاب'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۹۱۰ھ

حضرت شیخ حامد قادری سہروردیؒ = والد کا نام شیخ حسنؒ تھا۔ آپ عالم، علم شریعت و طریقت و ماہر قرأت تھے۔ لاہور میں طلبا کو درس دیتے تھے اور مولوی تیمور لاہوری کے مرید تھے۔ وفات ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) میں ہوئی۔ ''حافظ و حامد حسنؒ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۱۱۶۶ھ

حضرت شیخ قلندر شاہ قریشی حارثی ہنکاریؒ = آپ اپنے والد، شیخ کرم شاہ کے مرید تھے اور دیگر مشائخ سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ سلسلۂ چشتیہ میں مرید شیخ بدر الدین صابریؒ اور باقی سلاسل میں شیخ اجمل الہ آبادیؒ سے بھی اجازت یافتہ تھے۔ ۲۱/۲۶ رمضان المبارک ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) کو وصال ہوا۔ ''باغ ارم جا'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۱۲۴۸ھ

حضرت شاہ جمال قادری سہروردی لاہوریؒ = آپ کا سلسلۂ طریقت یہ ہے آپ مرید شیخ لکڑا بیگؒ کے، وہ شاہ شرفؒ کے، وہ شاہ معروفؒ کے، وہ شیخ جعفر الدینؒ کے، وہ شیخ رفیع الدین سہروردیؒ کے، وہ شیخ جمالؒ کے، وہ شیخ صدر الدین عارفؒ کے، وہ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے۔

آپ سادات حسینی سے تھے۔ آپ نے لاہور آ کر پہلے سات منزلہ خانقاہ بنائی۔

نواب سعادت بیگم بنت اکبر بادشاہ کا باغ اور تالاب نزدیک تھا۔ اس نے اعتراض کیا تو آپ نے ہنس کر فرمایا کہ یہ عمارت آج کی رات پست ہو جائے گی اور گھر فقیر کا تا قیامت رہے گا۔ باغ چند روزہ ہے۔ رات کو آپ نے سماع کرایا اور حالت وجد میں کھڑے ہو کر زمین پر پیر مارا، پس تمام منزلیں بجز تین منزل کے، پست ہو گئیں۔

منقول ہے کہ جس جگہ آپ کے مزار شریف کا تعویز ہے اس کے نیچے حجرے میں آپ حسب معمول چلہ کشی میں مصروف تھے اور حجرے کے دروازے مکمل طور پر بند تھے۔ آپ مسلسل تیس دن تک حجرے میں بند رہ کر یاد الٰہی میں مشغول رہے۔ تیسویں دن [۱۴ ربیع الثانی ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) کو] بارش اس شدت سے ہوئی کہ آپ کے حجرے کی ایک دیوار گر پڑی۔ خادموں نے چاہا کہ حجرے کا دروازہ کھول کر آپ کو باہر نکالیں کہ ناگاہ اندر سے آواز آئی کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اس حجرے کو ہی میرا مدفن تصور کرو اور اس کے اوپر میری قبر کا تعویز بنا دو۔ چنانچہ آپ کے منہ بولے بیٹے، شیخ فخر الدینؒ نے حجرے کو ہی مزار کی شکل دے دی۔ "فیض محسن" سے آپ کا سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۴۹ھ

سید زندہ علیؒ= والد بزرگوار کا نام سید عبدالرحیم بن سید تقی الدین بن سید لعل محمد شاہ موج دریا بخاری تھا۔ والد کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔ بہت بڑے زاہد و متقی بزرگ تھے۔ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) میں وفات پائی۔ "معظم" (۱۰۵۰ھ) سے سنہ ولادت اور "نور بہشت زندہ باد" (۱۱۱۱ھ) سے سنہ وصال نکالے گئے ہیں مقبرہ شاہ موج دریا بخاری میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

۴۔ "چشتیہ" سلسلے سے وابستہ صوفیاء کرام

حضرت شیخ حاجی عبدالکریم چشتی لاہوریؒ = آپ مخدوم الملک شیخ عبداللہ انصاریؒ کے صاحبزادے اور سیدنا حضرت ابوایوب انصاریؒ کی اولاد سے نیز شیخ نظام الدین بلخی صابریؒ کے مرید تھے۔ آپ اپنے پیر مرشد کے ہمراہ بلخ میں رہے لیکن والد کی اندوہناک موت کے بعد لاہور میں آکر ہدایتِ خلق اللہ میں مشغول ہو گئے تھے۔ تفصیل احقر کی کتاب "تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ" جلد اول ("دودمانِ عالی") میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) کو وصال ہوا۔ "مقتدائے شفیق" سے سنہ
۱۰۴۵ھ
وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف باغ زیب النساء کے متصل ہے۔

حضرت شیخ عبدالخالق لاہوری چشتی صابریؒ = آپ شیخ جان اللہ لاہوری کے خلیفہ، اعلیٰ درجہ کے درویش اور صاحب سماع بزرگ تھے۔ ۱۲ رجب المرجب ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) کو وصال ہوا۔

صاحب "خزینۃ الاصفیاء" نے شیخ ابوالخالق چشتی صابریؒ نام سے بھی ایک بزرگ کا ذکر کیا ہے جن کو شیخ محمد سلیم چشتیؒ کا مرید بتایا گیا ہے اور ان کا سنہ وصال ۱۶ ذی الحجہ ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) تحریر کیا گیا ہے۔ نیز سنہ وصال "جان جنانِ میرِ خلق" سے نکالا گیا ہے۔
۱۱۳۸ھ

چونکہ دونوں بزرگوں کے سنہ وصال میں کافی فرق ہے اور دونوں ہی الگ الگ

شیخ کے مرید بتائے گئے ہیں اس لئے اغلب خیال یہی ہے کہ دونوں الگ الگ بزرگ ہوئے ہیں جن کے مزارات لاہور میں واقع ہیں۔

حضرت شیخ لاہوریؒ [المشہور بہ میاں عارفؒ] = آپ شیخ اسحاقؒ بن شاہ کاکو نظامی چشتیؒ کے مرید تھے۔ شہنشاہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں لاہور میں شیخ وقت کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۰۶۴ھ (۱۶۵۳ء) میں دورانِ اعتکاف وصال ہوا۔ "عارف چشتی" سے سنہ وصال نکالا گیا ہے۔ شیخ محمد طاہر مجددی لاہوریؒ کے

۱۰۶۴ھ

مزار کے قریب مزار شریف واقع ہے۔

حضرت شیخ محمد سلیم چشتی صابری لاہوریؒ = آپ شیخ محمد صدیق چشتی لاہوریؒ کے خلیفہ، نہایت بابرکت اور صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ ۳/ذی الحجہ ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۰ء) کو وصال ہوا۔ مزار شریف لاہور میں متصل مزار شریف پیر مرشد ہے۔ "فیضِ سلیم" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۳۰ھ

حضرت شیخ محمد صدیق چشتی صابری لاہوریؒ = آپ دن میں طلباء کو علومِ ظاہری کا درس دیتے اور شب کو طالبانِ حق کی تربیت فرماتے تھے۔ مرید و خلیفہ شیخ عبدالحق لاہوریؒ کے، وہ مرید شیخ عبدالجلیلؒ کے، وہ مرید شیخ محمد عرفائیؒ، وہ مرید شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ کے تھے۔ وصال ۸/ذی الحجہ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) کو ہوا۔ "رونقِ خلد" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۹۰ھ

حضرت شیخ محمد عارف چشتی صابری لاہوریؒ = آپ شیخ عبدالخالق لاہوری چشتی صابریؒ کے خلیفہ تھے۔ ۷/ذی الحجہ ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء) کو وصال ہوا۔

حضرت شیخ جان اللہ صابری لاہوریؒ = شیخ نظام الدین بلخیؒ کے خلیفہ اور علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ اوائل دور میں لاہور میں طلباء کو درس دیتے تھے۔ اس کے بعد تھانیسر جا کر شیخ نظام الدینؒ کے مرید ہوئے اور شیخ کے ہمراہ حج کرنے کے بعد بلخ میں خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ پھر لاہور میں آ کر خدمت خلق کرنے لگے۔ ۹ر جمادی الثانی ۱۰۳۹ھ (۱۶۲۹ء) کو وصال ہوا۔

حضرت شیخ حاجی رمضان چشتی لاہوریؒ = آپ خواجہ سلیمان چشتیؒ کے خلیفہ اور عالم و زاہد نیز صائم الدہر بزرگ تھے۔ حالتِ فقر اور تجرید سے گزارتے تھے۔ ۵ر رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) میں پیدا ہوئے اور ۳ر رمضان المبارک ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) کو وفات پائی۔ ''کامل زندہ دل رمضان'' سے سنہ وصال

۱۲۸۲ھ

نکلتا ہے۔ مزار شریف شیخ محمد طاہر لاہوریؒ [سلسلۂ ''قادریہ'' میں ملاحظہ فرمائیں۔] کے متصل ہے۔

حضرت شیخ بخش لاہوریؒ = سید حیدر علی شاہؒ کے مرید تھے۔ تجرید اور تفرید کے ساتھ ایام گزاری کرتے تھے۔ پیشہ ریشم سازی کا تھا۔ نہم رجب المرجب ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) کو وصال ہوا۔

حضرت شیخ خیر الدین خیر شاہؒ [المشہور بہ چشتی لاہوریؒ] = پنجاب کے مشہور شاعر ہوئے اور مرید شیخ محمد اسلم لاہوریؒ کے تھے۔ ۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) کو وصال ہوا۔

مولانا ملا عبدالسلام لاہوریؒ = آپ شہر لاہور کے معتبر فاضل تھے اور علم فقہ میں عالی رتبہ رکھتے تھے۔ تقریباً پچاس سال مسندِ افادہ و افاضہ پر متمکن رہے۔ (تفسیر) ''بیضاوی'' پر آپ کا حاشیہ ہے۔ کچھ عرصے شاہی لشکر کے مفتی بھی رہے۔

شاہجہاں بادشاہ نے آپ سے اکثر مروجہ کتابیں بھی پڑھیں۔ غرضیکہ آپ علمائے زمانہ میں افضل تھے۔ ۹۶۷ھ (۱۵۵۹ء) میں مولانا سعید ترستانی سفر حجاز کے ارادہ پر ہندوستان تشریف لائے لیکن کنہیں وجوہات کے سبب ولایت ماوراء النہر کی طرف لوٹ جانا پڑا۔ ان کے بقول ''عالموں میں مولانا عبدالسلام لاہوریؒ ایک ہی سربرآوردہ وقت ہیں۔'' ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) میں آپ کا وصال ہوا۔

شاہ کاکو = آپ شیخ نورالدین قطب العالمؒ کے خلیفہ اور چند واسطوں سے بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی اولاد سے تھے۔ شیخ پیر محمد لاہوریؒ سے بھی فیضان حاصل کیا تھا اور بعد تکمیل وعطائے خرقہ خلافت لاہور میں مقرر ہوئے۔ آپ سے بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں۔ ۸۸۲ھ (۱۴۷۷ء) میں وصال ہوا۔ ''شاہ اکبر شاہ کاکو'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۸۸۲ھ

سید اللہ بخش لاہوریؒ = آپ حضرت شیخ نظام الدین بلخیؒ کے مرید وخلیفہ تھے۔ وہ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ کے، اور وہ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ آپ صائم الدہر، قائم اللیل بزرگ تھے۔ محض ایک مٹھی کھلیں آٹھ دن میں آپ کے افطار میں خرچ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ ترک اور تجرید کے ساتھ رہے۔ اکثر لوگ آپ کو لاہور میں ''خدا بین'' اور ''بعضے خدا نما'' کہتے تھے۔

شیخ اللہ داد لاہوریؒ = آپ بھی حضرت شیخ نظام الدین بلخیؒ کے مرید وخلیفہ تھے۔ آپ نے اکثر کو صاحب ہدایت بنایا۔

شیخ عبدالکریم لاہوریؒ = آپ بھی حضرت شیخ نظام الدین بلخی کے مرید وخلیفہ تھے۔ صاحب کشف وکرامات بزرگ ہوئے ہیں۔

شیخ پیر محمد لاہوریؒ = شاہ کاکو کے پیر ومرشد تھے۔

شاہ سر ربانی سلیم الدین لاہوریؒ = شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ کے خلفائے معظم میں سے صاحب ذوق وشوق و وجد و سماع بزرگ تھے۔ خرقۂ خلافت عطا فرمانے کے بعد پیر روشن ضمیر نے لاہور روانہ فرمایا جہاں آپ نے طالبان حق کو درس دیا۔ ۷۴۹ھ (۱۳۴۸ء) میں وصال ہوا۔ ''زبدہ دین سر ربانی سعید'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۷۴۹ھ

۵۔ خانوادہ ہائے متفرق

سید ابوتراب [المعروف بہ شاہ گداؒ] حسینی قادری شطاری لاہوریؒ = آپ کا شجرۂ نسب اس طرح سے ہے: سید ابوترابؒ بن سید نجم الدینؒ بن شمس الدینؒ بن اسدالدینؒ بن زین الدینؒ (المشہور بہ زین العابدینؒ) بن یونسؒ بن عبدالوہابؒ بن عبدالہادیؒ بن ابوالبرکاتؒ بن انور علیؒ بن عبداللطیفؒ بن محمد شریفؒ بن ابوالمظفرؒ بن عبدالباقیؒ بن ابوالحسنؒ بن عبدالعزیز شیرازیؒ بن عبداللہؒ بن محمد امینؒ بن قدرت اللہؒ بن سید موسیٰؒ بن مسعودؒ بن صادقؒ بن احمدؒ بن سید باقرؒ بن حسنؒ بن زیدؒ بن جعفرؒ بن محمودؒ بن ہارونؒ، امام موسیٰ کاظمؒ بن امام جعفر صادقؒ

آپ کا اصل وطن شیراز تھا۔ وہاں سے مرشد کی تلاش میں ہندوستان وارد ہوئے اور گجرات میں شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ کی خدمت میں پہنچے اور مرید ہوئے۔ ان کے وصال کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔

آپ کے چھ نامدار خلفاء ہوئے:۔

اوّل قاضی محمد لاہوریؒ۔ مزار شریف آپ کے مزار کے متصل لاہور میں ہے۔

دوم۔ شیخ فاضلؒ۔ دہلی میں مدفون ہیں۔

سوم۔ شاہ جمالیؒ۔ روہتاس میں مدفون ہیں۔

چہارم: لعل گداؒ۔
پنجم: احمد گداؒ۔
ششم: شہباز گداؒ
— تینوں کے مزارات آپ کے مزار کی حریم میں واقع ہے۔

۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء) میں وصال ہوا۔ "شہ ولی سید گدائے بوتراب" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۷۱ھ

شیخ وجیہہ الدین [المشہور بہ پیر زہدیؒ] لاہوریؒ = آپ جامع علوم ظاہری و باطنی، واقف اسرارِ خفی و جلی اور مقتدائے زمانہ تھے۔ مختلف سلاسل میں مختلف بزرگوں سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد آپ لاہور تشریف لائے اور سکونت اختیار کر کے ہدایتِ خلق میں مشغول ہو گئے۔ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں وصال ہوا۔ "خلیلِ عشق" اور "مقدس شیخ زہدی" سے سنہ وصال نکالا گیا ہے۔

۱۱۴۰ھ ۱۱۴۰ھ

شیخ فتح شاہ شطاری لاہوریؒ = آپ شاہ لطیف برہان پوریؒ کے اعظم خلفاء میں سے ہوئے ہیں جن کی سید محمد غوث گوالیاری تک نسبت اس طرح سے ہے۔ شاہ لطیف مرید شیخ برہان سرالہیؒ کے، وہ مرید شیخ عیسیٰ زندودیؒ کے، وہ مرید شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ کے اور وہ مرید سید محمد غوث گوالیاریؒ کے۔ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں وصال ہوا۔ "شیخ دین فتاح ابواب زمن" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۵۰ھ

خواجہ ایوب قریشی لاہوریؒ = صاحب کشف و کرامات بزرگ اور "سہروردیہ" سلسلہ میں مولانا مفتی حافظ محمد تقی لاہوریؒ کے مرید تھے۔ ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں وصال ہوا۔ "شیخ حق کامل ولی" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۵۵ھ

میر محمد یعقوب گیلانی لاہوریؒ = آپ کا سلسلہ نسب اس طرح سے ہے بن میر محمد زمانؒ بن میر محمد حاجیؒ بن میر صدر الدینؒ بن سید نور الدینؒ بن سید بدر الدینؒ بن سید جعفرؒ بن سید احمدؒ بن سید موسیٰؒ بن میر صدرؒ بن شاہ قمیصؒ قادری بن ابی الحیات

بن تاج الدین محمودؒ بن بہاؤ الدین محمدؒ بن جلال الدین احمدؒ بن سید علی جمال الدین بن قاضی ابو صالح نصرؒ بن سید الآفاق شیخ عبد الرزاقؒ بن حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ۔

آپ سلسلۂ ''قادریہ'' میں مرید سید فضل علی لاہوریؒ کے، وہ مرید شیخ عبد الرحیم جار اللہؒ کے، وہ حاجی محمد سعید لاہوریؒ کے تھے۔

آپ کی وفات ۲۹ رصفر المظفر ۱۱۷۹ھ (۱۷۶۵ء) کو ہوئی۔ سنہ وصال ''خورشید جہاں'' اور ''یعقوب مخدوم الکریم'' سے نکالی گئی ہے۔

۱۱۷۹ھ ۱۱۷۹ھ

شاہ حسین لاہوریؒ = آپ کے والد کا نام سید عبد القادرؒ بن سید حمید گیلانی تھا۔ سادات گیلانی سے صاحب خوارق وکرامت، زاہد ومتقی، عالم وعامل بزرگ ہوئے ہیں۔ ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) کو وصال ہوا۔ ''شاہ عاشق مکرم حسین''

۱۲۰۵

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف اندرون شہر محلہ سید مٹھہ میں واقع ہے۔

مولوی غلام فرید لاہوریؒ = لاہور کے عظیم علماء میں شمار ہوتا تھا۔ ظاہری وباطنی کمالات سے آراستہ وپیراستہ تھے۔ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں وصال ہوا۔ ''تاج اخیار''

۱۲۱۶ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

مفتی رحیم اللہ لاہوریؒ = آپ مفتی رحمت اللہ قریشی لاہوریؒ کے صاحبزادے، عالم و فاضل اور عابد وزاہد بزرگ تھے۔ سلسلۂ نسب چند واسطوں سے شیخ الاسلام مخدوم بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ سے ملتا ہے۔ آخر عمر میں مسجد کوٹلی مفتیان میں درسِ قرآن مجید دینے میں مشغول ہو گئے تھے۔ ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء) میں وصال ہوا۔ ''رحیم اللہ فاضل'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۳۵ھ

مولوی غلام رسول لاہوریؒ = آپ مولوی غلام فرید فاضل لاہوریؒ کے صاحبزادے اور مولانا با توقیر و فاضل کبیر تھے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔

سید منور علی لاہوریؒ = آپ غوث الاعظم حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد سے اور سلسلہ ''سہروردیہ'' میں اپنے والد سید صابرؒ سے بیعت ہوئے۔ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں وصال ہوا۔ ''منور ولی ستارہ نور'' سے سنہ وفات نکلتی ہے۔

۱۲۶۴ھ

حسب وصیت شیخ محمد طاہرؒ کے مزار مبارک کی چہار دیواری میں دفن ہوئے۔

شیخ لدھی شاہ لاہوریؒ = عابد و زاہد و متقی و خدا ترس و صاحب علم و خلق نیز خاندان ''قادریہ'' سے تھے۔ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں وصال ہوا۔ ''مظہرِ حق'' سے سنہ وفات نکلتی ہے۔

۱۲۵۳ھ

مولوی غلام اللہ فاضل لاہوریؒ = آپ مولوی غلام فریدؒ کے صاحبزادے اور جید عالم باعمل تھے۔ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں وصال ہوا۔ ''غلام اللہ حق آگاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۷۲ھ

مفتی غلام محمد قریشی لاہوریؒ = آپ مفتی رحیم اللہ قریشیؒ کے صاحبزادے اور جید عالم و فاضل بزرگ ہوئے ہیں۔ ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں وصال ہوا۔ ''خورشید دینِ محمد'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۷۶ھ

سید حمید لاہوریؒ = آپ کے والد کا نام سید سعیدؒ تھا جو سید عبدالقادر گیلانی لاہوریؒ کی اولاد سے تھے۔ شجرہ اس طرح سے ہے سید سعیدؒ بن شیخ محمد بن حاجی ابوبکرؒ بن سید عبدالقادر گیلانی لاہوریؒ۔

آپ کی تمام عمر ہدایتِ خلق میں بسر ہوئی۔ ۲۴ محرم الحرام ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء)

کو وصال ہوا۔ ''صدر دین سخی حمید'' اور ''اعظم الاولیاء'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۹۰ھ ۱۰۹۰ھ

مولانا عبدالرحمٰن لاہوریؒ = شہر کے مشہور علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) میں وصال ہوا۔ خوابگاہ لاہور میں ہے۔

مولانا حسان الدین لاہوریؒ =
مولانا حسام الدین سُرخ لاہوریؒ =
دونوں بزرگ شہر میں مختلف فنون میں ملکہ تیز سلسلہ ''نقشبندیہ'' سے ارادت رکھتے تھے۔ دونوں کا وصال ۹۷۰ھ (۱۵۶۲ء) میں ہوا۔

سید احمد توختہ ترمذی ثم الاہوریؒ = آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح سے ہے سید احمدؒ بن سید علی ترمذیؒ بن سید حسین ثانیؒ بن سید حسین محمد مدنیؒ بن سید شاہ ناصر مدنیؒ بن سید موسیٰؒ بن سید علیؒ بن امام علی اصغرؒ بن امام زین العابدینؒ بن امام حسینؓ۔
آپ بایمائی ربانی واشارۂ غیبی ترمذ سے ہندوستان وارد ہو کر لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ مشائخ عظام اور سادات لاہوری میں سے تھے۔ ۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء) میں وصال ہوا۔ ''سید ولی میر کبیر'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ محلہ چہل
۶۰۲ھ
بی بی میں مزار مبارک واقع ہے۔

حضرت سید مٹھا لاہوریؒ = آپ کا اصل نام سید ابی غفار حسینیؒ ہے۔ نسبی شجرہ اس طرح سے ہے سید ابی غفارؒ بن سید جمال الدینؒ بن سید محمدؒ بن سید کریم الدینؒ بن سید نور الدینؒ بن سید آدمؒ بن سید علی جعفرؒ بن سید محمدؒ بن سید یوسفؒ بن سید محمودؒ بن سید احمدؒ بن سید عبداللہ اشتریؒ بن سید جعفرؒ بن سید محمد الجوادؒ بن امام علی رضاؒ بن امام موسیٰ کاظمؒ بن امام جعفر صادقؒ بن امام محمد باقرؒ بن امام علی زین العابدینؒ بن حضرت امام حسینؓ۔

جب خوارزم چنگیز خاں کی بربریت کا شکار ہوا تو آپ کے والد بہاء الدین خوارزم سے نقل مکانی کر کے ہندوستان تشریف لے آئے اور لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔

آپ بہت خلیق اور شیریں کلام تھے اسی لئے منبہ کے نام سے مشہور ہوئے اور جس محلہ میں آپ مقیم تھے اس کا نام بھی آپ ہی کے نام پر مشہور ہوا۔ ۶۶۱ھ (۱۲۶۲ء) میں وصال ہوا۔ "شیریں کلام" اور "صاحب نعمت" سے آپ کا سنہ وصال نکلتا ہے۔

۶۶۱ھ ۶۶۱ھ

سید اسحاق گازرونی لاہوریؒ [المشہور بہ میراں بادشاہ] = آپ صاحب مقامات بلند کرامات اور سادات عظام حسینی نیز اپنے وقت کے شیخ المشائخ وقطب الاولیاء میں سے ہوئے ہیں۔ نسبت ارادت شیخ اوحدالدین اصفہانی [م ۷۳۱ھ (۱۳۳۰ء)] سے تھی۔ گازرون میں مقیم تھے کہ باشارات غیبی ہندوستان وارد ہو کر لاہور کی سکونت اختیار کر لی اور ہدایت خلق میں مشغول ہو گئے۔

طویل عمر کو پہنچنے کے بعد ۷۸۶ھ (۱۳۸۴ء) میں وصال ہوا۔

نور الٰہی شاہ بو اسحاق" اور "سید محمود میراں بادشاہ" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۷۸۶ھ ۷۸۶ھ

۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) [دور شاہجہانی] میں حاکم لاہور، نواب وزیر خاں نے جامع مسجد اور آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

سید غیاث الدین گیلانی لاہوریؒ = آپ سید عبدالقادر گیلانی لاہوریؒ کے صاحبزادے، متقی و پارسا، صاحب جذب وشوق و ذوق بزرگ ہوئے ہیں۔ سلسلۂ نسب اس طرح سے ہے: سید غیاث الدین دولت شاہؒ بن سید عبدالقادر ثانیؒ بن سید جمال الدینؒ بن سید جلال الدینؒ بن سید یوسفؒ بن سید سلطان رشیدؒ بن سید ادہمؒ

بن سید محمودؒ بن سید اسمٰعیلؒ بن سید داؤدؒ بن سید فتح نصرؒ بن سید عبدالرزاقؒ بن غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔

آپ کی والدہ میر کفایت خاں، امیر ہمایونی کی دختر تھیں۔ آپ تین بھائی تھے۔ آپ سے بڑے سید سلطانؒ اور آپ سے چھوٹے سید ابوبکر حاجیؒ تھے۔ آپ کا ۲۱ رمضان المبارک سنہ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) کو وصال ہوا۔ ''افضل الاولیاء'' سے ۹۹۰ھ سنہ وصال نکلتا ہے۔

سید محمد غوث گیلانی لاہوریؒ = آپ کے والد کا نام سید فتح محمدؒ ان کے والد کا نام سید ابوبکرؒ اور ان کے والد کا نام سید عبدالقادر ثانی گیلانی تھا۔ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ والد کے وصال کے بعد ان کی مسند ارشاد پر تشریف فرما ہوئے۔ سنہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں وصال ہوا۔ ''تاج کامل سید الابرار'' ۱۰۰۴ھ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ والد کے مزار کے متصل مدفون ہوئے۔ اکبری عہد کے امراء میں سے نواب محمد زماں خاں نے مزار مبارک پر عالیشان گنبد تعمیر کرایا۔

مولانا میر کمال نیشاپوریؒ = آپ نیشاپور سے نقل مکانی کر کے لاہور تشریف لائے اور وہیں مقیم ہو گئے سنہ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں انتقال ہوا۔ مزار شریف سرائے حاجی سیاح میں واقع ہے۔

مولانا حاجی یار محمدؒ = آپ بہادر شاہ اوّل کے عہد میں فضلائے لاہور میں سے سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ جب بہادر شاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ خطبۂ جمعہ میں ''علی ولی اللہ وصی رسول اللہ'' کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے تو اہل سنت والجماعت نے آگرہ، احمد آباد و دیگر شہروں میں اس حکم کی مخالفت میں پرزور احتجاج کئے۔ احمد آباد میں تو جب خطیب نے اس پر عمل کیا تو ہجوم نے برافروختہ ہو کر اسے ته

تیغ کر ڈالا۔ لاہور میں بھی صورتِ حال نازک ہوگئی لیکن بادشاہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ بادشاہ نے توپ خانہ کے افسر کو حکم دیا کہ وہ جمعہ کے دن (۲/ اکتوبر ۱۷۱۱ء) بادشاہی مسجد کے منبر سے نئے احکام کے مطابق خطبہ پڑھے۔ اس پر اہلیانِ لاہور اور زیادہ مشتعل ہوگئے اور وہ لاکھوں کی تعداد میں شاہی احکام کی مخالفت کی غرض سے شہر کے گلی کوچوں اور سڑکوں پر جمع ہوگئے۔ صورتِ حال نازک دیکھ کر بادشاہ نے سُنّی علماء کو بحث و مباحثہ کے لئے مدعو کیا۔ ان علماء کے سرگروہ آپ تھے۔ آپ نے بادشاہ کو کھری کھری سنائیں۔ جب بادشاہ نے کہا کہ آپ میرے غضب سے نہیں ڈرتے تو آپ نے فرمایا کہ میری چار آرزوئیں تھیں حصولِ علم، حفظِ قرآن، حج اور شہادت۔ خدا کے فضل و کرم سے ان میں سے تین پوری ہو چکی ہیں اب زہے قسمت کہ چوتھی بھی حاصل ہو جائے۔ بالآخر بادشاہ کو احکام واپس لینا پڑا۔

آپ کا سنہ وصال نظر سے نہیں گزرا۔

شیخ رضی الدین عبدالغفورؒ = حضرت شیخ جامیؒ کے شاگرد تھے۔ وصال ۹۱۲ھ (۱۵۰۶ء) میں ہوا۔ مزار شریف لاہور میں واقع ہے۔

حضرت یعقوب زنجانیؒ (م ۲۶۰ھ) = تفصیلات ص ۲۰۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت موسیٰ زنجانیؒ (م ۴۴۰ھ) = تفصیلات ص ۲۰۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ ابو المعالی الہ آبادیؒ = "تحفۃ القادریہ" کے مصنف ہیں۔ جس میں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی سوانح عمری ہے۔ لاہور رہتے تھے۔ وہیں ۶/ اپریل ۱۶۱۵ء [۱۶/ ربیع الاوّل ۱۰۲۴ھ] کو انتقال ہوا۔

احمد ملا = ٹھٹھہ کے قاضی کے لڑکے تھے۔ آباء و اجداد سندھ کے باشندے اور فاروقی حنفی تھے لیکن ملا خود شیعہ عقیدہ کے تھے اور سنیوں کی دل آزاری کے واسطے خلفائے

ثلاثہ کو برا بھلا کہتے تھے چنانچہ مرزا فولاد برلاس (عہدِ اکبری میں) نے قاتلانہ حملہ کیا جس میں وہ تو بچ گئے لیکن مرزا کو اس جرم کے پاداش میں لاہور میں ایک ہاتھی کے پیر سے زندہ باندھ کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے دو چار دن بعد ہی ملا بھی مر گئے اور لاہور میں دفن ہوئے۔ بعد میں ان کی لاش کو نکال کر جلا دیا گیا۔ یہ واقعہ ۹۹۶ھ (۱۵۸۷ء) کا ہے۔

شیخ عبدالغفور لاہوریؒ = شیخ عبدالرحمٰن جامیؒ کے شاگرد اور مشہور مصنف تھے۔ ۶۶۳ھ (۱۲۶۴ء) میں وصال ہوا۔

شیخ قطب عالم لاہوریؒ = اصل نام شیخ نورالدین احمدؒ تھا۔ لاہور میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر ذکر و شغل میں گزاری۔ شیخ حسام الدین مانک پوریؒ آپ ہی کے خلیفہ تھے۔ ۸۴۸ھ (۱۴۴۴ء) میں وصال ہوا۔ مزار شریف موضع پنڈوا (بہار) میں واقع ہے۔

چند مجاذیب کے اسماء

تاجی شاہ مجذوبؒ = "عاشقِ مست کامل حق نما" (۱۲۶۱ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

فقیر نظام شاہ مجذوبؒ = "عاشقِ ازل سرمست" (۱۲۶۹ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

مستان شاہ مجذوبؒ = "ماہِ دیں شاہ مستان شاہ" (۱۲۷۳ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

مستقیم شاہ مجذوبؒ = "مستقیم روشن دل" (۱۲۴۰ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

معصوم شاہ مجذوبؒ = "مجذوبِ عشق" (۱۲۲۱ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

درویش محمد مجذوبؒ = سادات لاہور میں سے تھے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔

شیخ یوسف مجذوبؒ = بلند قامت اور جسیم شخصیت کے مالک تھے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔

[4] چند بزرگ/خاندان جو باہر سے لاہور وارد ہوئے

[مسلم حکمرانوں، خاص کر مغل بادشاہوں کی نوازشات، قدردانی کی وجہ سے مشائخ، نامور شجاع، علماء اور صوفیا وغیرہ اسلامی دنیا کے گوشے گوشے سے پہنچ کر ہندوستان وارد ہوئے۔ چنگیزی حملے بھی اس کا سبب بنے۔ غرضیکہ جو بھی خاندان یا فرد وہ جد ہندوستان وارد ہوا، لاہور اس کی اقامت گاہ یا چند روز رہگذر ضرور رہا۔]

شیخ الاسلام حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے مورثِ اعلیٰ، قاضی شعیب، فرخ شاہ کابلیؒ کی شہادت کے بعد اپنے تین صاحبزدگان اور دیگر متعلقین واہل وعیال کے ساتھ کابل سے ہند وارد ہو کر پہلے لاہور تشریف لائے اور بعد ازاں قصبہ قصور میں قیام فرمایا۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے آباؤ اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ اُن دنوں بخارا علم وتقویٰ کا خزانہ اور کان سمجھا جاتا تھا۔ حضرت شیخؒ کے پدری جد، خواجہ علی بخاریؒ اور مادری جد، خواجہ عربؒ ایک دوسرے کے ساتھی اور دوست تھے۔ یہ دونوں ایک ساتھ ہی بخارا سے پہلے لاہور وارد ہوئے اور پھر وہاں سے بدایوں تشریف لے گئے اور سکونت اختیار کر لی۔ ان دنوں بدایوں قبۃ الاسلام تھا۔ مزید تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

خواجہ علی بخاریؒ		خواجہ عرب بخاریؒ	
خواجہ احمد علی الحسین + زلیخاؒ		خواجہ عبداللہؒ	فرزند
		خواجہ سعیدؒ	
سلطان المشائخ حضرت		خواجہ عبدالعزیزؒ	
نظام الدین اولیاءؒ		خواجہ حسنؒ	

حضرت شیخ بدرالدین غزنویؒ (م ۶۵۷ھ (۱۲۵۸ء) پہلے غزنی سے لاہور تشریف لائے اور پھر بعد میں دہلی آ کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مریدین میں داخل ہو گئے۔

حضرت سید محمود حضوریؒ [م ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء)] (تفصیل ص ۲۱۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔) نے اپنے والد، سید شمس الدینؒ المشہور بہ شمس العارفین غوریؒ کے انتقال کے بعد غور سے تشریف لا کر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت سید عبدالقادر گیلانیؒ [م ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء)] (تفصیل ص ۲۱۸ پر ملاحظہ فرمائیں) نے بغداد سے نقلِ مکانی کر کے لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت شیخ ابواسحاق قادریؒ [م ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء)] (تفصیل ص ۲۱۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔) کرمان سے لاہور وارد ہوئے۔

حضرت سید شاہ بلاول قادریؒ [م ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء)] (تفصیل ص ۲۲۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔) کے بزرگ ہمایوں کے ہمراہ ہرات سے وارد ہو کر لاہور میں سکونت پذیر ہوئے۔

حضرت شیخ شاہ محمد ملا شاہ قادریؒ [م ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۸ء)] (تفصیل ص ۲۲۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔) علاقہ روستاق اقلیم بدخشاں سے تشریف لا کر لاہور میں مقیم ہوئے۔

حضرت سید عبداللہ شاہ گیلانیؒ [م ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء)] (تفصیل ص ۲۳۲ پر

ملاحظہ فرمائیں۔) نے بغداد سے تشریف لا کر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت سید عبدالحکیم گیلانیؒ [م ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ء)] (تفصیل ص ۲۴۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔) کے دادا، شیخ نظام الدینؒ نے ایران سے وارد ہو کر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت سید ابوترابؒ (المعروف بہ شاہ گداؒ) [م ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء)] (تفصیل ص ۲۵۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔) شیراز سے تشریف لا کر بالآخر لاہور میں مقیم ہوئے۔

حضرت سید احمد توختہ ترمذیؒ [م ۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء)] (تفصیل ص ۲۵۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔) ترمذ سے ہندوارد ہو کر لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔

حضرت سید مٹھہؒ [م ۶۶۱ھ (۱۲۶۲ء)] (تفصیل ص ۲۵۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔) کے والد، سید جمال الدینؒ نے خوارزم سے نقلِ مکانی کر کے لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت سید اسحاق گازرونیؒ [م ۷۸۶ھ (۱۳۸۴ء)] (تفصیل ص ۲۵۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔) نے گازرون سے وارد ہو کر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

مولانا میر کمال نیشاپوریؒ [م ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء)] (تفصیل ص ۲۵۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔) نے نیشاپور سے تشریف لا کر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

قاضی محمد اسلمؒ [م ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۱ء)] جو ہرات میں پیدا ہوئے اور کابل میں پروان چڑھے، نے جہانگیر کے اوائل دور میں لاہور وارد ہو کر شیخ بہلولؒ جو وہاں کے مشہور علماء میں سے تھے، کی شاگردی اختیار کی۔

فغفوری گیلانیؒ (شاعر) ایران سے قندھار اور پھر لاہور آ کر مقیم ہو گیا۔

مشہور صوفی بزرگ، شیخ سراج الدین عثمانؒ المعروف بہ اخی سراجؒ جو سلاطین بنگال میں سے تھے، لاہور ہی سے آ کر بنگال میں آباد ہوئے تھے۔

حضرت شیخ علاؤالحق والدینؒ (مرید شیخ اخی سراجؒ اور پیرو مرشد حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ) کے والد، حضرت شیخ عمر بادشاہ بنگال کے وزیر تھے اور ان کے والد،

حضرت شیخ اسعد لاہور کے رہنے والے تھے۔

قاضی سراج الدین [والد قاضی منہاج سراج جرجانی، صاحب "طبقاتِ ناصری"] کے آباؤ اجداد جوزجان کے رہنے والے تھے انھیں سلاطینِ غور کے دربار میں تقرب حاصل تھا۔ چنانچہ جب ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کا لاہور پر قبضہ ہوا تو قاضی سراج الدین لاہور میں غوری افواج کے قاضی مقرر ہوئے۔

نورالعین واقف نے بٹالہ سے آکر لاہور میں سکونت اختیار کی۔ اسی نسبت سے واقف لاہوری کے نام سے مشہور ہوا۔ وہیں اس کی شاعری نے نشوونما پائی۔ اس کا ایک دیوان ملتا ہے جس میں ۸ سو غزلیں فارسی کی درج ہیں۔ سنہ ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) میں لاہور میں انتقال ہوا۔ ["قاموس المشاہیر" (جلد دوم) ص ۲۴۵]

منشی محبوب عالم جو ضلع گجرانوالہ میں ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے اور جنھوں نے ۱۸۸۸ء میں گجرانوالہ ہی سے ایک ہفتہ وار اخبار "پیسہ" نکالا، بعد میں لاہور منتقل ہو گئے تھے اور وہاں سے مذکورہ اخبار روزانہ جاری کیا۔ اس اخبار کے علاوہ انھوں نے "شریف بی بی" (لڑکیوں کے لئے) اور "انتخاب لاجواب" بھی ہفتہ وار نکالے۔ کئی وفود میں شامل ہو کر غیر ممالک کے سفر بھی کیے۔ ["قاموس المشاہیر" (جلد دوم) ص ۱۶۱]

مولوی محمد حسین آزاد جو مولوی باقر علی (مشہور "دہلی اردو اخبار" کے مالک و مدیر) کے فرزند، دہلی کے باشندہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے چہیتے شاگرد تھے (آزاد تخلص شیخ ابراہیم ذوق کی ہی دین تھی)، سنہ ۱۸۶۴ء میں لاہور آکر ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم کے دفتر میں ملازمت کی اور ایک سرکاری اخبار "اتالیق پنجاب" کے سب ایڈیٹر بھی رہے۔ ۹ محرم ۱۳۲۸ء (۲۲ جون ۱۹۱۰ء) کو انتقال ہوا۔ ["قاموس المشاہیر" (جلد اوّل) ص ۷]

"العروض"، "مشارق الانوار"، مصباح الدجیٰ"، "کتاب الفرائض" اور "کتاب العبادت" (نامکمل) وغیرہ کے مصنف مولانا صغانی (حسن) کے بزرگ اصفہان (چغان) سے آکر لاہور میں مقیم ہوئے۔ وہیں ۱۵ صفر ۵۷۷ھ (۱۱۸۱ء) کو مولانا موصوف پیدا ہوئے لیکن ۶۵۰ھ (۱۲۵۲ء) میں بغداد جا کر وفات پائی اور وصیت کے مطابق مکہ معظمہ میں دفن ہوئے۔ ["قاموس المشاہیر" (جلد اوّل) ص ۱۹۴]

[۵] قابلِ دید چند یادگاریں

"بادشاہی مسجد" = اس کو مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے ٹھیک لاہور قلعہ کے سامنے اپنے دودھ شریک بھائی اور صوبیدار لاہور مظفر حسین المعروف بہ فدائی خان کوکہ کی زیر نگرانی تعمیر کرایا تھا۔ تعمیراتی کام مئی ۱۶۷۱ء میں شروع ہو کر ۱۶۷۳ء میں مکمل ہوا۔ یہ سرخی چونے کے مصالحہ میں پکی تھصوری اینٹوں سے چنی ہوئی ہے جس پر سنگ سرخ لگایا ہوا ہے۔ سکھوں کے عہد حکومت میں اس کو بری طرح نقصان پہنچایا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تو اس کو فوج کے گھوڑوں کے لئے بطور اسطبل استعمال کیا گیا۔ انھوں نے اس میں سے قیمتی پتھر جیسے سنگ مرمر، روبی اور سونا نیز دوسرا قیمتی سامان بھی نکال لیا۔ اس دور میں تو اس میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی بلکہ اس مقصد کے لئے انھیں مسجد سے ملحق ایک چھوٹا سا قطعہ آراضی دے دیا گیا تھا۔ جب انگریزوں کا لاہور پر تسلط ہوا تو انھوں نے اس پر قبضہ کر کے اس کو بندوق اور توپوں کی نشانہ بازی کے لئے استعمال کیا۔ انھوں نے اس خوف سے کہ کہیں مسلمان اس کو بطور قلعہ ان کے خلاف استعمال نہ کریں، اس کا کافی کچھ حصہ منہدم بھی کر دیا لیکن بعد میں مسلمانوں کو مسجد واپس کر دی گئی تھی۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۶۰ء کے عرصے میں اس کی "بادشاہی مسجد اتھارٹی" کے زیر نگرانی پوری طرح سے مرمت کرائی گئی جس پر ۴.۸ ملین روپیہ صرف آیا۔

یہ اسلام آباد کی "فیصل مسجد" کے بعد پاکستان کی دوسری سب سے بڑی مسجد ہے جس میں بیک وقت ۵۵،۰۰۰ نمازیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اس

کی ڈیزائن بالکل دہلی کی جامع مسجد جیسی ہے جس کو شاہجہاں نے ۱۶۴۸ء میں تعمیر کرایا تھا۔ فرق اتنا ہے کہ اس کی شمال والی دیوار دریائے راوی سے لگی ہونے (اس وقت) کی وجہ سے اس میں کوئی گیٹ نہیں دیا جا سکا اور Symmetry برقرار رکھنے کی خاطر اس کی جنوب والی دیوار میں بھی کوئی دروازہ نہیں دیا گیا۔

''لاہور کا قلعہ'' [شاہی قلعہ] = یہ قدیم لاہور کے شمال۔ مغربی گوشہ میں واقع اور Trapezoidal پلان میں ۲۰ ہیکٹیر زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کو مغل شہنشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا گو پہلے سے بھی اس مقام پر قلعہ رہ چکا تھا۔(۱) بعد میں بھی مختلف حکمرانوں نے اس میں اپنے لحاظ سے ترمیمات کرائیں۔ اس میں واقع ''شیش محل''، ''عالمگیری گیٹ''، ''نولکھا پویلین'' اور ''موتی مسجد'' قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ''شالیمار گارڈن'' اور اس پر "UNESCO" کی طرف سے World Heritage Site [عالمی وراثت والی جگہ] کندہ کرادیا گیا ہے۔

''عالمگیری گیٹ'' = لاہور کے قلعہ میں داخل ہونے کا اس وقت یہ صدر گیٹ ہے۔ اس کو شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں ''بادشاہی مسجد'' کے ٹھیک سامنے تعمیر کرایا گیا تھا۔ اس کی ڈیزائن اس طرح سے کی گئی ہے کہ شاہی لشکر کے ہاتھی معہ سوار کے اس میں سے بآسانی نکل سکیں۔

یہ لاہور سے ۵ کلومیٹر فاصلے پر شمال۔ مشرق کی جانب، گرانڈ ٹرنک روڈ کے کنارے باغبان پورہ کے قریب واقع ہے۔

''شالیمار گارڈن'' = اس کو مغل شہنشاہ شاہجہاں کے عہد حکومت میں ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) سے ایک سال کے عرصے میں امیر خلیل اللہ خان کی زیر نگرانی اور علی

مردان خان وملا علاؤ الملک تونی کے تعاون سے تعمیر کرایا گیا تھا۔ یہ اونچی اونچی پکی اینٹوں کی دیوار سے گھرا ایک Oblong Parallelogram (متوازی الاضلاع) کی شکل میں ہے۔ شمال سے جنوب تک اس کی لمبائی ۶۵۸ میٹر اور مشرق سے مغرب کی سمت میں اس کی لمبان ۲۵۸ میٹر ہے۔ ''لاہور قلعہ'' کے ساتھ ۱۹۸۱ء میں اس کو بھی "UNESCO" کی طرف سے بحیثیت World Heritage Site (عالمی وراثت کی جگہ) شمار کیا جاچکا ہے۔

گارڈن کی آبیاری کے لئے ۱۶۱ کلومیٹر فاصلے پر ''شاہ نہر'' (بعد میں یہ ''ہنستی نہر'' کے نام سے جانی گئی) کے نام سے ایک نہر بھی کھدوائی گئی جو گارڈن میں سے ہوتی ہوئی سنگ مرمر کے ایک بہت بڑے حوض میں گرتی تھی۔

اس میں تقریباً ۴۱۰ فوارے بھی تھے جو دن رات سنگِ مرمر کی چوڑی چوڑی نالیوں میں ابلتے رہتے تھے۔ آجکل کے انجینیروں کے لیے یہ ایک معمہ بنا ہوا ہے کہ وہ فوارے جاری کس طرح سے ہوتے تھے۔

اس میں مختلف عمارتیں بھی تھیں، جیسے ساون۔ بھادو، نقار خانہ، خواب گاہ، حمام، ایوان، آرام گاہ، مخصوص خوابگاہ (ملکہ کے لئے)، بارہ دریں، دیوان خاص وعام وغیرہ۔ گارڈن کے دو گوشوں میں میناروں کے ساتھ آمدورفت کے لئے دروازہ تھے۔

جس جگہ یہ گارڈن واقع ہے وہ اُس دور میں باغبان پورہ کے ایک امیر، میاں محمد یوسف کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے شہنشاہ کو یہ جگہ نذر کردی تھی جس پر شہنشاہ نے ان کو ''میاں'' کے خطاب سے نوازتے ہوئے اس گارڈن کا گورنر مقرر کردیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً ۳۵۰ سالوں تک یہ ان کی

اولاد کی تحویل میں رہتا چلا آیا لیکن ''میاں فیملی'' کے ''مارشل لا'' کی مخالفت کرنے پر جنرل ایوب خاں نے اس کو Nationalised کر دیا تھا۔

''مینارِ پاکستان'' = یہ ''اقبال پارک'' میں ''لاہور قرارداد'' (Lahore Resolution) کی یادگار بطور مغل اور عصرِ حاضر کے مشترکہ طرزِ تعمیر کی بنیاد پر تعمیر کرایا گیا ہے۔ اسی مقام پر ۲۳ رمارچ ۱۹۴۰ء یعنی آزادی سے تقریباً سات سال قبل، مسلم لیگ نے قیامِ پاکستان سے متعلق ایک قرارداد منظور کی تھی جو ''قراردادِ لاہور'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ برِّ صغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ آزاد مملکت کے قیام سے متعلق پہلی باضابطہ قرارداد تھی۔ اس لئے اس دن ہر سال پاکستان میں قومی تعطیل ہوتی ہے۔

اس کا ڈیزائن ایک داغستانی نژاد پاکستانی آرکیٹیکٹ نصیر الدین مراد خان نے تیار کیا تھا۔ ۲۳ رمارچ ۱۹۶۰ء کو اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس کی تعمیر میں آٹھ سال کا عرصہ لگا اور کل پانچ لاکھ روپیہ صرفہ آیا۔ یہ ایک سطحِ زمین سے ۲ میٹر اونچے پلیٹ فارم پر تعمیر کیا گیا ہے۔ پلیٹ فارم کے اوپر مینار کی کل لمبائی ۶۰ میٹر ہے۔ اس کے اندر گھماؤ دار ایک زینہ (Spiral stair case) دیا گیا ہے جس میں ۱۶۲ سیڑھیاں ہیں۔ مینار کا بالائی گنبد اسٹینلیس اسٹیل کا بنا ہے جس میں شیشے کے نازک ٹکڑے لگے ہیں۔ پورا Structure پتھر، سنگِ مرمر اور R.C.C کا بنا ہوا ہے۔ مینار کی کرسی چار چبوتروں پر مشتمل ہے۔ پہلا چبوترہ بناتراشے تکشل اپتھر سے، دوسرا ہتھوڑے سے تیار کئے گئے پتھر (Hammer Dressed Stone) سے، تیسرا چھینی سے تراشے گئے پتھر (Chiselled Stone) سے اور چوتھا پالش کئے گئے سنگِ مرمر جو پاکستان کی تحریک کو عیاں (Depict) کرتا ہے، سے بنایا گیا ہے۔ کرسی پر

سنگِ مرمر کی دس Converging زیبائشی تختیوں پر اردو، بنگالی اور انگریزی میں ''قرارداد لاہور'' کا متن جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور کیا گیا، کندہ کیا گیا ہے۔ کچھ زیبائشی تختیوں پر عربی میں قرآنی آیات، اللہ تبارک و تعالیٰ کے ۹۹ وصف، اردو اور بنگالی میں پاکستانی قومی ترانہ، اردو بنگالی اور انگریزی میں قائد اعظم محمد علی جناح کی تقاریر سے اقتباسات اور علامہ اقبال کے چند شعر کندہ کیے گئے ہیں۔

''مقبرہ انارکلی'' = یہ لاہور قدیم کے جنوب میں چیف سیکریٹری آفس کے پشت پر اور لوور مال پر واقع پنجاب سیکریٹریٹ کے احاطے میں واقع ہے۔ اس تک جانے کے لئے سیکریٹریٹ کے صدر گیٹ سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ چنانچہ صرف آفس کے اوقات میں ہی یہ ممکن ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ انارکلی، شرف النساء یا نادرہ بیگم کا خطاب تھا جو حرم سرا کی ایک کنیز کی دختر تھی اور جس سے شہزادہ سلیم کو محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ اکبر نے اس کو زندہ چنوا دیا تھا۔ اس واقعہ کے ۱۶ سال بعد جب سلیم شہنشاہ جہانگیر بنا تو اس نے یہ مقبرہ تعمیر کرایا۔ یہ کبھی ایک خوبصورت باغیچے کے بیچ و بیچ ہوا کرتا تھا لیکن اب اس کے چاروں طرف عمارتیں واقع ہیں۔ اسی مقبرہ کی وجہ سے جب انگریزوں نے یہاں فوجی چھاؤنی قائم کی تو اس پورے علاقے کا نام ہی انارکلی رکھ دیا۔ مقبرہ ''پلان'' (Plan) میں ہشت پہلو بنا ہوا ہے۔ اس کی ہر side یکے بعد دیگرے (Alternately) ۴۴ فٹ اور ۳۰ فٹ کی ہیں۔ انیسویں صدی کے پہلے وسط میں اس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جنرل Jean Baptiste Ventura کی آرمینیائی بیوی کے لئے بطور رہائش ۱۸۴۷ء سے اس کو برٹش ریذیڈنٹ، ہینری لارنس کے کلرکوں کے لئے بطور دفتر

۱۸۵۱ء سے بطور Divine Service اور ۱۸۵۷ء کے اوائل میں اس کو بطور ''سینٹ جیمس'' چرچ استعمال کیا گیا۔ پتھر کا تابوت جو عمدہ قسم کے سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور جس پر بہت ہی عمدہ نقاشی کا کام کیا ہوا ہے، کو جب اس مقبرہ کو بطور چرچ استعمال کیا گیا تو اٹھا کر الگ رکھ دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اصل قبر فرش سے ۵ فٹ نیچے بالکل صحیح حالت میں پائی گئی۔ اس کے بعد قبر کو پختہ اینٹوں سے چن کر اس پر پلاسٹر کر دیا گیا جس کے اوپر چاروں جانب اللہ کے ۹۹ نام کندہ کر دیئے گئے ساتھ ہی اس کے نیچے فارسی میں ایک بیت بھی کندہ کر دیا گیا۔ اس فارسی بیت کا لطیف نے انگریزی میں یہ ترجمہ کیا ہے: "Ah! Could I be hold the face of my beloved once more, I would give thanks unto my God untill the day of resurrection"

[آہ! اگر مجھے ایک بار اور اپنی محبوبہ کا چہرہ دیکھنے کو مل جاتا تو میں تا قیامت اللہ کا شکر ادا کرتا۔]

اس پر جو ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) اور ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء)، دو سنہ کندہ ہیں، وہ بالترتیب سنہ وفات اور تربت کے مکمل ہونے سے متعلق سنہ بتائے جاتے ہیں۔

اب تاریخ داں اس مقبرہ کو جہانگیر کی ایک بیوی، صاحبِ جمال کا بتاتے ہیں جس کا ۱۵۹۹ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔

اس میں لکڑی کا جو سجاوٹی کام تھا وہ غائب ہو چکا ہے۔ تمام روشندان بند کیے جا چکے ہیں اور اب یہ چونا پھرا ہوا محض ایک بڑا سا عمارتی ڈھانچہ بھر رہ گیا ہے۔ جب ۱۸۹۱ء میں اس میں سے گرجا گھر اپنی نئی عمارت میں چلا گیا تو اس کو پنجاب محافظ خانے کے بطور ریکارڈ آفس استعمال کیا جانے لگا تھا۔

''شاہ جہانگیر کا مقبرہ'' = اس کو شہنشاہ شاہجہاں نے جہانگیر کی وفات کے دس سال بعد تعمیر کرایا جو شاہدرہ میں پختہ چہار دیواری سے گھرے ایک خوشنما گارڈن میں واقع ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس کو نور جہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ مقبرہ کے اندر کا حصہ منقش دیواروں اور رنگین سنگِ مرمر سے مزین ہے۔ مقبرہ کے چاروں جانب والا گھیرا رنگ برنگی سنگِ مرمر کی پھول پتیوں اور قرآنی آیات سے سجایا ہوا ہے۔ مقبرہ کے اندر، بیچ و بیچ سفید سنگ مرمر کا تعویز ہے جس کے اطراف میں رنگین سنگ مرمر سے دلکش پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں، ٹھیک اسی طرح سے جس طرح آگرہ کے ''تاج محل'' میں موجود تابوت پر بنی ہیں۔ تابوت کے دو اطراف میں سنگِ موسیٰ سے اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام کندہ ہیں۔ جب خوشنما سنگ مرمر کی جالیوں سے روشنی چھن کر آتی ہے تو اندر کا ماحول بہت دلکش معلوم دیتا ہے۔

''علامہ اقبال کا مقبرہ'' = یہ ''حضوری باغ'' میں واقع ''بادشاہی مسجد'' کے جنوب۔ مشرق والے صدر گیٹ کے پاس واقع ہے۔ اس کو حیدرآباد دکن کے چیف آرکیٹیکٹ، نواب زین یار جنگ بہادر نے ڈیزائن کیا تھا اور اس کی تعمیر میں ۱۳ سال لگے۔

علامہ کے ۱۹۳۸ء میں وصال کے ٹھیک بعد ''اقبال مقبرہ کمیٹی'' تشکیل دی گئی جس کے صدر چودھری محمد حسین منتخب ہوئے۔ انھوں نے نامور آرکیٹیکٹس سے رابطہ قائم کر کے مقبرہ کا ایک ایسا نقشہ تیار کرنے کو کہا جو لاہور میں موجود مغل دور کی تعمیرات سے ہم آہنگ ہو لیکن اس کی نقل نہ ہو بلکہ موریش طرزِ تعمیر کی افغان تشریح سے تخلیقی تحریک حاصل کرنے والا ہو۔ چنانچہ مقبرہ کا موجودہ ڈیزائن افغان اور موریش، دونوں طرزِ تعمیرات کی مشترکہ ترجمانی کرنے والا ہے۔

مقبرہ کی تعمیر میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو برٹش سرکار نے پروجیکٹ کو منظوری دینے میں کافی تاخیر سے کام لیا، دوئم جب علامہ کے دوستوں، شاگردوں اور مداحوں سے عطیات قبول کرنے کے بعد تعمیراتی کام شروع کرایا گیا تو مکرانہ (راجستھان) سے سنگِ مرمر اور جے پور (راجستھان) سے سنگِ سرخ کی درآمدات پر عارضی طور سے بندش لگ جانے کے سبب کام کو روکنا پڑ گیا۔

مقبرہ میں دو دروازے لگے ہیں جو ٹیک کی لکڑی کے ہیں۔ تعویذ جس پتھر میں بنایا گیا ہے وہ بہت قیمتی ہے جس کو افغانستان کی سرکار نے بطور عطیہ دیا تھا۔ مقبرہ کے اندر علامہ کی ایک غزل (زبورِ عجم جو علامہ کے پیغام کی ترجمانی کرتی ہے) کے چھ اشعار لکھے گئے ہیں۔

"نور جہاں کا مقبرہ" = شاہدرہ، جہاں کبھی با ادب، با ملاحظہ ہوشیار کے فلک شگاف نعروں سے ماحول تھرا اٹھتا تھا وہاں آج ظلِ سبحانی کہلانے والے شہنشاہ جہانگیر اور ان کی بیگم، ملکہ نور جہاں محوِ خواب ہیں۔

مقبرہ کے اندر دو تعویز ہیں جن میں سے ایک میں نور جہاں اور دوسری میں اس کی بیٹی، لاڈلی بیگم (پہلے شوہر، شیر افگن سے) آرام فرما ہیں۔ قبر، جس میں نور جہاں دفن ہے، کو نور جہاں نے خود اپنی زندگی ہی میں تیار کرا دیا تھا۔

دیگر مغل دور کی عمارتوں (مساجد، مقابر، درگاہوں وغیرہ) کی طرح اس مقبرہ کو بھی سکھوں کے دورِ حکومت، بالخصوص مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں بہت بے دردی، بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ لوٹا اور تہس نہس کیا گیا۔ قیمتی پتھر اور ہیرے، جواہرات ان میں سے نکال کر امرتسر لے جائے گئے جہاں "گولڈن

نیمپل'' کی تعمیر میں ان کو استعمال میں لایا گیا۔ سکھوں کے لوٹنے کھسوٹنے کے بعد جو کچھ بچا کھچا تھا اس کو مزید نقصان برٹش عہدِ حکومت میں پہنچایا گیا۔ انھوں نے مقبرہ کے خوشنما گارڈن کی بے قدری کرتے ہوئے اس کے بیچ و بیچ سے انیسویں صدی کے اواخر میں ریلوے لائن نکالی اور اس کے ایک حصہ کو بطور رول ڈپو استعمال میں لایا گیا۔ پرانی شان واپس لانے کے لئے کھنڈر ہوگئے مقبرہ کی بعد میں مرمت کرائی گئی۔

<u>''ملک ایاز کا مقبرہ''</u> = ملک ایاز کے باپ کا نام ایماق ابوانجم (Aymaq Abu'n-Najam) تھا۔ وہ ایک ترک غلام تھا جو ایک معمولی عہدے سے ترقی کرتے کرتے جرنل کے عہدے پر پہنچا۔ <u>سنہ ۱۰۲۱ھ</u> (۱۶۱۲ء) میں سلطان محمود غزنوی نے لاہور پر قبضہ کرکے اسے اپنی غزنوی سلطنت میں شامل کر دیا اور ملک ایاز کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ چونکہ اس حملے میں لاہور کی کافی کچھ آبادی کم ہوگئی تھی اور املاک کو بھی کافی نقصان پہنچا تھا، اس لئے ملک ایاز نے دوبارہ عمارات کی مرمت کرانے کے ساتھ ساتھ کئی اہم عمارتیں تعمیر بھی کرائیں، جیسے حصارِ شہر کا صدر گیٹ، ایک پختہ قلعہ وغیرہ وغیرہ۔ کہتے ہیں کہ موجودہ قلعہ اسی پرانے قلعہ کے مقام پر واقع ہے۔ یہ مقبرہ رنگ محل کمرشیل علاقے میں واقع ہے۔

کہتے ہیں کہ راجپوتوں سے مقابلہ کرنے سے پہلے محمود نے ایاز کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ لشکر کے قیام کے لئے کوئی مناسب جگہ پسند کرلے۔ چنانچہ اس نے جو جگہ پسند کی تھی وہاں آج گوجرخان شہر آباد ہے۔ اس شہر میں ایاز کے نام سے ایک شاہراہ بھی ہے۔

''مقبرہ قطب الدین ایبک''= قطب الدین ایبک محمد غوری کا ایک ترک غلام تھا جو ترقی کرتے کرتے ہندوستان کا ۱۲۰۶ء میں پہلا سلطان بنا۔ تفصیل احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد چہارم (''تذکرہ جہانیاں'') میں ملاحظہ فرمائیں۔ دہلی کا ''قطب مینار'' اسی کی دین ہے۔ سنہ ۱۲۱۰ء میں پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر لاہور میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

''انارکلی بازار'' کی پشت پر اس کا مقبرہ واقع ہے۔ سنہ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں مقبرہ کی اس وقت کے وزیراعظم، ذوالفقار علی بھٹو کے حکم پر مرمت کرائی گئی تھی۔

[۲] مختلف مسلم ادوار میں کئے گئے چند تعمیراتی کام

[۱] مغلوں کی یلغار کے سبب لاہور شہر کی جو حصار شکستہ ہوگئی تھی اس کو ۶۶۶ھ (۱۲۶۷ء) میں جب غیاث الدین بلبن لاہور پہنچا تو اس نے اس کو از سر نو تعمیر کرایا اور نواح شہر جو بالکل برباد ہوگیا تھا، اس کو بھی آباد کیا۔

[۲] لاہور کی جامع مسجد اورنگ زیب کے عہد حکومت میں (۱۰...ھ میں) مکمل ہوئی۔

[۳] دور شاہجہانی میں حاکم لاہور، وزیر خاں حکیم علیم الدین (ص ۱۸۰) نے لاہور میں حمام، بازار، متعدد حویلیاں جامع مسجد، مقبرہ سید اسحاق گازرونی وغیرہ تعمیر کرائے۔

[۴] دور شاہجہانی ہی میں عنایت اللہ خاں (۲) نے لاہور میں عمارات، باغات پر پچاس لاکھ روپیہ خرچ کیے۔

[۵] دور شاہجہانی ہی میں علی مردان خاں امیر الامراء [م ۱۲ اپریل ۱۶۵۷ء] (ص ۱۸۷) نے اپنے لاہور کی صوبہ داری کے زمانے میں شہر کے قریب سے ایک نہر جاری کرائی جس سے متعدد فوائد کے علاوہ شہر کی رونق میں بھی اضافہ ہوا۔ (۳) اس کے علاوہ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں شہر سے ملحق علاقے میں ایک بہت عمدہ قسم کا باغ لگایا جس میں متعدد حوض، نہریں، فوارے اور بے شمار مختلف

اوقات میں تعمیر کرائے۔ یہ باغ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں خلیل اللہ خاں (ص ۱۸۴) کے اہتمام سے تکمیل پذیر ہوا۔ اس پر اس وقت آٹھ لاکھ روپیہ صرف آیا۔ اس باغ کا نام "شالامار" ہے۔ (تفصیل ص ۲۶۶، ۲۶۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

[۶] شیخ فرید مرتضیٰ خاں بخاری [م ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء)] (۴) نے لاہور میں ایک محلہ آباد کیا جس کا نام بھی اسی کے نام پر ہے۔ اس میں اس نے ایک حمام کلاں اور چوک بھی تعمیر کرائے۔

[۷] قطب الدین خاں (۵) جاگیردار پنجاب نے لاہور شہر میں "مراکز خیر" (بصورت عمارات) تعمیر کرائے۔

[۸] میر معین الدین احمد امانت خاں خوافی نے عہد عالمگیری میں بہت سی عمارتیں اور حمام تعمیر کرائے۔

[۹] علی مردان خاں؟ فتح خاں ثورانی [م ۱۰۶۳ھ (۱۶۵۳ء)] (ص ۱۷۷) نے لاہور سے ملتان تک سرائیں تعمیر کرائیں۔ (۶)

[۱۰] شہنشاہ جہانگیر نے لاہور میں ایک بہت عالی شان "شاہی مسجد" تعمیر کرائی جس کا متبادلہ شاہجہان کی دہلی میں تعمیر کرائی گئی "شاہی مسجد" سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جہانگیر نے لاہور میں بہت خوبصورت باغ بھی لگوائے۔ جہانگیر ہی نے ۱۶۱۵ء میں انارکلی کی قبر کو سنگ مرمر سے پختہ کرایا۔ کہتے ہیں کہ اس نے قبر پر فارسی میں یہ جملہ بھی کندہ کرایا تھا "اگر میں اپنی محبوبہ کا چہرہ ایک بار دوبارہ دیکھ پاتا تو قیامت تک اللہ کا شکر ادا کرتا۔" (ترجمہ) [تفصیلات ص ۲۶۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔] (۶)

[۱] شہنشاہ شاہجہاں نے لاہور میں جو خوشنما عمارتیں تعمیر کرائیں ان میں ''شیش محل''، ''نولکھا محل''، مساجد، حمام اور ''مسمن برج'' قابل ذکر ہیں۔ بیسویں سال جلوسِ شاہجہانی میں جب اندازہ لگایا گیا تو پتہ چلا کہ تب تک ۵۰ لاکھ روپیہ اس کے ذریعہ لگائے گئے باغات اور عمارات پر خرچ ہو چکے تھے۔(۷)

حواشی

(۱) جب ۱۹۵۹ء میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کی زیرِ نگرانی اس کے دیوانِ عام میں کھدائی کرائی گئی تو ۱۲ء۵ میٹر کی گہرائی پر محمود غزنوی کے عہد کے سونے کے سکے جن پر ۴۱۶ھ کندہ تھا ملے۔ اس گہرائی کے بعد بھی ۵ میٹر آگے تک محمود غزنوی کے اسے ۱۰۲۱ء میں فتح کر لینے سے کافی پہلے کے انسانوں کے یہاں رہنے کے آثار ملتے ہیں۔

(۲) عنایت اللہ خاں = اس کا سلسلۂ نسب سید جمال نیشاپوری تک پہنچتا ہے۔ اتفاق سے وہ کشمیر میں آکر مقیم ہوگیا۔ اس کے باپ کا نام مرزا شکر اللہ اور ماں کا نام حافظہ مریم تھا۔ حافظہ مریم، عالمگیر بادشاہ کی دختر زیب النساء کی تعلیم پر مامور رہی۔ جہاندار شاہ کے زمانے میں وہ صوبۂ کشمیر کا ناظم رہا۔ وہ پاکیزہ صورت، خوش وضع اور ایک متین امیر تھا۔ ۱۱۳۹ھ (۱۷۲۷ء) میں اس کا انتقال ہوگیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) حصہ دوم ص ۸۲۱ تا ۸۲۴]

(۳) ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں علی مردان خاں نے شاہجہاں سے عرض کیا کہ اس کے آدمیوں میں سے ایک شخص جو نہر کھودنے میں مہارت رکھتا ہے، ذمہ لیتا ہے کہ ایک نہر لاہور کے

قریب وجوار میں لائے۔ چنانچہ بادشاہ نے تجویز منظور کرتے ہوئے فوراً ایک لاکھ روپیہ مرحمت فرمادیا۔ اس شخص نے دریائے راوی، جو شہر کے قریب ہی سے بہتا تھا، کے منبع سے ایک نہر کھودنے کا کام شروع کراکر ایک سال سے کچھ ہی زائد عرصے میں کام انجام کو پہنچادیا۔ لیکن جتنے پانی کی توقع کی گئی تھی اتنا پانی اس نہر میں نہیں آیا۔ اس لئے اس پر مزید ایک لاکھ روپیہ صرف کرنا پڑا۔ اس ایک لاکھ روپیہ سے پانچ کوس (۱۰ کلومیٹر) کا فاصلہ تو پہلے والی ہی نہر کا بحال رکھا گیا جب کہ ۲۳ کوس (۴۶ کلومیٹر) کا فاصلہ از سر نو کھودا گیا۔ دریائے راوی سے شہر تک نہر کی کل لمبائی ۹۸ میل (تقریباً ۱۶۱ کلومیٹر) بتائی گئی ہے۔ اس سے کافی پانی بنا کسی دقت کے حاصل ہونے لگا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۷۹۸ تا ۸۰۰]

(۴) فرید مرتضیٰ خاں بخاری = کمسنی میں اکبر بادشاہ کی ملازمت میں داخل ہوا۔ جلد ہی پختہ کاری، دانشمندی اور شجاعت کی بدولت وہ ترقی کرتے کرتے چالیسویں سال جلوس اکبری میں ہزار و پانصدی کے منصب تک جا پہنچا۔ دور جہانگیری میں ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں اس کا انتقال ہوگیا۔ دہلی میں خاندانی قبرستان میں دفن ہوا۔ لاہور کے علاوہ اس نے احمد آباد میں بھی بخارہ محلہ، مسجد اور شاہ وجیہہ الدین کا روضہ نیز دہلی کے قریب فرید آباد مع عمارات و تالاب اسی کی یادگار ہیں۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۶۳۴ ۔ ۶۴۰]

(۵) قطب الدین خاں = شمس الدین خاں اتکہ کا بڑا بھائی اور اکبری عہد کے بڑے امیروں میں سے اور پانچ ہزاری منصب پر فائز تھا۔ لاہور کے علاوہ اس نے غزنین جو اس کا وطنِ مالوف تھا، میں بھی ایک عمارت بنوائی اور باغ لگوایا۔ ۹۸۷ھ (۱۵۷۹ء) میں وہ شہزادہ سلیم کی اتالیقی پر مقرر ہوا۔ ۹۹۱ھ (۱۵۸۳ء) میں وہ بھڑوچ کی صوبیداری پر فائز

تھی تو سلطان مظفر شاہ (والیٔ گجرات) کے ہاتھوں دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔

["قاموس المشاہیر" (جلد دوم) ص ۱۳۰؛ "مآثر الامراء" جلد سوم (اردو ترجمہ) ص ۴۹تا۵۲]

(۵) اس نے شیخ الاسلام شیخ زکریا ملتانی کا روضہ جو بہت تنگ تھا، گرد و نواح کے لوگوں کے مکانات خرید کر، خوبصورت اور وسیع کرایا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۷۹۸تا۸۰۰]

(۶) "بھارت کا برہت اتہاس" (ہندی) جلد دوم ص ۱۸۴

(۷) "مآثر الامراء" (انگریزی ترجمہ) جلد اول ص ۲۷۹

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرہ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر!

(علامہ اقبال)

[۷] لاہور تصاویر کے آئینے میں

حضرت داتا گنج بخش کے مزار شریف کا بیرونی منظر، لاہور

حضرت داتا گنج بخش کے مزار شریف کا ایمان افروز اندرونی منظر، لاہور

حضرت میاں میرؒ کے مزار شریف کا بیرونی منظر، لاہور

بادشاہی مسجد، لاہور

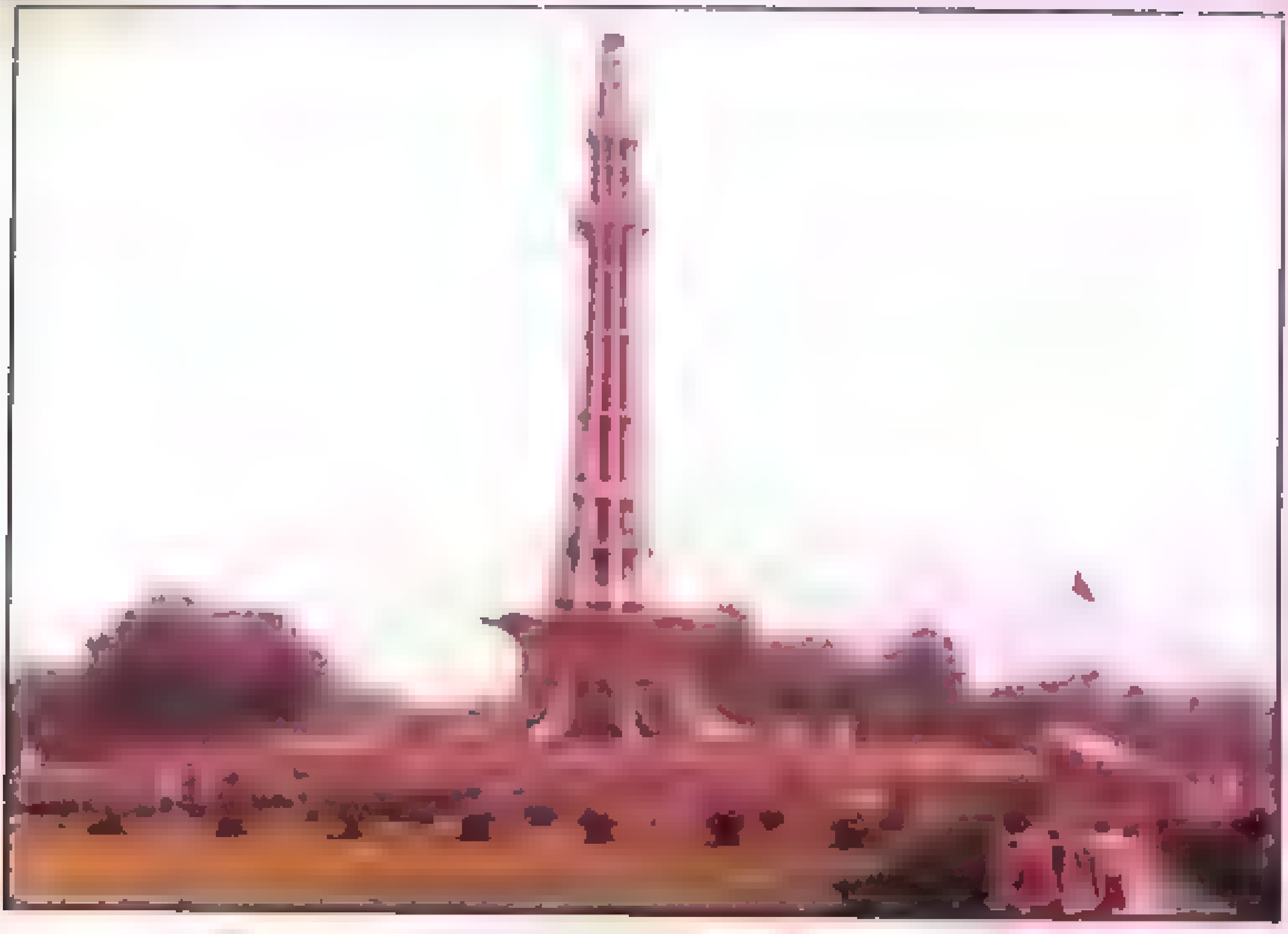

مینار پاکستان، لاہور

مغل شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ، لاہور

مقبرہ ملکہ نور جہاں، لاہور

مقبرہ زیب النساء، لاہور

مقبرہ سلطان قطب الدین ایبک، لاہور

مقبرہ مغل شہنشاہ بہادر شاہ اول، لاہور

سمادھی راجہ رنجیت سنگھ، لاہور

ریس کورس، لاہور

جنرل پوسٹ آفس، لاہور

شالیمار گارڈن کا دلکش منظر، لاہور

پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

انارکلی کا مقبرہ، لاہور

باب ششم

خدا حافظ

وطن واپسی (۱)

میرا دو ماہ کا ویزا ۲۹ر اپریل کو ختم ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی مجھے پاکستان چھوڑ دینا تھا۔ عزیز و اقارب کا اصرار تھا کہ ایک ماہ کی توسیع اور کرالی جائے لیکن خانگی ذمہ داریوں کے پیش نظر میرا زیادہ عرصہ فیملی سے دور رہنا ممکن نہ تھا [تنہا پاکستان گیا تھا۔] اس لئے چاہتے ہوئے بھی میں نے مزید توسیع نہیں کرائی۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، چونکہ "سمجھوتہ ایکسپریس" پیر اور جمعرات کو ہی لاہور سے چلتی ہے اور پیر، ۲۶ر اپریل کی پڑ رہی تھی اس لئے ۲۶ر اپریل کو ہی بارڈر کراس کرنے کے حساب سے میں کراچی سے روانہ ہوا۔ کراچی ریلوے اسٹیشن پر بھائی، ہمشیرہ، بھابی، بھانجے اور بھتیجوں کے علاوہ متعدد مخلصین نے بھاری من اور ڈبڈباتی آنکھوں سے الوداع کہا۔ یہ منظر ایسا جذباتی تھا کہ خواہ کوئی کتنا ہی سنگدل کیوں نہ ہو، وہ بھی اشکبار ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ اس کا اندازہ بوگی میں بیٹھے دیگر غیر متعلقہ مسافروں کے چہروں کو پڑھنے سے بھی ہوا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک ہی سوال بار بار ابھر کر پریشان کر رہا تھا، موت کا کوئی بھروسہ نہیں، کب، کس کو اور کہاں اپنی آغوش میں لے لے؟! خدا جانے دوبارہ ان لوگوں سے ملاقات ہو سکے گی، یا نہیں!!۔ کافی دیر تک تو میں خود پر قابو پائے رہا لیکن آخر کار مجھ پر بھی رقّت طاری ہو ہی گئی۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بھائی کو دیکھا جن کی آنکھیں پہلے ہی نمناک تھیں، لیکن انھوں نے بناوٹی مسکراہٹ اور کپکپاتے ہونٹوں سے خدا حافظ کہا۔ ان کی مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ ان کے ذہن میں بھی ایک تلاطم برپا ہے اور وہ خمار بارہ بنکوی کے اس شعر کی

ترجمانی کر رہی ہے۔

ہزاروں اشک صدقے اس کے افسردہ تبسم پر
چھپا لی مسکرا کر جس نے شدت درد پنہاں کی

بالآخر ٹرین نے سیٹی دی، گارڈ نے ہری جھنڈی ہلائی اور پھر ٹرین پٹری پر پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز رفتار سے دوڑنے لگی۔ میں کافی دیر تک بوگی کے گیٹ پر کھڑا تب تک ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہتا رہا جب تک کہ سب آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ اس کے بعد جب میں اپنی سیٹ پر آیا تو دیکھا کہ وہاں ایک دوسرے صاحب قبضہ کئے ہوئے ہیں اور میرا سامان انھوں نے وہاں سے ہٹا کر الگ رکھ دیا ہے۔ جب میں نے ان سے کہا کہ یہ سیٹ تو میرے نام Reserve ہے تو انھوں نے مجھے دھمکاتے ہوئے ڈانٹ دیا۔ میں حالات کے پیش نظر اس شعر کا مصداق خاموشی سے فرش پر ایک کونے میں بستر بند رکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے!
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے!!

ذہن پہلے ہی سے بوجھل تھا، اس واقعہ نے مزید ''آگ میں گھی'' ڈالنے کا کام کیا۔ مصلحت اسی میں تھی کہ ''گاندھی گیری'' جس کا مجھے پہلے ہی سے بخوبی تجربہ تھا(۱)، سے کام لیتے ہوئے مناسب وقت کا انتظار کیا جائے۔ میں ابھی اسی ''ادھیڑ۔بن'' میں تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد پولیس فورس کے ساتھ ریلوے ٹکٹ چیکر (.T.C) آ گیا اور مسافروں کے ٹکٹ چیک کرنے لگا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ٹی۔سی کو اپنا ٹکٹ اور رزرویشن سلپ دکھاتے ہوئے اُس سے اپنی سیٹ پوچھی۔ اُس نے اسی سیٹ کی طرف اشارہ کیا جس پر سے مجھے ہٹایا جا چکا تھا، تو میں نے کہا کہ اس سیٹ پر تو جو صاحب بیٹھے

ہوئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ ان کے نام رزرو ہے۔ میں نے یہ بھی شکایت کی کہ ان صاحب کا کہنا ہے کہ اگر میں نے ان سے زیادہ کچھ بات کی تو وہ میرے پیٹ میں سے چاقو نکال دیں گے؛ مجھے ویسے تو موت کا کوئی ڈر نہیں لیکن میں ایک ہندوستانی شہری ہوں، یہاں پردیس میں مرنا نہیں چاہتا۔ ٹی۔ سی نے ان صاحب کا ٹکٹ دیکھ کر قدرِ شرمندگی کے عالم میں مجھے بتایا کہ یہ غلطی انھیں کے محکمے (ریلوے) کی ہے جس نے ایک ہی سیٹ دو کے نام رزرو کر دی ہے؛ لیکن ساتھ ہی اُن صاحب کو وہاں سے ہٹاتے ہوئے کہا کہ تمھیں مہمان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟، آخر وہ کیا تاثر لے کر یہاں سے جائیں گے !، اور پھر اُن صاحب کو ایک دوسری سیٹ پر Adjust کرتے ہوئے مجھ سے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ واقعہ کو بھول جانے کی درخواست کی۔ ٹی۔ سی کے ساتھ جو پولیس سب انسپکٹر تھا اس نے بھی معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ قدرِ طنزیہ لہجے میں مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہاں (پاکستان میں) ایسی لاقانونیت نہیں ہے کہ محض سیٹ کو لے کر کسی کو بوگی سے نیچے پھینک دیا جائے یا اس کو زدوکوب کیا جائے۔ (گویا کہ یہ بات ہندوستان میں عام ہے۔) اس پر میں نے برجستہ سوال کیا، ''تو پھر کیا یہ غلط ہے کہ آپ کے یہاں مساجد میں نمازیوں پر بے دریغ فائرنگ نہیں کی جاتی، حتیٰ کہ میتوں اور سوگواروں کو بھی نہیں بخشا جاتا؟'' میرے اس سوال پر وہ سب انسپکٹر ''لال۔ پیلا'' ہو کر آگے بڑھا اور اُن صاحب کے دو طمانچے رسید کرتے ہوئے ان سے کہا کہ اگر انھوں نے چاقو وغیرہ کی بات نہ کہی ہوتی تو آج پوری قوم کو یوں شرمندہ نہ ہونا پڑتا، اور پھر انھیں مجبور کر دیا کہ وہ مجھ سے معافی مانگیں۔ انسپکٹر کی اس بات کی تائید بوگی میں بیٹھے مسافروں نے بھی کی۔ ٹی۔ سی اور پولس کے عملے کے چلے جانے کے بعد میں نے اُن صاحب سے کہا ''میاں! یہ ہے ہماری ''گاندھی گیری'' کہ بنا تشدد یا زبان کو خراب کیے مقصد حاصل کر لیں، یعنی 'ہلدی لگے نہ پھٹکی اور رنگ چوکھا آجائے۔' ان صاحب نے شرمندگی سے

سر نیچے جھکا لیا۔ دراصل کوئی بھی معاشرہ پورے کا پورا برا نہیں ہوتا محض ''ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔''

اس کے بعد وہ ٹی۔ سی دیگر ریلوے اہلکاران اور پولس افسران کے ساتھ کئی بار میرے پاس آیا اور ہر بار سب نے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ واقعہ کو بھول جانے کی درخواست کی۔ اس واقعہ کو میں ان ریلوے اور پولس اہلکاران کی شرافت، حسن اخلاق اور جذبہ خیر سگالی کے روپ میں دیکھتا ہوں۔

لاہور میں میں نے کچھ ٹیکسیوں کے پیچھے ایک بہت ہی غیر مہذب، نفرت انگیز اور اسلامی تعلیمات کے منافی نعرہ لکھا ہوا دیکھا جس کو قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ تعجب تو اس بات کا تھا کہ حکومت پاکستان نے ایسے شر انگیز نعرے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نے یکی ٹیکسیوں میں سے ایک کے ڈرائیور سے پوچھا ''میاں! جو نعرہ آپ کی ٹیکسی کے پیچھے لکھا ہوا ہے وہ کیا آپ نے لکھوایا ہے یا پھر یونہی کسی دوسرے نے لکھ دیا ہے؟'' [عموماً ٹرکوں کے پیچھے بھی کچھ نہ کچھ لکھا ہوتا ہے، جیسے ''بری نظر والے تیرا منہ کالا'' یا پھر کوئی بے تکا سا شعر وغیرہ وغیرہ] اس نے مجھے اوپر سے نیچے گھورتے [شاید لب ولہجہ کی وجہ سے] ہوئے سوال کیا ''کیا انڈیا سے آئے ہو؟''۔ میں نے جواب دیا ''جی''۔ اس نے پھر سوال کیا ''آپ کو اس میں کیا پریشانی ہے؟''۔ میں نے جواب دیا ''مجھے پریشانی تو کوئی نہیں، البتہ افسوس ضرور ہے۔ آپ اسلام کے ماننے والے اور ایک مسلم ملک کے شہری ہیں۔ آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ نفرت کی پیروی کریں یا کسی کو حقیر سمجھیں۔ کیا آپ ایسے نعروں سے کشمیر حاصل کر سکتے ہیں؟، ویسے بھی آپ کا ایسا کچھ لکھنا اندھیرے میں باندی کے منہ چڑانے سے زیادہ کچھ نہیں۔'' میں یہ کلمات کچھ ایسے جوش میں کہہ گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز قدرے تیز ہو گئی جس کو سن کر وہاں کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ مجمع میں سے ایک صاحب نے سوال کیا ''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انڈیا نے ہمارے ملک کے دو ٹکڑے

کر دیئے؟'' میں نے جواب دیا ''یہ محض آپ کی غلط فہمی ہے۔ جغرافیائی، معاشی، لسانی اور ثقافتی، غرضیکہ ہر اعتبار سے وہ پہلے ہی سے دو حصوں میں منقسم تھا۔ اس کے علاوہ دونوں حصوں کے درمیان سیکڑوں میل کا فاصلہ بھی تھا۔ دراصل وہ ایک بنا ہی غلط تھا۔ اگر الگ بننے ہی تھے تو پہلے ہی سے دو ملک بننے چاہئے تھے جن میں بے شک نیم وفاق (Confederation) ہو سکتا تھا۔ پھر اگر اپنا پیسہ کھوٹا ہو تو پرکھنے والے کی کیا غلطی!۔ جب جنرل یحییٰ خاں نے صاف ستھرے الیکشن کرائے تو اس میں شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی اکثریت میں آ گئی تھی۔ ایمانداری سے تو شیخ مجیب کو سرکار بنانی چاہئے تھی لیکن جنرل یحییٰ خاں، مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے بے جا دباؤ میں آ گئے۔ ویسے بھی مسلم لیگ مشرقی حصے میں ہی وہاں کے رہنماؤں کی کاوشوں سے وجود میں آئی تھی۔'' [مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں کرسمس کے موقعہ پر ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے اجلاس کے دوران نواب مشتاق حسین کی کوششوں سے ڈھاکہ میں عمل میں آیا تھا۔] وہ صاحب بولے ''یہ تو سب درست ہے لیکن شیخ مجیب کو آپس میں مل بیٹھ کر معاملہ طے کر لینا چاہئے تھا۔ آخر کو تو ہم سب ایک ہی مذہب کے ماننے والے تھے!۔'' میں نے کہا ''مذہب کو بیچ میں نہ لائیں تو بہتر رہے گا۔ کیا عراق نے کویت پر قبضہ نہیں کیا تھا؟ کیا ایران اور عراق کے درمیان خونریز جنگ نہیں ہوئی تھی؟ ان کا مذہب کیا تھا؟۔ دراصل سب کی ''اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ'' ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو بھی تو سوچنا چاہئے تھا کہ مجیب اور مشرقی حصے کے عوام آپ ہی کے ہم مذہب ہیں۔ پھر، اس کے رہتے ہوئے آپ کی معیشت پر دباؤ بھی تھا۔ [ہر سال مشرقی حصے میں تباہ کن سیلاب آتے ہیں۔] ان سب کے علاوہ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ بنگلہ دیش بن جانے سے اقوام متحدہ میں ایک مسلم ووٹ کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر آپ کے اس سے برادرانہ تعلقات قائم رہتے ہیں تو آپ اسے کیش کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے، ہماری سرحد بنگلہ دیش سے ملتی ہے۔ جن ممالک کی سرحدیں آپس میں ملتی

ہیں، ان میں کسی نہ کسی وجہ سے کشیدگی ہو ہی جاتی ہے۔ جیسے مثلاً آپ چین اور افغانستان ہی کو لے لیجئے۔ اس لحاظ سے ہم تو خسارے ہی میں رہے۔ اسی اندیشے کا اظہار ۱۹۷۱ء میں (بنگلہ دیش کے قیام کے وقت) ہمارے کچھ دانشوروں نے کیا بھی تھا۔" وہ صاحب بولے "ارے صاحب! یہ بات نہیں، بلکہ ہندوستان نے ابھی تک ہمارے ملک کو دل سے تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔" میں نے جواب دیا "یہ بھی آپ کا خام خیال ہے۔ کیا ہمارے وزیر اعظم، جناب اٹل بہاری باجپئی جب فروری ۱۹۹۹ء میں خیر سگالی مشن پر لاہور تشریف لے گئے تھے تو کیا وہ "مینارِ پاکستان" پر نہیں گئے؟ لیکن ان کے اس جذبے کا آپ نے کیا بدلہ دیا، یہی نہ کہ آپ نے اس مقام کو عرق گلاب سے دھویا، گویا کہ وہ نجس ہو گیا تھا؟ آپ نے درپردہ سازش کر کے ہمیں کارگل میں الجھا دیا۔ اس کے علاوہ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ محض مسلم لیگ کی مانگ پر ہی پاکستان بن گیا تھا؟ محترم مولانا ابوالکلام آزاد نے "India Wins Freedom" میں صاف الفاظ میں ان حالات و واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور ان کانگریسی نیتاؤں کے نام تک دیئے ہیں جن کی مرضی سے پاکستان وجود میں آیا۔" (۲) جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ صاحب بولے "وہاں آپ کی املاک تباہ کی جاتی ہے، آپ کو قتل کیا جاتا ہے اور پھر جیلیں بھی آپ ہی سے بھری جاتی ہیں، لیکن پھر بھی آپ وہاں کی وکالت کر رہے ہیں!" میں نے اس طنزیہ فقرے کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا "میں وکالت نہیں کر رہا ہوں بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں کچھ فسطائی طاقتوں اور ان کے غنڈہ عناصر کے سبب ہم پر عرصۂ حیات تنگ ہے لیکن وہ ہمارا وطن ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ آزادی کے بعد جب قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا تو ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء کو اس کے خلاف بابائے قوم مہاتما گاندھی نے "مرن برت" رکھا (۳) اور تب تک نہیں توڑا جب تک کہ خون خرابہ رک نہ گیا اور املاک کی مسماری بند نہیں ہو گئی حالانکہ اسی کی پاداش میں انھیں ۳۰ر جنوری

۱۹۴۸ء کو انھیں کے مذہب کی ایک فرقہ پرست تنظیم کے وحشی کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑا(۴)۔ اس کے علاوہ بھائی صاحب! ہم مریں یا زندہ رہیں، جیل جائیں یا آزاد رہیں؛ آپ کی بلا سے؛ آپ نے تو اپنی ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد'' الگ بنا ہی لی ہے لیکن اب اگر ہم مرتے ہیں تو شہید کا درجہ پاتے ہیں (اگر کوئی بے قصور مسلمان کسی غیر مسلم کے ہاتھ سے محض اس لئے مارا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، تو وہ درجۂ شہادت کو پہنچتا ہے) لیکن آپ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں، کیا یہاں ایک کلمہ گو ہی دوسرے کلمہ گو کو ہلاک نہیں کر رہا ہے؟، آپ سے اچھے تو ہمارے غیر مسلم ہم وطن ہیں جو کم از کم ہماری میت پر تو گولی نہیں چلاتے۔ اب رہا اس نعرہ کے بارے میں جو آپ نے کشمیر کے حوالے سے لکھا ہے، تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیری عوام آپ کے ساتھ ہیں؟، اگر ایسا ہوتا تو ۱۹۶۵ء میں "Operation Gibraltor" ناکام نہ ہوتا۔ [جنرل ایوب خاں نے جو Infiltrators کشمیر بھیجے تھے وہ کشمیری عوام کی ہی نشاندہانیوں پر پکڑے گئے تھے۔] اب رہا ہماری عافیت، تو آپ کا ہی نزلہ ہم پر ڈھلتا ہے۔ اگر واقعی آپ ہمارے خیر خواہ ہیں تو خود کو چھوٹا مان کر اپنے بڑے بھائی سے تعلقات برادرانہ رکھیں۔ اس میں ہماری، تمھاری، اس پورے خطے کی بقا کا راز مضمر ہے۔ تم نے کئی جنگیں لڑ کر دیکھ لیں، کیا نتیجہ نکلا، اپنی ہی معیشت تباہ کر لی۔ یاد رکھو! جو بھی گزرتا ہے وہ دولھا اور دلھن پر ہی گزرتا ہے باقی تو باراتی ہوتے ہیں جو کوئی نمک زیادہ تو کوئی مرچ زیادہ کا شکوہ ہی کر کے چلا جاتا ہے۔'' میں کہتا رہا اور وہ سب خاموشی سے سنتے رہے۔ ڈرائیور، جس سے میں نے بات کرنی شروع کی تھی، وہ آگے بڑھا اور بولا ''بھائی صاحب! آپ سچ کہتے ہیں۔ میں آج ہی یہ نعرہ اپنی ٹیکسی پر سے مٹوا دونگا۔''

۲۶ راپریل کو میں نے لاہور سے ٹکٹ لیا جو محض پاکستان بارڈر، واگھا تک ہی ملا۔ تقریباً دس بجے ہماری ٹرین واگھا پہنچی۔ پھر پہلے کی طرح Emigration کے لئے

لائن میں کھڑا ہونا پڑا۔ گرمی شدت کی تھی۔ میں لائن میں سب سے پیچھے کھڑا بار بار رومال سے پسینہ پونچھ رہا تھا [جیسے ہی لائن کچھ آگے بڑھتی کہ میں مسافروں کے ریلے سے کچھ سے پیچھے آجاتا تھا۔] کہ Counter کے پاس کھڑے ایک شخص نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ ''رینجرز'' میں سے کوئی آفیسر تھا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے قدرے ہمدردی کے انداز میں مجھ سے میرا پاسپورٹ لے کر اور ضابطہ کی کارروائی کرنے کے بعد مجھے واپس کر دیا۔ یہ اللہ کی طرف سے میری غیبی مدد تھی کہ اس نے اس افسر کے دل میں میری ہمدردی پیدا کر دی۔ میں نے اس افسر کا شکریہ ادا کیا اور پھر سامان کے ساتھ Custom والے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے پاس دو سوٹ کیس تھے۔ جن میں کچھ بھی غیر قانونی سامان نہیں تھا۔ Screening کے مرحلے سے گزرتا ہوا جب میں کاؤنٹر پر پہنچا تو کاؤنٹر پر بیٹھے اہلکار نے مجھ سے ایک سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے کھولنے کے لئے کہا۔ میں نے فوراً سوٹ کیس کھول کر اس کے آگے کر دیا۔ سوٹ کیس میں سب سے اوپر تصوف سے متعلق ایک کتاب رکھی تھی۔ اس نے اس کو کھول کر دیکھا اور پھر یہ معلوم ہو جانے پر کہ مجھے علی گڑھ جانا ہے اور میں ''میگ'' ہوں اس نے فوراً میرا سوٹ کیس بند کرتے ہوئے میرا کسٹم کلیر کر دیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پاکستان میں علی گڑھ والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس بات کی اس اہلکار کے ایکشن سے بھی تصدیق ہو گئی۔ یہ سبھی مانتے ہیں کہ سرسید احمد خاں کے مسلم قوم پر جو احسانات ہیں وہ قیامت فراموش نہیں کئے جا سکتے۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر 1991ء میں ''علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، کراچی'' نے کراچی میں ایک ''سرسید یونیورسٹی آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی'' کی بنیاد رکھی۔

غرض یہ کہ Custom سے میں نے بہت جلد فراغت حاصل کر لی اور پھر معہ سامان پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین میں آکر بیٹھ گیا۔ جب سب مسافر کسٹم سے فارغ ہو کر

ٹرین میں آکر بیٹھ گئے تو تقریباً دو بجے واگھہ سے اٹاری کے لئے ٹرین روانہ ہوئی اور جس انداز سے آئی تھی اسی انداز میں اٹاری پہنچی۔

اٹاری پر پہلے میں نے علی گڑھ کا ٹکٹ لیا اور پھر Emigration کی لائن میں اسی کاؤنٹر پر لگ گیا جس پر آتے وقت لگا تھا کیوں کہ جس کاؤنٹر پر آمد ہوتی ہے اسی پر روانگی کرانی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آمد پر رجسٹر میں جو Entry کی جاتی ہے اسی کے آگے واپسی بھی درج کردی جاتی ہوگی تاکہ یہ کنٹرول رکھا جا سکے کہ کون کب واپس لوٹا اور کون نہیں۔

Emigration کے بعد جب میں کسٹم کے لئے آگے بڑھا تو کسٹم سے وابستہ اس اہلکار نے مجھے پہچان لیا جس کو پاکستان جاتے وقت میں نے کتاب نذر کی تھی۔ حالانکہ میں فوراً اس اہلکار کو نہیں پہچان سکا تھا۔ [کسی مولانا یا سردار جی کو ایک ہی نظر میں پہچاننے میں پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔ وہ صاحب سردار جی تھے۔] وہ بہت گرم جوشی سے میری طرف بڑھا، میرا سامان بنا کھلوائے کلیر کردیا اور پھر چائے پلائی اور خلوص کا مظاہرہ کیا۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ کتاب کیسی لگی، اس نے کہا ''او جی، رائٹر جی! بلّے بلّے، میّنو تُو آڈی کتاب بڑی ہوتری لاگی مگر میری بیوی نے اوتے قبضہ کرلیا، ہور او میّنو دیکھن بھی نہیں دیندی۔ میّنو دوجی کتاب بھیج دینڑا۔ تُو آڈی بڑی مہربانڑی ہوگی۔''

یہ قابلِ ذکر ہے کہ کسٹم کے کاؤنٹر پر چیکنگ کرتے وقت کسی بھی مسافر کے ساتھ کوئی پاکستانی واٹر کولر Clear نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ انھیں توڑ دیا جاتا تھا۔ میرے پاس بھی ایک چھوٹا سا کولر تھا جس میں پانی تھا۔ سامان کے ساتھ ہی میرا تو کولر Clear کردیا گیا۔

کسٹم سے فراغت کے بعد میں اس پلیٹ فارم پر معہ سامان کے آبیٹھا جہاں سے ٹرین دہلی کے لئے روانہ ہونی تھی۔ جب سب کا Clearance ہوگیا اور ٹرین بھی

آ گئی تو ہم سب اس ٹرین میں بیٹھ گئے۔ رات کے تقریباً دو بجے ٹرین اٹارسی سے روانہ ہوئی اور اگلے دن ۲۷؍اپریل بروز جمعہ صبح کے تقریباً دس بجے پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن پہنچی۔

دہلی کا اسٹیشن آنے سے پہلے ہی ریلوے اور کسٹم حکام نے چلتی ٹرین میں مسافروں کا سامان ٹٹولنا شروع کر دیا تھا اور جس کے پاس مقررہ وزن سے زائد اور غیر قانونی سامان تھا ان سے قانونی نیز غیر قانونی دونوں طریقوں سے بات کرنی شروع کر دی تھی۔ ایک صاحب غلطی سے میری طرف بھی بڑھے لیکن جب احساس ہوا تو "سوری" کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ جب ٹرین اسٹیشن پر رکی تو میں نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر بڑی تعداد میں سرکاری عملہ موجود ہے اور انھوں نے encounter کے انداز میں ٹرین کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ جیسے ہی سامان سے لدے پھندے مسافروں نے ٹرین سے اترنا شروع کیا کہ وہ عملہ بھی اپنے پسندیدہ مسافروں کی طرف تیزی سے لپکا۔ میں تو وہاں سے دوسرے پلیٹ فارم پر آ گیا جہاں سے مجھے علی گڑھ (منزل مقصود) کے لئے ٹرین ملنی تھی، اور پھر "جان بچی لاکھوں پائے، خیر سے بدھو گھر کو آئے"۔

یہاں دہلی سے لاہور یا لاہور سے دہلی کے درمیان ٹرین کے اندر کا منظر بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کافی کچھ مسافر بڑے بڑے تھیلوں، بوریوں، پیٹیوں اور بکسوں میں اتنا زیادہ سامان لاتے اور لے جاتے ہیں کہ ٹرین میں جگہ نہیں رہتی اور جس سے ان کی نیت اور مقصد کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ ایسے مسافر گروپ کی شکل میں ہوتے ہیں اور ایک ساتھ بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ راستے میں اپنا اپنا سامان آزادی اور دلیری کے ساتھ کھول کر پھر سے ایک دوسرے کے مشورے سے سیٹ کرتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا ہم ٹرین میں نہیں بلکہ مینا بازار میں بیٹھے ہوں۔ ایسے مسافروں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ آپس میں وہ جس طرح باتیں کرتے ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا

بھی مشکل نہیں ہوتا کہ وہ مستقل جلدی جلدی چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ایسے مسافروں کو کسٹم والے بھی خوب جانتے اور پہچانتے ہیں حتیٰ کہ By name بھی۔ باتوں باتوں میں ہی ایسے مسافروں میں سے ایک شخص سے میں مانوس ہوگیا۔ میں نے اُس سے جو مختلف سوالات کئے اُن کا لبِ لباب یہ ہے ــــــ

ہندوستان اور پاکستان کے بڑے بڑے شہروں جیسے۔ دہلی، بمبئی، لاہور اور کراچی میں کچھ بااثر کاروباری اشخاص رہتے ہیں۔ ان سب کا آپس میں ربط رہتا ہے۔ مختلف اشیاء کے بازار بھاؤ پر ان لوگوں کی نگاہ رہتی ہے۔ جب کسی Item کے دونوں ممالک کے بازار بھاؤ میں کافی فرق ہوجاتا ہے تو زیادہ نرخ والے ملک کا بندہ کم نرخ والے ملک کے بندے کو خبر کردیتا ہے۔ اس پر کم نرخ والے ملک کا بندہ اپنے لوگوں کے ویزے متعلقہ سفارت خانہ سے حاصل کرکے اپنے اُن لوگوں کو پاسپورٹ اور ویزے دے کر مطلوبہ سامان کے ساتھ زیادہ نرخ والے ملک کو روانہ کردیتا ہے۔ جب وہ لوگ اپنی منزل کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچتے ہیں تو اُس ملک کا بندہ اسٹیشن پر آکر ان سے سامان لے لیتا ہے اور اِن لوگوں کو مناسب جگہ ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ چند دن وہ آرام کرتے ہیں اور تفریح بھی۔ پھر وہاں سے اُن Items کے ساتھ واپس لوٹتے ہیں جن کا بازار بھاؤ وہاں کم اور دوسرے ملک میں (جہاں سے وہ آئے تھے۔) زیادہ ہوتا ہے۔ اب اگر چیک پوسٹ پر مال ضبط ہوجائے یا اس پر کسٹم ڈیوٹی لگ جائے تو اس کا مال لے جانے والوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا اور اگر کچھ لینا دینا پڑ جائے تو آپس میں مل کر مطلوبہ رقم آناً فاناً میں جمع کرلیتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ کسٹم اہلکار چند بار سامان لانے اور لے جانے دینے کے بعد وقفے وقفے سے اسے ضبط کرتے یا توڑتے پھوڑتے رہتے ہیں جس سے حساب کتاب برابر ہوجاتا ہے۔ [آخر کسٹم اہلکار کو بھی تو اپنی کارکردگی دکھانی ہوتی ہوگی۔]

یہاں یہ قابلِ ذکر ہے کہ ایسے کارندوں کے پاسپورٹ کاروباری سرغنوں کے پاس ہی جمع رہتے ہیں۔ محض جب جو کارندہ مہم پر روانہ ہوتا ہے تو اُس کو پاسپورٹ عارضی طور سے دے دیا جاتا ہے۔ (واللہ عالم بالصواب۔)

Smugglers کا ایک فرقہ اور بھی ہوتا ہے جو منظم طریقے سے Smuggling نہ کرکے محض اپنے آنے جانے کا خرچہ نکالنے کی نیت سے مناسب سامان لاتا اور لے جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ ہندوستان سے Helmets، چھالیہ، کتھہ، گرم مصالحہ، ناریل اور پان پاکستان لے جایا جاتا ہے جب کہ پاکستان سے کپڑا، سلے سلائے کپڑے، منقہ، کشمش، خشک میوے، جوتے، پلاسٹک کے چپل اور کولر وغیرہ ہندوستان لائے جاتے ہیں۔ یہ اشیاء بازار بھاؤ کے حساب سے بدلتی بھی رہتی ہیں۔ جس وقت اسمگلرس سامان کے ساتھ چیک پوسٹوں (اٹاری، واگھہ)، دہلی اور لاہور کے ریلوے اسٹیشنوں پر پہنچتے ہیں تو گویا سرکاری عملے کی لاٹری کھل جاتی ہے۔

یہ سبھی جانتے ہیں کہ باہمی تحائف کے تبادلوں سے خیر سگالی کے ماحول کو تقویت ملتی ہے اور آپس میں اتحاد و اتفاق، خلوص و محبت نیز یکانگت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اسی جذبے کے پیشِ نظر سربراہانِ مملکت بھی آپس میں ایک دوسرے کو تحائف پیش کرتے رہتے ہیں۔ ایسے تحائف کسی بھی ملک میں خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جیسے جب اندرا جی نے ضیاء الحق صاحب کو ہندوستانی آم کی پسندیدہ قسم روانہ کی تو اس کے جواب میں ضیاء الحق صاحب نے بھی اندرا جی کو پاکستانی آم کی ایک نئی اور نایاب نسل کا تحفہ ارسال فرمایا تھا۔ اسی طرح دونوں ممالک، ہندوستان اور پاکستان کے مابین کوئی ایسا معاہدہ ضرور ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کے عوام بھی جائز طریقوں سے معقول تعداد میں

تحفے لا اور لے جا سکیں اور کسٹم پر انھیں کسی قسم کی پریشانی یا شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اب جیسے میں پہلی بار پاکستان گیا اور بہت سے عزیز و اقارب سے تو زندگی میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ وہاں میرے حقیقی اور نزدیکی عزیز ہی تقریباً پچاس ہوں گے۔ میرے لئے یہ لازم تھا کہ میں ان کے لئے اپنے ملک کے بہترین اور چیدہ چیدہ تحفے لے جاتا لیکن قانون کی بالادستی کو اہمیت دینے کی وجہ سے میں وہاں خالی ہاتھ جا کھڑا ہوا۔ اس سے ذہنی طور پر مجھے کتنی خفت اور ندامت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں۔ ایک حقیقت اور، وہ یہ کہ ہم جاتے تو ہیں اپنے احباب سے ملاقات کرنے لیکن آخر کہلاتے تو ہیں ہندوستانی یا پاکستانی، یعنی تحفے دینے یا نہ دینے سے متعلقہ شخص کے ملک کی ناموری بھی جڑی ہوتی ہے۔ چنانچہ مناسب ہوگا اگر ویزا جاری کرنے والا سفارت خانہ دونوں ملکوں کے مابین طے شدہ اشیاء کی فہرست جس میں فی ویزا ان کی تعداد یا وزن بھی درج ہو، ویزا حاصل کرنے والے شخص کو ویزا فارم کے ساتھ دیدے جس کی بنا پر وہ شخص کوئی طے شدہ فارم بھر کر سفارت خانہ میں اپنی درخواست کے ساتھ منسلک کر کے دے اور سفارت خانہ ویزا کے ساتھ ایسی Allowed اشیاء کا اجازت نامہ بھی معہ تعداد یا وزن کے مرحمت فرمادے۔ اس سے عوامی سطح پر تعلقات خوشگوار ہوں گے جن کا حکومتی سطح پر اثر پڑنا لازمی بات ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ تاجِ برطانیہ سے آزادی حاصل کئے ہوئے ہمیں ایک عرصہ ہوگیا پھر بھی ابھی تک ہم نے Queen سے ناطہ نہیں توڑا۔ ٹرین چلائیں گے تو نام رکھیں گے ''دکن کوئین'' (Daccan Queen)، پکچر بنائیں گے تو نام رکھیں گے ''بینڈت کوئین'' (Bandet Queen)، مسوری جائیں گے تو کہیں گے ''ہل کوئین'' (Hill Queen) اور جب اللہ حُسن سے نوازے گا تو صنفِ نازک بننا چاہیں گی

"بیوٹی کوئین" (Beauty Queen)۔ دیکھیے اس میدان میں ہم دنیا سے لوہا منوا چکے ہیں اور متعدد بار سہرا ہمارے سر رہا ہے۔ تو پھر کیوں نہ ایک "کوئین" کا اور گلے لگا لیں اور رکھ دیں۔ "سمجھوتہ ایکسپریس" کا نام "راحت کوئین" یا "حاجات کوئین" کیوں کہ اس سے ہر طبقے کی ترجمانی ہوتی ہے، لیکن پھر سوچتا ہوں۔

"تو گدھا کمہار کا تجھے رام سے کیا کام"

حواشی

(۱) ۱۹۸۲ء میں میرا تبادلہ بلند شہر سے دہرہ دون کو ہو گیا۔ میں نے کچھ کوشش تبادلہ ملتوی کرانے کی کی لیکن وقفے وقفے سے وہ کبھی ملتوی، تو کبھی پھر دوبارہ ہوتا رہا۔ بالآخر مجبوراً [illegible] میں نے اللہ کی طرف سے بہتر ہی سمجھ کر دہرہ دون جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں جا کر جوائن کرنے کے بعد جب متعلقہ سپرنٹنڈنگ انجینیئر مسٹر بی۔ ڈی۔ [illegible] سے ملا تو راز سمجھ میں آیا۔ میرے آداب بجا لانے پر انھوں نے فرمایا "شیخ صاحب! کوشش تو آپ نے بہت کی کہ آپ کا تبادلہ ملتوی ہو جائے لیکن اس میں میں ہی مانع رہا۔" میں نے عرض کیا "سر! میری آپ سے یہ پہلی ملاقات ہے، اور اس سے پہلے تک غائبانہ طور پر بھی ایک دوسرے سے متعارف نہیں تھے، پھر آپ کی اس ناراضگی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" انھوں نے قدرے مسکراتے ہوئے فرمایا "نہیں نہیں، ناراضگی نہیں، بلکہ میری خود غرضی، دراصل جب میں نے ٹرانسفر لسٹ میں تمھارا نام دیکھا تو نہ معلوم کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ تم ہی ہو سکتے ہو جو میری پریشانی دور کر سکو گے۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے ایک فرمانبردار فرزند کی طرح پوچھا "سر! کام بتائیں، اگر میری جان بھی چلی جائے گی تو کوئی پروا نہیں۔" انھوں نے بہت افسردگی کے عالم میں بیان کرنا شروع کیا "میرے چارج میں ایک زیر زمین سرنگ [Under Ground Tunnel] ایک عرصے سے زیر تعمیر ہے لیکن کوئی خاص Progress نہیں ہو پا رہی ہے۔ عالم یہ ہے کہ ہمارے Engineers محض

دو روپیہ کے عوض ایک سیمنٹ کی بوری کمپنی کی ملی بھگت سے پانی میں بہا دیتے ہیں۔ [کمپنی کو Payment ، Cement Consumption basis پر ہوتا تھا۔] نتیجتاً اصل ملبے سے بھی کہیں زیادہ ملبے کا ایک پہاڑ سا بنتا جا رہا ہے۔ میرا من کہتا ہے کہ تم اس کو کنٹرول کر سکو گے۔'' اس کے بعد انھوں نے تجسس بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر جھکاتے ہوئے عرض کیا ''سر! آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کے اعتبار پر پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔'' میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ انھوں نے فرمایا ''تو پھر میں آپ کی پوسٹنگ ''کھودری ٹنل'' [Khodri Tunnel] پر ڈاک پتھر [ضلع دہرہ دون میں جمنا اور ٹونس دریاؤں کے سنگم پر واقع ایک بہت پُر فضا مقام ہے۔ تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ''آئینہ'' ملاحظہ فرمائیں۔] میں کر رہا ہوں، اور ہاں' ایک اور بات، تم حالانکہ ایک سینیر انجینیر (Senior Enginner) ہو لیکن میں تمہیں جنرل شفٹ میں رکھ رہا ہوں' منع یا اعتراض نہ کرنا۔'' میں نے انھیں ہر طرح کا یقین دلایا اور پھر ڈاک پتھر میں جا کر ڈیوٹی جوائن کر لی۔ مجھے سرنگ (Tunnel) کی کلاور سائٹ [Kalawar Site] پر رکھا گیا۔

ہمارا کام یہ تھا کہ ہیلمیٹ اور گم بوٹ پہن کر، ناک پر ایک مہین سا کپڑا باندھ کر [تا کہ سیمنٹ اور گرد و غبار سے بچا جا سکے۔ اس کے علاوہ سرنگ میں کام کرنے والے زیادہ تر مزدوروں کا تعلق اڑیسہ سے تھا جن میں سے زیادہ تر .T.B کے مریض ہو گئے تھے۔] اور ہاتھ میں ٹارچ لے کر سرنگ میں جائیں اور وہاں چل رہے کام کا Technically معائنہ کریں نیز آگے کے کام کے لئے .O.K دیں۔ اندر سرنگ میں جانے کے لئے ایک دوسری کم حجم والی سرنگ میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا جس میں کمپنی [''پٹیل کنسٹرکشن کمپنی''] نے ''ٹریک'' [Track] بچھایا ہوا تھا۔ ان tracks پر باہر رکھے ہوئے بڑے بڑے Compressors کی مدد سے چھوٹے سائز کی ٹرالیاں چلائی جاتی تھیں۔ ہم لوگ بھی ان ٹرالیوں کے ذریعہ اندر خاص سرنگ [Main Tunnel]، جس میں کام چل رہا تھا، میں آیا، جایا کرتے تھے۔ ایک دن حسب معمول جیسے ہی ہم خاص سرنگ میں جانے کے

لئے تیار ہو کر ٹرالی میں بیٹھنے کہ کمپنی کے ایک سپروائزر نے ہم سے کہا کہ آج آپ لوگوں کو لے کر یہ ٹرالی نہیں جائے گی بلکہ چیف انجینیر کا پروگرام ہے لہٰذا اس کے لئے یہ ٹرالیاں مخصوص کردی گئیں ہیں، آپ لوگ پیدل چلے جائیں۔ میرے جو ساتھی تھے وہ زور دیتے ہوئے بضد ہوئے بھی کہ وہ ٹرالی ہی سے جائیں گے لیکن میں نے انھیں سمجھایا کہ یہ شرط Contract میں نہیں ہے لہٰذا ہم کمپنی کو مجبور نہیں کرسکتے، اور پھر میں پیدل ہی ان کو لے کر اندر کی طرف بڑھ لیا۔[خاص سرنگ تقریباً ڈھائی کلو میٹر فاصلے سے تھی۔] ظاہر ہے کہ کام تک پیدل جانے میں وقت تو لگے گا ہی۔ ہم جب تک کام پر پہنچے لیبر O K کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ اس دن کمپنی کی پروگریس (Progress) بہت کم نکلی۔ چنانچہ سرنگ سے واپسی کے وقت کمپنی کا منیجر میرے پاس آیا اور مجھ سے درخواست کی کہ ہم ٹرالی ہی سے واپس جائیں۔ اس نے معافی طلب کرتے ہوئے یہ بھی انکشاف کیا کہ اس نے سپروائزر نے شرارتاً جھوٹ بولا تھا کہ چیف انجینیر کا پروگرام ہے اور انھوں نے اس سپروائزر کو اب اس سائٹ سے ہٹا دیا ہے۔ میں نے قدرے لاپرواہی سے جواب دیا ''مسٹر! ہم گاندھی جی کے ملک کے رہنے والے اور'' گاندھی گیری'' پر یقین رکھنے والے ہیں۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ ٹرالی کی سہولت مہیا کرائیں یا نہ کرائیں۔ اس کے بعد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آنے کے لئے پیدل ہی اوپر کی جانب چل دیا۔ اس نے از حد خوشامد کی لیکن ہم نے خود کو تکلیف دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ لیکن اس دن کے بعد سے کمپنی کا رابطہ ہمیں اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ باقی تفصیلات آنے والی کتاب ''یادِ ماضی عذاب ہے یارب'' میں ''گردِ سفر'' ملاحظہ فرمائیگا۔

(۲) عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ پاکستان ''مسلم لیگ'' یعنی مسلمانوں نے بنایا۔[ہندو غیر مسلم، بالخصوص فسطائی طاقتیں برصغیر کے پورے مسلمانوں کو اس کے لئے ذمہ دار ٹھہراتی ہیں(۵) جب کہ پاکستانی مسلمانوں کا ماننا ہے کہ یہ ان کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔] مگر تاریخ کا بغور مطالعہ کریں اور اس دور کے حالات و واقعات (۶) کا جائزہ لیں اور تجزیہ کریں تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اس کے بنانے میں ''کانگریس'' اور اس کے صفِ اوّل کے چند رہنماؤں کا بھی ہاتھ رہا ہے(۶)۔ اب خواہ انھوں نے بدلے

ناخواستہ چاہا ہو، یا مخصوص ذہنیت کے سبب، یا پھر کسی سازش (۷) کا شکار ہو کر۔ یہاں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ''کانگریس'' ہمیشہ سے دو دھڑوں میں بٹی رہی ہے۔ ایک وہ دھڑا جو واقعی سیکولر رہا ہے اور دوسرا وہ جو ہمیشہ سے Non-Secular اور فرقہ پرست طاقتوں کا دمساز نیز اُن کے زیرِ اثر رہا ہے۔ [اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ۱۹۹۲ء میں کانگریس کے ہی وزیرِ اعظم نرسمہا راؤ کے دورِ اقتدار میں ''بابری مسجد'' کی شہادت کا واقعہ کافی ہے۔] یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آخرالذکر، اول الذکر پر حاوی رہا ہے وگرنہ، نہ تو ملک تقسیم ہوتا اور نہ ہی عوام کے گاڑھے خون کی کمائی دونوں ممالک کو اپنے دفاعی بجٹ پر خرچ کرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ انھیں کی وجہ سے تقسیم سے پہلے، اس کے وقت اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے تقسیم کو دائمی اور ابدی بنا دیا ہے ورنہ ہو سکتا تھا کہ پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہو جاتا۔ مگر اب دونوں کے درمیان نفرت و بے اعتمادی کی وہ خلیج حائل ہو چکی ہے جو انھیں صدیوں تک ایک دوسرے سے جدا رکھے گی اور ان کی ایک ہی سمت ہوتے ہوئے بھی وہ ندی کے دو کنارے اور ایک دوسرے کے لئے دردِ سر بن کر رہ گئے ہیں۔ آخرالذکر نے ہی ''برطانوی Conservative پارٹی'' اور اس کے وزیرِ اعظم، مسٹر ونسٹن چرچل کی یہ پیشن گوئی سچ ثابت کر دکھائی کہ ہمارے (برطانیہ کے) ہندوستان سے ہٹتے ہی وہاں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑیں گے۔ اسی دھڑے کی وجہ سے مسٹر جناح کو کانگریس پر یہ الزام لگانے کا موقع ملا کہ کانگریس دراصل ایک متعصب ہندو قوم پرست جماعت ہے اور اس نے محض منافقت کے ساتھ ہندوستانی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ [مسٹر جناح نے ۱۹۰۶ء میں سیاست میں قدم رکھا اور سب سے پہلے کانگریس ہی جوائن کی لیکن بعد میں چند کانگریسی لیڈران سے بدظن ہو کر انھوں نے کانگریس چھوڑ کر ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ جوائن کر لی تھی۔ (اس سے پہلے ہی ۱۹۰۹ء میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی۔) اس کے باوجود بھی وہ ہندو۔ مسلم اتحاد کے لئے کوشاں رہے۔ انھیں کی کوششوں سے ۱۹۱۵ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا بمبئی میں ایک مشترکہ اجلاس بلایا گیا۔ (اسی سال گاندھی جی نے جنوبی افریقہ سے آکر ہندوستانی سیاست میں قدم رکھا۔ یعنی ہندوستانی سیاست کے حوالے سے مسٹر جناح، گاندھی جی سے

سینیر تھے، ور غالباً اسی وجہ سے گاندھی جی مسٹر جناح کو قائداعظم کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں انھوں نے لکھنؤ میں کانگریس۔ مسلم لیگ کے مشترکہ جلسے سے خطاب کیا۔ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے مسٹر بی۔ جی کھیر، وزیر اعلیٰ بمبئی کے ذریعہ گاندھی جی سے ہندو۔ مسلم اتحاد کی اپیل کی۔ دو سیاست میں دادا بھائی نوروجی اور بی۔ سی۔ گوکھلے کے شاگرد تھے۔ یہ دونوں ہی انھیں ہندو۔ مسلم اتحاد کا علمبردار کہا کرتے تھے۔ شری لال کرشن اڈوانی جو فرقہ پرست تنظیم راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) کی ایک شاخ (بی جے پی) "بھارتیہ جنتا پارٹی" (BJP) کے صف اول کے لیڈر اور سخت گیر موقف رکھنے والے فرد تسلیم کیے جاتے ہیں، کو بھی مسٹر جناح کے مقبرہ پر گلپوشی کرنے اور انھیں سیکولر کہنے پر مجبور ہونا پڑا۔] اس کے علاوہ فرنگی چالوں، ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں (۷) کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل یہودی اسلام کے ازلی دشمن رہے ہیں اور خود ساختہ انسانیت کے علمبردار ممالک معاشی اعتبار سے ہمیشہ ان کے شکنجے میں رہے ہیں۔ بقول علامہ اقبال "فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے" [اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس قوم کو تین چیزیں عقل، دولت اور حسن خصوصیت سے عطا فرمائی ہیں جس کا وہ شاطرانہ انداز میں بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔] لہٰذا ان ممالک سے کسی ایسے انصاف کی توقع کرنا عبث ہے جس سے اسلام کو فروغ اور اس کو تقویت حاصل ہو۔

(۳) ملک کی تقسیم کے بعد جب مسلمانوں کو قتل اور ان کی املاک کو لوٹا جانے لگا تو گاندھی جی نے اس کی مخالفت میں ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء سے "مرن برت" شروع کر دیا۔ ان کو اس وقت کے وزیر داخلہ سردار پٹیل کے جانبدارانہ رویے [قتل و غارتگری کے ضمن میں] سے بھی سخت دلی صدمہ پہنچا تھا۔ جب سردار پٹیل نے قدرے تلخ لہجے میں گاندھی جی سے ان کے اس سلسلے میں برت رکھنے پر اعتراض کیا تو گاندھی جی نے جواب دیا کہ وہ اس وقت چین میں نہیں بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ دہلی میں موجود ہیں، اور انھوں نے خود مسلمانوں کو قتل ہوتے اور ان کی املاک کو لٹتے دیکھا ہے۔ جب گاندھی جی کے برت کی خبر دہلی کے عوام میں پہنچی تو انھوں نے جتھوں کی شکل میں "برلا ہاؤس" جہاں گاندھی جی رکے ہوئے تھے پہنچ کر ان کو منانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ گاندھی جی نے اپنے برت ختم کرنے کے عوض ان کے سامنے مندرجہ ذیل شرائط رکھیں ـــــ

۱۔ ہندو اور سکھ فوراً مسلمانوں پر حملے کرنے بند کر دیں اور انھیں یہ یقین دلائیں کہ وہ ایک بھائی کی طرح ان کے ساتھ رہیں گے۔

۲۔ ہندو اور سکھ ہر ممکن اس بات کی کوشش کریں گے کہ ایک بھی مسلمان خود کو اور اپنی املاک کو غیر محفوظ جان کر ہندوستان سے نہیں جائے گا۔

۳۔ چلتی ٹرینوں میں مسلمانوں پر جو حملے ہو رہے ہیں وہ فوراً روک دیے جائیں گے اور جو ایسا کر رہے ہیں ان کو باز رکھا جائے گا۔

۴۔ جو مسلمان دہشت کے سبب اپنے اپنے گھروں اور علاقوں کو چھوڑ کر حضرت نظام الدینؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی درگاہوں کے پاس چلے گئے ہیں ان کو پھر سے ان کے علاقوں، گھروں میں لایا جائے گا۔

۵۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی مرمت حکومت کی بجائے خود ہندو اور سکھ کریں گے۔

۶۔ مذکورہ بالا اقدامات سے زیادہ اہم یہ بات ہوگی کہ ہندو اور سکھ اقوام کے لیڈران مجھے (گاندھی جی کو) یہ یقین دہانی کرائیں گے کہ پھر سے مجھے اس مسئلے سے نپٹنے کے لئے برت رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اس وقت وہاں موجود تقریباً ۲۰،۰۰۰ عورتوں اور مردوں نے یک زبان ہو کر گاندھی جی کی شرائط کو پورا کرنے کا وعدہ اور عہد کیا۔ وہاں موجود ڈپٹی کمشنر مسٹر رندھاوا تو فوراً ہندوؤں اور سکھوں کے ایک گروپ کے ساتھ خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کی مرمت کے لئے چلے بھی گئے۔ اس کے بھی دو دن بعد گاندھی جی نے پورے طور مطمئن ہو جانے پر پوری کیبنٹ [محض سردار پٹیل موجود نہیں تھے۔] کے سامنے اپنا برت توڑا۔ [گاندھی جی کی پوتی ایک گلاس سنترے کا جوس لائیں جو گاندھی جی کے اشارے پر مولانا ابوالکلام آزاد کو دے دیا گیا اور انھوں نے گلاس گاندھی جی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔]

["انڈیا ونس فریڈم" ص ۲۳۳ تا ۲۴۰]

(۴) آزادی کے بعد سخت گیر ہندوؤں کی تنظیمیں، "ہندو مہا سبھا" اور "راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ"

گاندھی جی کے انصاف پسندانہ رویے سے خوش نہیں تھیں۔ انھوں نے کھلے عام یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کردیا تھا کہ گاندھی جی ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کر رہے ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کی Prayer Meetings میں بھی قرآن شریف اور بائبل کی verses کے پڑھے جانے کی مخالفت شروع کردی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے اشتہارات اور Hand Bills بھی تقسیم کرتے ہوئے گاندھی جی کے خلاف تو اعلانیہ مہم شروع کردی تھی۔ یہاں تک کہ ایک اشتہار کے ذریعہ تو انھوں نے گاندھی جی کو یہ بھی دھمکی دے ڈالی تھی کہ اگر وہ اپنے رویے میں بدلاؤ نہیں لائے تو ان کو قتل کردیا جائے گا۔ گاندھی جی نے مسلم کش فسادات کو رکوانے کے لیے جو "مرن برت" رکھا تھا اس سے مذکورہ تنظیمیں اور زیادہ برانگیختہ ہوگئی تھیں۔ چنانچہ ایک دن صبح کو جیسے ہی انھوں نے اپنی Prayer Meeting شروع کی ان پر ایک بم پھینکا گیا۔ اس سے گو کسی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا لیکن عوام میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ پولس نے تحقیقات تو کیں لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کے بعد بھی کوئی حفاظتی اقدامات نہیں کیے گئے اور بالآخر چند ہی دنوں بعد، ۳۰/جنوری ۱۹۴۸ء کو جب گاندھی جی کچھ توقف سے Prayer Meeting میں تشریف لائے تو ناتھورام گوڈسے نامی ایک شخص نے ریوالور سے ان پر تین گولیاں چلائیں جس سے گاندھی جی وہیں انتقال کرگئے۔ اس سے جہاں ملک میں ایک ماتم کی لہر دوڑ گئی وہیں کچھ شہروں، خاص کر گوالیار اور جے پور میں ایک انتہا پسند ہندو گروپ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مٹھائیاں تک تقسیم کیں اور ان کی خواتین نے قاتل کو اپنے ہاتھ سے سوئٹر تک بن کر بھیجے۔ جب مقدمہ چلا تو اسی گروپ نے پورے شد و مد کے ساتھ عدالت میں قاتل کی پیروی کی لیکن جب قاتل کو پھانسی کی سزا ہوگئی تو انھوں نے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے یہ اپیل جاری کی کہ چونکہ گاندھی جی عدم تشدد کے پیرو تھے اس لیے قاتل کی سزائے موت، عمر قید میں تبدیل کردی جائے۔ ["انڈیا وِنس فریڈم" ص ۲۳۴ تا ۲۴۰]

(۵) ملک تقسیم ہوئے ساٹھ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس دور کی نسل تقریباً اللہ کو پیاری ہو چکی ہے اور اس کے بعد کی بھی نسل جوانی کی دہلیز کو عبور کرچکی ہے لیکن فسطائی طاقتوں کے طعنہ و تشنیع ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اب بھی وہ ہندی مسلمانوں کو پاکستان کے

حوالے سے مستقل مطعون و مرعوب کرتی رہتی ہیں۔ ایسے ہی دو واقعات میرے ساتھ بھی پیش آئے۔ ایک بار جب میں مراد آباد میں [۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۶ء] تعینات تھا تو میں نے ایک ایسے شاطر اور نکمے ''کمپیوٹر'' (ایک پوسٹ کا نام ہے) کی Charge Sheet بنادی جو اپنے افسران کو بلیک میل کرنے میں ماہر تھا۔ چنانچہ کسی محکمہ جاتی کارروائی سے بچنے کی غرض سے اس نے وہاں سے میرے تبادلے کی کوشش کی۔ جب وہ ناکام ہوگیا تو اس نے یہ شرارت آمیز اور جھوٹی شکایت کرڈالی کہ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے جیتنے پر میں نے مٹھائی تقسیم کی، پاکستانی جھنڈا لہرایا اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے وغیرہ وغیرہ۔ اس پر میرا جواب طلب کرلیا گیا۔ پہلے تو میں گھبرایا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کسی کے لمحوں کی غلطیوں سے ہم کیوں صدیوں تک سزا پائیں۔ میں نے حقیقت پسندانہ اور دنداں شکن جواب دینے کا من بنالیا۔ میں نے جو جواب دیا وہ کچھ اس طرح سے تھا ''ہر دوا ساز کمپنی کے لئے قانونا یہ لازمی ہے کہ وہ ہر دوا پر date of manufacturing اور date of expiry کا لیبل چسپاں کرے۔ ان دونوں dates کے درمیان عموماً دو سے تین سال تک کا وقفہ ہوتا ہے۔ [دوا کے لحاظ سے] جس نوعیت کی شکایت کی گئی ہے اس کی date of manufacturing اگست ۱۹۴۷ء رہی ہے۔ یعنی اس کو manufacture ہوئے تقریباً ۴۸ سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ [یہ واقعہ ۱۹۹۵ء کا ہے۔] اس طرح اس کی ڈیٹ expire ہو چکی ہے۔ اس کے بعد مجھ سے مزید کوئی معلومات نہیں کی گئی۔

اسی طرح ۱۹۶۹ء میں جب میں دہلی میں مرکزی وزارت ''ورکس اینڈ ہاؤسنگ'' کی ایک "National Buildings Construction Undertaking Corporation" (N.B.C.C.) میں سروس کرتا تھا تو ایک دن صبح کو جیسے ہی میں دفتر پہنچا کہ میرے ہی ماتحت ایک نقشہ نویس (D'man) نے مجھے مبارکباد دی۔ میں نے جب وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ آج ۱۴/اگست ہے۔ میں تب بھی نہیں سمجھا۔ میری خاموشی پر اس نے پھر کہا کہ سر! آج پاکستان کا یوم آزادی ہے۔ اس کا یہ جملہ سن کر گویا میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ وہ تیر چھوڑ چکا تھا۔ میں نے بمشکل تمام غصہ پیتے ہوئے شکریہ کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ تعجب ہے کہ تم ابھی تک اپنے وطن کو نہیں بھولے''

[جو سندھ کا رہنے والا تھا جو اب پاکستان کا حصہ ہے۔]

(۹) مولانا ابوالکلام آزاد نے 'India Wins Freedom' میں تقسیم [illegible]
واقعات نیز کانگریس [illegible]
جن میں موصوف ''دو قومی نظریہ' [Two Nation
Theory'] **پیش ضرور مسٹر جناح نے کیا تھا لیکن اس کو جلاء سردار پٹیل نے بخشی پرچم تقسیم ھند بلند بے شک مسٹر جناح نے کیا تھا لیکن اس کو لہرایا سردار پٹیل نے۔** سردار پٹیل [illegible]
[illegible]
[illegible] ہو کر بالآخر ہندوستان میں شامل ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

['India Wins Freedom' ص [illegible]]

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کو تقسیم پر راضی کرنے کے بعد [illegible] جواہر لال نہرو کو بھی [illegible] ترک کر دیں۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ اب میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مخالفت کروں۔

["India Wins Freedom' ص [illegible]]

''صوبائی خود مختاری اعلامیہ'' ["Govt. of India Act 1935"] کے بعد ۱۹۳۷ء میں پہلی بار جو انتخابات ہوئے اس میں زیادہ تر صوبوں میں کانگریس کی، یا اس کے تعاون سے حکومتیں بنیں۔ [پانچ اہم صوبوں میں تو وہ Absolute Majority میں اور چار صوبوں میں Single Largest پارٹی کی شکل میں برسر اقتدار آئی تھی۔] پنجاب میں کانگریس کے تعاون سے "Unionist" پارٹی برسر اقتدار آئی اور حضر حیات خاں وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ انھوں نے ''ہندو مہاسبھا'' [اس وقت کی ہندو وادی تنظیم] کو بھی وزارت میں شامل کیا۔ بنگال میں کانگریس کے تعاون سے ''کرشک پرجا پارٹی'' [اس پارٹی کو اے۔ کے۔ فضل الحق جو ۱۹۳۵ء میں کلکتہ کے Mayor رہ چکے تھے، نے ۱۹۳۶ء میں قائم کیا تھا۔] برسر اقتدار آئی اور اے۔ کے۔ فضل الحق وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔ انھوں نے شیاما پرساد مکھرجی [ایک کٹر ہندو] کو بھی وزارت میں شامل کیا لیکن اسی سال کانگریس نے Horse Trading کرنے کے بعد فضل الحق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ [اسی وجہ سے فضل الحق ۱۹۳۵ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔] یو۔ پی میں کانگریس کی سرکار بنی۔ یو۔ پی میں چودھری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل خاں مسلم لیگ کے صف اوّل کے لیڈران میں سے تھے۔ مولانا آزاد جب حکومت سازی کے سلسلے میں لکھنؤ گئے تو انھوں نے مذکورہ دونوں لیڈران کو یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ انھیں وزارت میں شامل کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد مولانا تو حکومت سازی ہی کے سلسلے میں پٹنہ چلے گئے اور جواہر لعل جی نے مولانا کی یقین دہانیوں کے برعکس ان دونوں کو لکھا کہ ان میں سے محض ایک ہی کو وزارت میں شامل کیا جا سکتا ہے، وہ بھی جس کا نام ان کی پارٹی، مسلم لیگ طے کرے گی۔ اس پر دونوں ہی نے وزارت میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ [یو۔ پی میں مسلم لیگ کے ۲۶ ممبر منتخب ہو کر آئے تھے جو ایک بڑی کامیابی تھی۔ یہ کامیابی جمعیۃ العلماء کے تعاون کے سبب حاصل ہوئی تھی۔] اس واقعہ کا مسٹر جناح نے فائدہ اٹھایا۔

["India Wins Freedom" ص ۱۷۰، ۱۷۱]

بہار میں کانگریس Absolute majority میں جیت کر آئی تھی۔ وہاں ڈاکٹر سید محمود سب سے زیادہ سینیر کانگریسی ہونے کے ساتھ ساتھ ''آل انڈیا کانگریس کمیٹی'' کے جنرل

سکریٹری بھی تھے۔ چنانچہ یہ سمجھا جا رہا تھا کہ وہی وہاں کے وزیر اعلیٰ منتخب کئے جائیں گے لیکن ڈاکٹر راجندر پرشاد نے وہی کام کیا جو بقول مولانا آزاد، سردار پٹیل بمبئی میں کر چکے تھے۔ [بمبئی میں مسٹر نریمن سب سے زیادہ جانی پہچانی کانگریسی شخصیت تھے۔ امید یہی جا رہی تھی کہ وہی وزیر اعلیٰ منتخب کئے جائیں گے لیکن جب وقت آیا تو ان کے پارسی (اقلیتی فرقے سے) ہونے کی وجہ سے سردار پٹیل اور ان کے ساتھیوں نے ان کی مخالفت کی اور بی۔ جی کھیر کو وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ مسٹر نریمن نے احتجاج بھی کیا لیکن [illegible] کر دیا گیا۔] ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی ڈاکٹر سید محمود کے اقلیتی فرقے سے ہونے کے سبب ان کی حق تلفی کرتے ہوئے شری کرشن سنہا اور انوگرہ نرائن سنہا جو مرکزی اسمبلی کے ارکان تھے، کو بہار واپس بلا کر شری کرشن سنہا کو وزیر اعلیٰ بنوا دیا۔

اسی طرح کی تنگ نظری کا ایک اور واقعہ اس سے پہلے بھی رونما ہو چکا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے عشرے میں مسٹر سی۔ آر۔ داس جو ایک کھلے ذہن کے اور بنگال کے ایک مشہور لیڈر تھے، نے یہ اعلان کیا کہ اگر کانگریس اقتدار میں آئی تو وہ مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں میں ساٹھ فیصد کو مختص کریں گے جب تک کہ ان کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب تک نہ ہو جائے۔ [بنگال میں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن تعلیمی اور اقتصادی طور پر وہ ہندوؤں کے مقابلے میں پسماندہ تھے۔ بمشکل تمام ۳۰ فیصد مسلمان سرکاری ملازمتوں میں تھے۔] انھوں نے کلکتہ کارپوریشن میں تو [illegible] فیصدی تک reservation رکھنے کی بات کہی۔ حالانکہ بنگالی کانگریسیوں نے ان کی اس بات پر سخت مخالفت بھی کی تھی کہ انھیں مسلم نواز تک کہا گیا لیکن وہ اپنے فیصلے پر تاحیات قائم رہے۔ تقریباً ۱۹۲۵ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے ساتھیوں نے ان کے اعلانات کو پس پشت ڈال دیا۔ نتیجتاً بنگال کے مسلمان جو کانگریس کے ممنون ہوئے تھے [illegible] سے دور ہو گئے اور **تقسیم کا پہلا بیج بویا گیا**۔

دوسری جنگ عظیم [جو ۱۹۳۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی] کے دوران برطانوی حکومت نے جو جنگی حمایت کی اپیل کی اس کے گاندھی جی مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگ سے ہماری عدم تشدد (Non-Violance) کی تحریک [illegible] کی بات

چاہیے۔ چنانچہ جب اپریل ۱۹۴۲ء میں "Cripps Mission" ہندوستان آیا اور اس نے کانگریس کے رہنماؤں سے بات کی ["Cripps Mission" نے یہ تجویز رکھی کہ اگر ہندوستان جنگ میں شمولیت اختیار کرنے پر رضا مند ہو جاتا ہے تو لڑائی ختم ہو جانے کے بعد اس کو آزاد کر دیے جانے کے سلسلے میں برٹش حکومت غور کرے گی۔] تو کافی غور وخوض کے بعد "کانگریس ورکنگ کمیٹی" نے یہ قرارداد منظور کی کہ اگر برٹش حکومت ہندوستان کو آزاد کر دینے کا اعلان کر دیتی ہے تبھی کانگریس برٹش حکومت کی مدد کرے گی۔ اس قرارداد کی مخالفت میں گاندھی جی کے قریبی ساتھی سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد، آچاریہ کرپلانی، ڈاکٹر پرفل گھوش وغیرہ نے یہ کہتے ہوئے "ورکنگ کمیٹی" سے استعفیٰ دے دیے تھے کہ عدم تشدد آزادی سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ [بالآخر یہ مشن ناکام ہو گیا تھا۔] پھر جب ۱۹۴۷ء **میں آزادی کے وقت فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کی غرض سے اس وقت کے کمانڈر ان چیف نے یہ مشورہ دیا کہ ملک کی تقسیم کے بعد بھی کم سے کم تین سال تک فوج کو ایک ہی رہنے دیا جائے** تو انہیں مذکورہ لیڈران نے اس تجویز کی مخالفت کی نتیجتاً ملک کے ساتھ ساتھ فوج بھی تقسیم ہوئی اور اس کے منفی اثرات فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے میں حائل ہوئے۔

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہو جانے پر جب برطانیہ میں "Labour Party" برسر اقتدار آئی تو اس نے ہندوستان کو آزادی دینے کے حوالے سے ایک مشن ("British Cabinet Mission") ہندوستان بھیجا جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان آیا۔ [اس مشن میں شامل افراد کے نام آگے دیے جا رہے ہیں۔] ۱۶ مئی کو اس مشن کا متن شائع کر دیا گیا جس کو کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں نے مان لیا تھا۔ اس کے بعد ۱۰ جولائی کو جواہر لعل نہرو، جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے، نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس بلا کر ایک بیان دے دیا جس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ کانگریس نے محض اصولی طور پر "Constituent Assembly" میں شمولیت اختیار کی ہے۔ چنانچہ وہ

"Cabinet Mission Plan" میں کوئی بھی ترمیم یا تنسیخ کرنے میں خود مختار [illegible]
ہے۔ اس پر مسلم لیگ کو یہ اعتراض کرنے کا موقع مل گیا کہ مسلم لیگ [illegible]
یقین دہانی پر ہی میں مذکورہ پلان کو منظور کیا تھا کہ اس کو کانگریس نے بھی منظور کر دیا ہے اور
یہ پلان ماضی میں Indian Constitution کی بنیاد ہوگا [illegible] کانگریس
پریسیڈینٹ کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ Constituent Assembly
میں اپنی اکثریت کی بنیاد پر اس میں رد و بدل کریں گے [illegible] اقلیت
[illegible]
[illegible] ہندوستان [illegible]
[illegible] ہو [illegible] بعد مسلم
لیگ نے "Cabinet Mission Plan" کو مسترد کر دیا اور پاکستان کے حصول کے
لیے ۱۶ اگست کو یوم راست اقدام کی کارروائی (Direct Action) کے لیے ایک Resolution
منظور کیا۔ ["India Wins Freedom" ص [illegible]]
اس کے بعد نوا کھالی، کلکتہ، بہار، یو۔پی (گڑھ مکتیشر)، پنجاب [illegible] امرتسر،
راولپنڈی وغیرہ) وغیرہ میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔

بقول مولانا ابوالکلام آزاد: **جواہر لال جی کا مذکورہ بیان بے وقت اور نامناسب تھا۔ اس کی وجہ سے غلط فہمیوں اور تلخیوں میں اضافہ ہوا اور دوریاں بڑھیں۔**

مذکورہ واقعہ کے بعد مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شامل ہونے سے منع کر دیا تھا لیکن بعد
میں وائسرائے Lord Wavell کے سمجھانے پر وہ ۱۵ اکتوبر کو عبوری حکومت میں
شامل ہونے پر رضامند ہو گئی۔ [کانگریس ارکان پہلے ہی ۲ ستمبر کو حلف لے چکے تھے۔]
وائسرائے نے یہ تجویز رکھی کہ کلیدی وزارت میں سے ایک مسلم لیگ کو دے دی جائے اور
اس ضمن میں انہوں نے وزارت داخلہ کا مشورہ دیا۔ [مولانا آزاد جی اس کے حق میں تھے
[illegible] کہ وزارت داخلہ میں کرنے کو کوئی زیادہ [illegible]

ذمہ داریاں صوبائی حکومتوں کے پاس تھیں۔] لیکن سردار پٹیل جو اس وقت وزیر داخلہ تھے، اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور وزارت ہی سے مستعفی ہو جانے کی دھمکی دے ڈالی۔ بعد میں رفیع احمد قدوائی کی تجویز جس کی سردار پٹیل نے پرزور الفاظ میں تائید کی، پر مسلم لیگ کو وزارت خزانہ سپرد کر دیا گیا۔ [سردار پٹیل کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے پاس اس وزارت کا اہل کوئی شخص نہیں ہے۔] مسلم لیگ نے اس وزارت کے لئے نواب زادہ لیاقت علی خاں [ان کا تعلق یو۔پی میں واقع مظفر نگر ضلع کے زمیندار گھرانے سے تھا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ سیاست میں آئے تھے۔] کا نام پیش کر دیا۔ [لیاقت علی خاں کے علاوہ مسلم لیگ کی طرف سے آئی۔ آئی چندریگر، عبدالرب نشتر، غضنفر علی اور جوگیندر ناتھ منڈل کے نام وزارت میں شامل کئے جانے کے لئے وائسرائے کو بھیجے گئے تھے۔] اس کے بعد لیاقت علی خاں نے کانگریسی وزراء کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ [وزارت خزانہ اتنی اہم ہوتی ہے کہ ہر وزارت کا اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ حد یہ ہوگئی تھی کہ سردار پٹیل اپنی مرضی سے ایک چپراسی تک نہیں رکھ سکتے تھے۔ ["India Wins Freedom" ص ۱۷۸،۱۷۷]

اس طرح **سردار پٹیل کی ضد کی وجہ سے کانگریسی وزراء کو عجیب و غریب حالات سے دوچار ہونا پڑا اور تلخیوں میں مزید اضافہ ہوا۔** بات یہیں ختم نہیں ہوئی، لیاقت علی خاں نے جو بجٹ پیش کیا اس کی سردار پٹیل اور راج گوپال آچاریہ نے یہ کہتے ہوئے زبردست مخالفت کی کہ لیاقت علی خاں ملک کے مفادات کی فکر نہ کر کے سرمایہ داروں کے خلاف ہیں۔ ان کا یہ بھی الزام تھا کہ چونکہ سرمایہ داروں کی اکثریت ہندو ہے اس لئے وہ ان کے خلاف ہیں اور بجٹ فرقہ وارانہ بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ اس کا لیاقت علی خاں نے یہ کہہ کر جواب دیا کہ بجٹ کانگریس کے declaration کی بنیاد پر ہی تو تیار کیا گیا ہے۔ غرضیکہ mis-trust اور فرقہ وارانہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

ایک غلط فہمی اور تلخی جواہر لال جی کی اس بات سے بھی پیدا ہوئی کہ وہ حکومت سازی کے بعد "Council of Ministers" کی میٹنگ سے پہلے وزراء کو چائے پر مدعو کرنے کے واسطے بلوا تے

اپنے پرائیوٹ سکریٹری کی طرف سے بھجوایا کرتے تھے۔ اس پر لیاقت علی خاں نے اپنی توہین محسوس کی کہ ایک پرائیوٹ سکریٹری انھیں چائے کی دعوت دے۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی اعتراض تھا کہ کونسل کا نائب صدر (جواہر لعل جی) میٹنگ طلب کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ الغرض انھوں نے الگ سے مسلم لیگ کے وزراء کی میٹنگ طلب کرنی شروع کر دیں۔ ["India Wins Freedom" ص ۱۸۰]

(ے) برطانیہ کی Conservative پارٹی، اس کے وزیر اعظم مسٹر چرچل اور دیگر انگریز مدبرین ہندوستان کو آزاد کرنے کے حوالے سے یہ کہہ کر مخالفت کرتے رہے تھے کہ ہمارے ہٹتے ہی وہاں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑیں گے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے خاتمے [یہ جنگ جرمنی کے پولینڈ پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو حملہ کردینے سے شروع ہوکر امریکہ کی جاپانی شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر بالترتیب ۶؍اگست اور ۹؍اگست ۱۹۴۵ء کو بمباری کردینے سے ۱۵؍اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے surrender کرنے کے بعد ۲؍ستمبر کو اس کے جنگ بندی معاہدے پر دستخط کردینے پر ختم ہوئی۔] کے بعد جب برطانیہ میں لیبر پارٹی' برسر اقتدار آئی تو اس کے وزیر اعظم، مسٹر اٹیلی نے ۲۰؍فروری ۱۹۴۷ء کو دارالعوام میں ایک بیان دیا جس کی رو سے اہل ہند کو اقتدار منتقل کرنے کی آخری تاریخ یکم جون ۱۹۴۸ء مقرر کی گئی تھی۔ وائسرائے ہند، Lord Wavell [لارڈ ویول کو ۱۹۴۳ء میں ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہندوستان ہی میں برطانوی فوج کے Commander-in-Chief تھے۔] نے یہ کہتے ہوئے کسی تاریخ کے تعین کی مخالفت کی کہ ابھی حالات سدھرنے دیں اور جلد بازی نہ کریں۔ [لارڈ ویول کو 'British Cabinet Mission" جو ۲۳؍مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان آیا تھا اور جس کے پلان کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تسلیم کرتے ہوئے اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مرکزی عبوری حکومت تشکیل دے دی تھی، سے یہ توقع تھی کہ دونوں پارٹیاں باہم ایک ایسا Constitution وضع کریں گی جس سے آزادی کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوں گے۔] "Conservative پارٹی" نے بھی اس فیصلے کی یہ کہتے ہوئے مخالفت کی کہ اتنے بڑے تغیر کو روبعمل لانے کے انتظامات کرنے کے لیے محض پندرہ ماہ کی

مہلت ناکافی ہے۔ لیکن مسز اینجی اپنی ضد پر قائم رہے تو لارڈ ویول استعفیٰ دے کر ہندوستان سے واپس اپنے وطن چلے گئے۔ [روانگی سے ایک دن قبل انھوں نے آخری بار Cabinet کی میٹنگ کی صدارت کرنے کے بعد ایک مختصر سی تقریر کی۔ سب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ میں نے ایک بہت نازک وقت میں وائسرائے ہند کا عہدہ سنبھالا تھا۔ میں نے نہایت دیانتداری سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں لیکن حالات کے پیش نظر مجھے استعفیٰ دینا پڑا۔ یہ وقت ہی بتائے گا کہ استعفےٰ دینے میں میں کس حد تک صحیح ہوں۔ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ لوگ کسی جلد بازی سے کام نہ لیں۔ وغیرہ وغیرہ]

لارڈ ویول کے بعد Lord Mount Batton [وہ ملکۂ برطانیہ کے شوہر، پرنس فلپ کے چچا ہوتے تھے۔] نے ۲۲ رمارچ ۱۹۴۷ء کو دلی پہنچ کر ۲۳ رمارچ کو ہند کے وائسرائے اور گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا۔

ہندوستان کو آزاد کرنے کے حوالے سے برطانیہ کے سامنے دو ہی راستے تھے' یا تو وہ خود خوشی خوشی (بظاہر) آزادی دے کر ماضی میں اپنے مفادات کی حفاظت کرتا رہے یا پھر نکال دیے جانے کی صورت میں ماضی کے مفادات سے بھی محروم ہو جائے۔ اس نے پہلے راستے کو اختیار کیا۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بہت شاطرانہ انداز میں مئی کے وسط تک تقسیم ہند کا خاکہ جس میں پنجاب، بنگال اور آسام کی تقسیم کا تصور بھی موجود تھا [۱۹۴۶ء تک پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا تخیل تک بھی نہ تھا۔] مکمل کر کے اور برطانوی حکومت سے بھی منظوری لینے کے بعد ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو یہ اعلان کر دیا کہ ہندوستان کو ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء تک دو آزاد مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح جس کام کے لئے پندرہ ماہ کا عرصہ ناکافی سمجھا جا رہا تھا اس کے لئے بنا کسی پیشگی تیاری کے اور جان بوجھ کر جلد بازی میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ وہ ۷۲ دنوں میں مکمل کر دیا جائے گا۔ بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی **''یہ صریحاً ایک ارادی شرارت تھی تاکہ تقسیم سخت افراتفری کے عالم میں ہو اور کشت و خون سے یہ سرزمین لالہ زار بن جائے۔ اگر آدمیت سے تقسیم**

کا معاملہ طے پاتا۔ شرافت سے اس پر عمل درآمد ہوتا اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی منصفانہ سلوک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ کچھ مدت بعد پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہوتا۔ مگر اب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دو دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں جو صدیوں تک انہیں ایک دوسرے سے جدا رکھیں گی۔

[''تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان'' حصہ دوم ص ۲۹۵-۲۹۸]

تقسیم سے پہلے، تقسیم کے وقت اور تقسیم کے بعد تک جو حالات رونما ہوئے یا ہو رہے ہیں وہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت انجام پذیر ہوئے یا انجام پا رہے ہیں اور انجام پاتے رہیں گے (معاذ اللہ)۔ اس ضمن میں چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں

نہرو کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ ہندوستان متحد نہ رہ سکا۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے سب سے پہلے سردار پٹیل پر ہاتھ صاف کیا [کیونکہ وہ ایک مضبوط آدمی سمجھے جاتے تھے اور گاندھی جی سے بھی بہت قریب تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ظاہری طور پر انہیں walnut (اخروٹ، جو اوپر سے سخت لیکن اندر سے شیریں اور ملائم ہو) کہتے تھے۔] ان کو تقسیم ہند پر راضی کرنے کے لئے یہ پٹی پڑھائی کہ ہندوستان کا شمال۔ مشرقی اور شمال۔ مغربی کچھ علاقہ مسلم لیگ کو دے کر باقی ملک کو متحد، مضبوط اور خوشحال بنایا جائے۔

سردار پٹیل کو ہموار کر لینے سے گاندھی جی بھی تقسیم ہند پر راضی ہو گئے تھے حالانکہ اس سے پہلے تک وہ یہ کہتے رہے تھے کہ تقسیم ان کی لاش پر سے ہوگی اور وہ کسی بھی حال میں کانگریس پارٹی کو بھی اس پر راضی نہیں ہونے دیں گے۔

سردار پٹیل کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواہر لعل جی پر ڈورے ڈالے۔ پہلے تو نہرو جی نے تقسیم ہند کی سخت مخالفت کی لیکن پھر قدم بقدم لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کوششوں سے انہوں نے بھی تقسیم کی مخالفت ترک کر دی تھی۔ بقول مولانا آزاد، نہرو جی کو رام کرنے کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور کرشنا مینن کی Services استعمال کیں۔

اس طرح ایک ماہ کے اندر اندر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تقسیم کے حوالے سے اپنے مشن میں کامیاب ہوگیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مولانا آزاد کو بھی ہمنوا بنانا چاہا لیکن مولانا نے جب مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ بنا تقسیم کے ہی کلکتہ، نواکھالی، بہار، یوپی (گڈھ مکٹیسر)، بمبئی اور پنجاب (لاہور، امرتسر، راولپنڈی، ٹیکسلا وغیرہ) وغیرہ میں فرقہ وارانہ فسادات ہوگئے ہیں تو پھر تقسیم سے تو اور بھی خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی جس کے لئے برطانیہ کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا، تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا کہ **میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ فسادات اور خون خرابہ نہیں ہونے دوں گا۔ میں ایک سپاہی ہوں، عام شہری نہیں۔ ایک بار بنیادی طور سے تقسیم طے پا جانے تو پھر میں یہ احکامات جاری کردوں گا کہ ملک میں کہیں بھی فرقہ وارانہ فسادات نہ ہونے پائیں۔ اگر کہیں تھوڑی سی بھی کسی نے حرکت کی تو میں اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا۔ میں مسلح پولس استعمال نہیں کروں گا بلکہ ہوائی اور پیدل فوج کو حکم دوں گا کہ وہ ہوائی جہازوں اور ٹینکوں سے بمباری کرکے ہر فسادی کا قلع قمع کردیں۔** ["India Wins Freedom" ص ۲۰۷]

لیکن ان یقین دہانیوں کے برعکس ملک کے دارالخلافہ دہلی میں بھی مسلمانوں کا خون ارزاں ہوا، خواتین کی آبروریزی کی گئی، دن کی روشنی میں بھی سڑکیں، گلی، کوچے ان کی لاشوں سے پٹ گئے غرضیکہ ان پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا، تب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہاں چلے گئے تھے؟ وہ تو تب بھی گورنر جنرل کے عہدے پر فائز تھے!۔

بنگال اور پنجاب صوبوں کی تقسیم میں بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہی شرارت تھی۔ ورنہ ۱۹۴۳ء تک تو ان صوبوں کی تقسیم کا تخیل تک بھی نہ تھا۔ مسلم لیگ کے تجویز کردہ مسلم علاقے میں آسام بھی پورا پورا شامل تھا۔ اس وقت مجوزہ پاکستان کے مغربی حصے میں غیر مسلموں کی تعداد ۳۷،۹۳ فیصدی اور مشرقی حصے میں (بشمولیت آسام) ۴۸،۳۱ فیصدی تھی۔ [''تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان'' حصہ دوم] اس ضمن میں **لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریسی لیڈران کو یہ تاکید کردی تھی کہ وہ اپنے طور ان صوبوں کی تقسیم کا مسئلہ نہ اٹھائیں اور یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ وہ (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) خود مناسب وقت پر اس سے نپٹ لیں گے۔**

یہاں یہ قابلِ ذکر ہے کہ "Cabinet Mission Plan" [اس مشن کو ہندوستان بھیجنے کا اعلان برطانوی وزیر اعظم، مسٹر ایٹلی نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۶ء کو کیا تھا۔ اس میں برطانوی وزارتِ کونسل کے تین ممبران Lord Pethick Lawrance (Secretary of State for India)، Sir Stafford Cripps (President of Board of Trade) اور Mr A V Alexander (First Lord of Admiralty) شامل تھے۔ یہ مشن ۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء کو دلی پہنچا۔ ۱۶ر مئی کو اس نے ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے ماضی میں ہندوستانی حکومت کے بارے میں مختصراً اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک detailed constitution بنانے کی حکمتِ عملی وضع کرنے کی بات کہی۔ اس کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے منظور کر لیا تھا۔ اس کے بعد ۲۹ر جون ۱۹۴۶ء کو یہ مشن ہندوستان سے واپس چلا گیا۔] میں جو Grouping کی گئی تھی اس کی رو سے پورے ملک کو تین گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک میں پنجاب، شمالی۔مغربی صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان، دوسرے میں بنگال اور آسام اور تیسرے میں ہندوستان کا باقی علاقہ رکھا گیا تھا۔ ["بھارت کا برہت اتیہاس" (ہندی) حصہ سوم ص ۳۵۷] جب "آسام کانگریس" نے یہ کہتے ہوئے گروپ سے علیحدگی اختیار کرنی چاہی کہ شروع ہی سے کوئی بھی یونٹ کسی گروپ سے نکل کر کسی بھی دوسرے گروپ میں شمولیت اختیار کر لینے کی مجاز ہے اور اس کی گاندھی جی نے بھی تائید کر دی تھی، تو مسٹر جناح نے یہ کہتے ہوئے اس کی مخالفت کی [کیوں کہ وہ آسام پر بھی اپنا حق سمجھتے تھے] کہ مذکورہ پلان میں کوئی بھی رد و بدل کرنے سے معاہدے کی بنیادی تبدیلی سمجھی جائے گی۔ پلان کی رو سے قانون سازی کے بعد ہی کوئی صوبہ علیحدگی اختیار کر سکتا ہے۔ تب سے ہی کسی صوبے کو کافی اختیارات مل جاتے ہیں کہ وہ جس گروپ میں جانا چاہے اس میں شمولیت اختیار کر لے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مسٹر جناح کے اس موقف کی تائید کی ہے۔ ۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو برطانوی کیبنیٹ نے بھی اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنا فیصلہ دے دیا تھا۔ ["India Wins Freedom" ص ۸۷]

بہرحال، تقسیم کے حوالے سے ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو پہلی اعلانیہ

جاری کیا اس کے مختصراً اہم نکات اس طرح سے ہیں :—

۱۔ اگر مسلم اکثریتی والے علاقے چاہیں، تو وہ ایک علیحدہ Dominion بنا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس مقصد کے لئے ایک نئی آئین ساز (Constituent) (सविधान निर्मात्री) اسمبلی بیٹھے گی۔ مگر ایسا ہونے پر، اگر ان صوبوں کی اسمبلیوں کے ہندو اکثریتی اضلاع کے نمائندوں نے چاہا، تو بنگال اور پنجاب کی تقسیم ہوگی۔ [یہی وہ شق ہے جس کی بنا پر پنجاب اور بنگال کا بٹوارہ ہوا اور جس کی بابت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا۔]

۲۔ شمال۔ مغرب سرحدی صوبے میں استصواب رائے (Refrendum) ہوگا جس کے ذریعہ یہ طے کیا جائے گا کہ اسے پاکستان میں شامل ہونا ہے یا نہیں۔

۳۔ استصواب رائے کے ذریعہ عوام کا رجحان جاننے کے بعد ضلع سلہٹ، بنگال کے مسلم اکثریتی علاقے کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔

۴۔ بنگال اور پنجاب میں ہندو اور مسلم صوبوں کی سرحدیں متعین کرنے کے لئے ''سرحدی کمیشن'' تشکیل دئے جائیں گے۔

۵۔ پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں فوراً ہندوستان کو Dominion Status دینے کے لئے (یا پھر اگر تقسیم کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو دو Dominion بنانے کے لئے) قانون بنایا جائے گا۔ اس سلسلے میں قانون ساز اسمبلی (یا اسمبلیاں) کے آخری فیصلے پر اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس تاریخی اعلانیہ کا عوام میں ملا جلا ردِ عمل ہوا۔ کانگریس نے افسوس اور مسلم لیگ نے غیر اطمینانی کا اظہار کیا۔ [''بھارت کا برہت اتیہاس'' (ہندی) حصہ سوم ص ۳۵۹]

(۲) ”دُعائیہ کلمات“

خدا کرے، وہ دن جلد آئیں جب دونوں کے مابین اس حد تک تعلقات استوار وخوشگوار ہو جائیں کہ ـــــ

۱۔ دونوں اپنی اپنی سرحدوں سے فوجیں ہٹا کر اور بھاری دفاعی بجٹ میں مناسب حد تک کٹوتی کرتے ہوئے اپنے وسائل کو اپنے عوام کی فلاح و بہبود اور ان کے معیارِ زندگی بلند کرنے میں صرف کریں۔

[خدا کا شکر ہے کہ دعا قبول ہوئی اور ۲۱ راکتوبر سے دونوں ممالک کے درمیان سری نگر۔ مظفرآباد اور پونچھ۔ راولاکوٹ کے راستوں سے تجارت شروع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اٹاری۔ واگہہ (پنجاب سیکٹر) اور کھوکھراپار۔ مناباؤ (راجستھان سیکٹر) کے راستوں سے بھی بذریعہ ریل تجارت پر اتفاق ہو گیا ہے نیز اسکردو۔ کرگل (کشمیر سیکٹر) راستہ کھولنے پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ اسی طرح دو بھائیوں کے درمیان رشتے استوار ہوتے رہیں۔]

۲۔ دونوں ممالک کے بیچ "Most Favourable Nations" کی بنیادوں پر تجارت ہو سکے اور وہ ایک دوسرے کی مصنوعات کی کھپت کر سکیں۔

۳۔ دونوں ممالک کے سائنسی، تعلیمی، ثقافتی حتیٰ کہ نیوکلیائی اور عسکری وفود جذبۂ خیرسگالی سے سرشار ہو کر Regularly باہمی تبادلۂ خیالات کر سکیں تاکہ ایک دوسرے کے تجربات سے وہ استفادہ حاصل کر سکیں۔ ویسے تو یکم جنوری ۲۰۰۳ء کے اعلانیہ کے مطابق دونوں ممالک ہر سال اپنے اپنے نیوکلیائی انسٹالیشن کے بارے میں ایک دوسرے کو جانکاری دے ہی رہے ہیں۔

[خدا کا شکر ہے کہ تعلیمی اور ثقافتی وفود کا آنا جانا تو شروع ہو گیا ہے۔ کاش کہ ایٹمی اور دفاعی وفود کا بھی سلسلہ شروع ہو جائے۔]

۴۔ سفر میں حائل تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں اور جو صورتِ حال ہندوستان۔ نیپال، امریکہ۔ کنیڈا اور یورپین ممالک کے بیچ ہے وہ یہاں بھی میسر آسکے۔ یا کم از کم

(i) دونوں ممالک میں مزید Visa Offices کھل جائیں۔ جیسے

ہندوستان میں ممبئی (بمبئی)، حیدرآباد، چینئی (مدراس)، پٹنہ اور لکھنؤ اور پاکستان میں کراچی، کوئٹہ اور لاہور یا ملتان۔

(ii) اٹاری۔واگھا بارڈر کے علاوہ کم سے کم ایک بارڈر اور کھل جائے تاکہ کراچی کی مسافت بھی کم ہو سکے۔

[اللہ کا شکر ہے کہ یہ دعا قبول ہوئی اور اب آمدورفت کے لئے ایک اور ریلوے راستہ، کھوکھراپار۔مناباوہ (راجستھان سیکٹر) کا کھل گیا ہے اور ےراپریل ۲۰۰۵ کو سری نگر۔مظفرآباد کے مابین بس سروس و منوبین شگو اور سونی کا ندھی ہری جھنڈی دکھا ہی چکے ہیں۔ ایک دیگر راستے، اسکردو۔کرگل (کشمیر سیکٹر) پر گفت و شنید جاری ہے۔ خدا اس میں بھی جلد کامیابی عطا فرمائے۔]

(iii) دہلی۔لاہور کے بیچ کے Check Posts (اٹاری اور واگھا) ہفتہ میں دو دن کھلنے کی بجائے روزانہ کھلنے لگیں اور ''سمجھوتہ ایکسپریس'' بھی روز چلنے لگے۔ نیز دہلی۔لاہور بس سروس بھی Daily ہو جائے۔

[دہلی۔لاہور بس سروس جس تعطل کا شکار ہو گئی تھی، شکر ہے کہ وہ ۲۶رمئی ۲۰۰۳ء سے پھر سے بحال ہو گئی ہے۔]

(iv) دہلی اور لاہور ریلوے اسٹیشنوں پر بالترتیب ہندوستانی اور پاکستانی ریلوں میں ان ممالک کے Visa Holders کے لئے مناسب Reservation Quota مقرر کر دیا جائے۔

(v) جس طرح پاسپورٹ کی میعاد دس سال ہوتی ہے اسی طرح ویزا کی میعاد بھی دس سال کر دی جائے اور اس عرصے میں جب چاہے اور جتنی بار چاہے Visa Holder سفر کر سکے۔ بے شک اس کے زیادہ سے زیادہ قیام (Stay) پر پابندی لگا دی جائے۔

{آمین ثمہ آمین}

باب ہفتم

مآخذ

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	نام مصنف	نام مترجم
۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	"منقبت حقانی" [مخطوطہ]	فارسی/اردو	علامہ عبدالحمیدؒ	مولانا خورشید علیؒ
۲۔	"کشف المحجوب"	فارسی/اردو	شیخ علی ہجویری	محمد الطاف نیر وی
۳۔	"اخبار الاخیار"	فارسی/اردو	شیخ عبدالحق	مولانا سبحان محمود
۴۔	"خزینۃ الاصفیاء"	فارسی	مفتی غلام سرورؒ	—
۵۔	"نفحات الانس"	فارسی/اردو	شیخ عبدالرحمن جامیؒ	شمس بریلوی
۶۔	"اذکار ابرار" ["گلزار ابرار" کا اردو ترجمہ]	فارسی/اردو	محمد غوثی شطاریؒ	فضل احمد جیوری
۷۔	"سفینۃ الاولیاء"	فارسی/اردو	شہزادہ داراشکوہؒ	محمد اقبال سلیم گاہندری
۸۔	"مرآۃ الاسرار"	فارسی/اردو	شیخ عبدالرحمن چشتی	کپتان واحد بخش سیال
۹۔	"قاموس المشاہیر"	اردو	نظامی بدایونی	—
۱۰۔	"سیر الاولیاء"	فارسی/اردو	مولوی مبارک علوی کرمانی	اعجاز الحق قدوسی
۱۱۔	"آب کوثر"	اردو	شیخ محمد اکرام	—
۱۲۔	"رود کوثر"	اردو	شیخ محمد اکرام	—
۱۳۔	"تذکرہ اولیائے پاک و ہند"	اردو	مرزا محمد اختر	—
۱۴۔	"مآثر الامراء" (جلد اول)	فارسی/انگریزی	صمصام الدولہ شاہنواز خان	بیورج
	(جلد دوم و سوم)	فارسی/اردو	ایضاً	محمد ایوب قادری
۱۵۔	"گلدستہ گلشن فقیری"	اردو	منشی محمد حافظ اللہ	—

۵	۳	۳	۲	۱
عبدالحی خواجہ	محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ	فارسی اردو	"تاریخ فرشتہ" (جلد اول ودوم)	۱۷ـ
[illegible]	ملا عبدالقادر بدایونی	فارسی/اردو	"منتخب التواریخ" (جلد اول تا سوم)	۱۸ـ
—	پروفیسر اطہر علی	انگلش	"The Apparatus of Empire" [ترجمہ [illegible]]	۱۸ـ
—	پروفیسر اطہر علی	انگلش	The mughal Nobility under Aurangzeb	۱۹ـ
—	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	اردو	"تحریک آزادی ہند اور مسلمان"	۲۰ـ
—	مولانا ابوالکلام آزاد	انگلش	"India Wins Freedom"	۲۱ـ
—	ڈاکٹر رام منوہر لوہیا	انگلش	"Guilty man of India's Partition"	۲۲ـ
—	راجموہن گاندھی	انگلش	Understanding the Muslim Mind"	۲۳ـ
—	احمد حسین صدیقی	اردو	"گوہر بحیرہ عرب" (کراچی)	۲۴ـ
	عارف حسین	انگلش	Understanding Krachi"	۲۵ـ
مولوی معین الدین	مولوی عبدالقادر	فارسی اردو	"علم وعمل" (جلد اول ودوم) [وقائع عبدالقادر خانی]	۲۶ـ

۱	۲	۳	۴	۵
۲۷۔	"آئین اکبری" (جلد اوّل و دوم)	فارسی/اردو	علامہ ابوالفضل	مولوی محمد فدا علی طالب
۲۸۔	"ملتان کی ادبی زندگیاں"	اردو	ڈاکٹر روبینہ ترین	—
۲۹۔	"تسہیل تاریخ"	اردو	"روہیلکھنڈ لٹریری سوسائٹی"، بریلی	—
۳۰۔	"بھارت کا برہت اتہاس" (حصہ اوّل تا سوم)	ہندی	رمیش چندر مجمدار	—
۳۱۔	"بھارت کا اتہاس"	ہندی	آشیرواد لال شریواستوا	—
۳۲۔	"دلی سلطنت"	ہندی	......ایضاً	
۳۳۔	"مغل سامراجیہ اُتھان اور پتن"	ہندی	رام پرساد ترپاٹھی	—
۳۴۔	"بھارت میں مسلم شاسن"	ہندی	ایس۔آر۔شرما	—
۳۵۔	"مدھیہ کالین بھارت" (حصہ دوم)	ہندی	ہریشچندر شرما	—
۳۶۔	"مغل کالین بھارت"	ہندی	ایل۔پی۔شرما	—
۳۷۔	"پرچیں اور مدھیہ کالین بھارت"	ہندی	ایل۔پرساد	—
۳۸۔	"اورنگ زیب" (ایک نئی درشٹی)	ہندی	اوم پرکاش پرساد	—
۳۹۔	"مفتاح التقویم"	اردو	حبیب الرحمن	—

باب ہشتم

احقر کی دیگر تصنیفات

جو شائع ہو چکیں

[۱] ''کہکشاں'' = ۱۹۸۱ء میں بلند شہر نمائش کے موقع پر منعقدہ مشاعرے کی روداد نیز شریک شعراء صاحبان کے تعارف وکلام پر مبنی ہے۔

[۲] ''آبگینہ'' = ۱۹۸۲ء میں بلند شہر نمائش کے موقع پر منعقدہ مشاعرے کی روداد نیز شریک شعراء صاحبان کے تعارف وکلام پر مبنی ہے۔ ان کے علاوہ ضلع کی مشہور ومعروف اور قابل فخر ہستیوں کی سوانح کے ساتھ ساتھ شہنشاہِ الفاظ، شاعرِ انقلاب جناب جوش ملیح آبادی؛ مسیحائے غزل، شاعرِ حسن ونظر جناب فراق گورکھپوری، غمخوارِ مساکین، شاعرِ مزدور جناب احسان دانش اور پاکستانی قومی ترانے کے خالق، شاعرِ اسلام جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری کے حالاتِ زندگی اور ان کے چیدہ چیدہ کلام بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان سب کے علاوہ چند دیگر ایسے دلچسپ معلوماتی اور حیرت انگیز مضامین جیسے ''جونسار بابر'' کے علاقے میں، ''رسمِ دروپدی'' (پانچ بھائیوں کی مشترک بیوی) اور ڈاک پتھر (ضلع دہرہ دون) کے قدرتی مناظر بھی شامل کیے گئے ہیں۔

[۳] ''پریتی کُنج'' [ہندی رسم الخط] = ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں بلند شہر نمائش کے موقعوں پر منعقدہ مشاعروں میں شامل ہوئے شعراء صاحبان کا ہندی میں تعارف، ان کے کلام پر تبصرے اور ان کے کلام (کلام کے الفاظ کو بنا بدلے محض کلام کا رسم الخط ہی دیوناگری میں کرتے ہوئے) کے علاوہ اردو شعر وشاعری کے صنفِ سخن کی تعریف معہ مناسب مثالوں پر مبنی ہے۔

[۴] ''سید عبدالرحمٰن بن فضل اللہ'' [المعروف بہ سید سلطان بہرائچیؒ] = سید سلطان بہرائچیؒ، ان کی اولاد، خلفاء، نیز دیگر متعلقہ بزرگوں کے بارے میں معہ شجرات تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مناسب رنگین فوٹوگراف اور نقشے جات بھی شامل کیے گئے ہیں۔

[۵] ''سلطان الشہداء'' [سید سالار مسعود غازیؒ] = سید سالار مسعود غازیؒ، ان کے لشکر کے شہداء نیز جن راجاؤں سے سید سالار مسعود غازیؒ کے شکر کی معرکہ آرائیاں ہوئیں، کے بارے میں معہ شجرات تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضروری رنگین نقشے جات اور فوٹوگراف بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ مقامات جہاں شہداء ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں، کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

[۶] ''چند قدم گھر سے.'' = پاکستان سے متعلق سفرنامہ جس میں انجینیرنگ نقطۂ نگاہ سے کراچی میں پانی، بجلی کی ترسیل، سیوریج کی نکاسی، ذرائع نقل وحمل وغیرہ کی سیر حاصل تفصیلات دی گئی ہیں۔ اب اس کتاب کو زیر نظر کتاب کی شکل میں Revise کیا گیا ہے۔

جو شائع ہونے والی ہیں

[۱] ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' = یہ چار جلدوں میں، کل ملا کر تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی۔ تقریباً دس سال کی مسلسل سائنٹیفکلی تحقیقات کے

بعد اس میں کم و بیش ڈھائی سو اولیاء اللہ، مشائخین نیز علمائے کرام کے بارے میں معہ زیادہ تر کے طریقتی و نسبی صحیح صحیح شجرات شامل کرتے ہوئے اُن کے حالاتِ زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تصوف، کفو، انساب اور برِ صغیر میں مسلم سلاطین کا اس میں اسلامی انداز فکر سے احاطہ کیا گیا ہے۔ مناسب تصاویر و نقشے جات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ چاروں جلدیں کمپیوٹر ٹائپ کرائی جا چکی ہیں۔ تقریباً ڈھائی لاکھ روپیہ اشاعت پر صرفہ آنے کا تخمینہ لگایا گیا ہے جو سرِ دست مانع ہے۔ جلد وار تفصیلات اس طرح سے ہیں:۔

جلد اوّل: "تاریخ دومانِ عالی" = اس میں قدوۃ المشائخ حضرت شیخ حبیب اللہؒ کی شخصیت، ان کا سلسلۂ نسب اور طریقت، ان کی اولاد؛ سلسلۂ "چشتیہؒ" کے اہم صوفیاء کرام کی سوانح بمعہ ان کے نسبی شجرات برِ صغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے بنیادی "انساب" ["عربی النسب"، "عجمی النسب" اور "ہندی النسب"] اور خانوادۂ "انصاریان" پر سیر حاصل معلومات شامل کی گئی ہیں۔

جلد دوم: "قریہ جو ایک ہے عالم میں انتخاب" = اس میں ایک ایسے موضع جس کی تعریف بانیٔ "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ"، سر سید احمد خاںؒ بھی کر چکے ہیں اور جو علاقے میں "خطۂ یونان" سے تعبیر کیا جاتا ہے، کی تاریخ؛ علاقے میں پائی جانے والی خودرو جڑی بوٹیوں اور ان کے فوائد؛ اشجار، طیور اور کیڑے مکوڑوں کی تفصیلات نیز مذکورہ بستی میں آباد مختلف خاندانوں کے شجرات اور اُن کے اہم بزرگوں کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

<u>جلد سوم</u> : "منبعِ الاسرار" = یہ پوری جلد تصوف پر مبنی ہے۔ اس میں اصطلاحات تصوف، علم لدنی، شطحیات، مختلف سلاسل اور رجال الغیب جیسے اہم موضوعات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اہم "صاحب شطحیات"، "مجذوب" اور "رجال اللہ" کی سوانح، ان کے "نسبی" و "طریقتی" شجرات شامل کئے گئے ہیں۔

<u>جلد چہارم</u> : "تذکرۂ جہانباں" = اس برصغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش میں گزرے مسلم سلاطین و بادشاہوں کی کارگزاریاں جو انھوں نے اسلام کے فروغ کی خاطر کیں، پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز کون سا شاہی خاندان یا کس کا سلطان بادشاہ کس اولیاء اللہ کی دعا/بددعا سے برسرِ اقتدار یا اقتدار سے محروم کر دیا گیا، کی تفصیلات ایک نئے محققانہ انداز سے پیش کی گئی ہیں۔

[۲] "<u>درِ بے بہا</u>" = انبیاء کرام بمعہ شجرہ، غزوات، سرایا، اصحاب غزوۂ بدر اور خلفائے راشدین سے متعلق ہے۔ مسودہ typing میں ہے۔

[۳] "<u>حبیب الانساب</u>" = قاضی و مفتی خاندان قصبہ بجنور، قاضی و مولوی خاندان قصبہ سیوہارہ، قاضی و مفتی خاندان قصبہ نگینہ، شیخ خاندان قصبہ نگینہ، مولوی و دیگر ضمیمہ قاضی خاندان قصبہ سیوہار، قاضی و مفتی خاندان قصبہ کرتپور، قریشی خاندان قصبہ منڈاور، قاضی خاندان قصبہ شیرکوٹ، صدیقی خاندان قصبہ بجنور (نزد لکھنؤ)، اور فاروقی خاندان قصبہ گوپامئو (ضلع ہردوئی) وغیرہ سے متعلق شجرات شامل کرنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ قصبات کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مسودہ تیار ہے۔

[۴] "<u>گردِ سفر</u>" = خودنوشت ہے جس میں خاندان، عزیز و اقارب، بچے بچے، ملازمت اور تجربات کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جہاں

جہاں دورانِ ملازمت تعینات رہا وہاں کے جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی نیز ٹیکنیکل پس منظر میں حقائق کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کرائے گئے اہم ٹیکنیکل کاموں کے نایاب نقشے اور فوٹوگراف بھی شامل کیے جا رہے ہیں۔ ٹیکنیکل، سماجی اور تاریخی اعتبار سے انشاء اللہ اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ہوگی۔ مسودہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔

[۵] ''قائم چاند پوری'' [چند حقائق بے نقاب] = قائم کی شخصیت، ان کے حالاتِ زندگی، اردو شاعری میں ان کے مقام نیز ان کے نسبی شجرے پر بھرپور طریقے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چند حقائق تو اچھوتے اور چونکا دینے والے ہیں۔ مسودہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔

تصحیح نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
ب	۵	+91-9808179281	+91-9528825627
۴۱	۶	دارلاسلام	دارالاسلام
۴۱	۷	سنہ ساچہ کی	سنہ سے چہ کی
۴۲	۲	بڑا مال ہوتا ہے	بڑا مال ہوتی ہے
۴۸	۲۰	کی	کہ
۴۳	۲۰	Develop	Development
۳۵	۵	(Agriculture Production Commissioner)	"Agriculture Production Commissioner"
۳۵	۱۹	غلام مصطفےٰ جنوئی	غلام مصطفےٰ جتوئی
۶۷	۳	کھنچا	کھنچی
۶۷	۵	کافی چھوٹی حد تک	کافی حد تک چھوٹی
۹۵	۲	لارڈ لنگڈن	لارڈ ولنگڈن
۹۶	۱۶	ہندوستالی	ہندوستانی
۱۰۵	۸	بنسبت	بہ نسبت
۱۱۶	۱۰	معزول کرکے	معزول کردیا اور
۱۱۷	۸،۷	مربہ میل	مربع میل
۱۲۲	۱۲	صالح	صالحہ
۱۲۲	۲۰	کبیر اولیاء	کبیرالاولیاء
۱۲۶	۱	(غالباً روی منکر، جلسنائے)	(غالباً برنارڈ شا)
۱۲۷	۱۲	نے دیں گے	نہ دیں گے
۱۲۸	۵	ہیڈاکوارٹر	ہیڈکوارٹر
۱۳۰	۸	"اکھنڈ بھارتی"	"اکھینڈ بھارتی"
۱۳۰	۲۶	"اکھل بھارتیہ ودھارتی پریشد"	"اکھل بھارتیہ ودھیارتی پریشد"
۱۳۱	۱	سوامی اودھیش آنند گردی	سوامی اودھیش آنند گری
۱۳۲	۶	بی ایس سی گریجویٹ	بی ایس سی (گریجویٹ)
۱۳۳	۱۵	دکن چندوکلاء	دکن وکلاء
۱۳۵	۱۳	تلاش کی	تلاش کیا
۱۳۶	۳	Sy. S.P	Dy. S.P
۱۵۷	۲	کی شے پر	کی شہ پر
۱۵۹	۱۲	جواہرلال	جواہر لعل
۱۷۳	۱۵	شہاب محمد غوری	شہاب الدین محمد غوری

۱۷۵	۵	خضر خاں خاشغری	خضر خاں کاشغری
۱۷۶	۲۲	باپ دادا	باپ دادا
۱۸۰	۹	جرنج	جرآج
۱۸۰	۱۳	در ہنج	در وقج
۱۸۰	۲۲	دوم وزیر اعظم	وزیر اعظم دوم
۱۸۵	۱۸	تفصیلات ص......پر	تفصیلات ص ۱۳۸، ۱۳۹ پر
۱۸۷	۲۱	چھ ہزاری دار تھا	چھ ہزاری منصب دار تھا
۱۹۱	۱۲	دائیرہ	دائرہ
۱۹۷	۱۹	عقدیت	عقیدت
۱۹۸	۶	تخیید	تشہد
۲۰۰	۳	عافت	آفت
۲۰۱	حاشیہ		ایک بہن بی بی جمال خاتون [م ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء)]
۲۱۰	۲۰	سوئی انجانی	سوئی زنجانی
۲۱۲	۱۲	فخر الدین حسن زنجانی	فخر الدین حسین زنجانی
۲۱۹	۱۳	دائرہ اسلام	دائرۂ اسلام
۲۵۵	۱	صاحبزادے	صاجزادے
۲۵۶	۲	اوارت	ارادت
۲۵۸	۱۷	فضلائے	فضلائے
۲۶۳	۱۱	....	پیرہ
۲۶۳	۲۰	"العروص"	"العروض"
۲۶۵	۸	اسطبل	اصطبل
۲۶۷	۱۸	باغبان پورہ،	باغبان پورہ
۲۶۸	۱۳	یا ایک سنگ زمین سے ۲ میٹر اونچے پلیٹ فارم پر	یہ سنگ زمین سے ۲ میٹر اونچے ایک پلیٹ فارم پر
۲۶۸	۱۸	تغلق اچھر	تغلق اچھر
۲۸۷	۲	کیا ہمارے وزیر اعظم	ہمارے وزیر اعظم
۲۸۸	۱۳	اب رہا ہماری عافیت	اب رہی ہماری عافیت
۲۹۰	۱۷	پاکستانی	پاکستانی
۲۹۱	۲۱	ان سے	اس سے
۲۹۶	۱۱	Enginner	Engineer
۳۰۰	۸	نظام اولیاءؒ	نظام الدین اولیاءؒ
۳۰۲	۱۶	Expire ہو چکی ہے۔	Expire ہو چکی ہے۔"
۳۰۳	۱۹	جواہر لال	جواہر محل
ڈسٹ کور	پشت	اسرار	اصرار
ج	[۶]	گندگی کی نکاسی کا نظام	گندے پانی کی نکاسی کا نظام

حرفِ مَن

برادرِ عزیز محمد سمیع الدین سلمہٗ کا اصرار ہے کہ میں زیرِ نظر کتاب کے متعلق کچھ لکھوں۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اسی غلبۂ محبت کے سبب انھوں نے میری ذہنی صلاحیتوں کے متعلق وہ حسنِ ظن قائم کر رکھا ہے جو خوابوں کا محل تو ہوسکتا ہے حقیقت کا چہرہ ہرگز نہیں۔ اسے کیا کہا جائے کہ چھوٹوں کی شدومد کی فرمائشیں ''ارشادِ عالی'' کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ چند جملے اسی تعمیلِ ''ارشادِ عالی'' میں لکھے جا رہے ہیں۔

''سلطان الشہداء'' اور ''سید عبدالرحمٰن بن فضل اللہ'' کی غیر معمولی مقبولیت نے سمیع میاں کو حوصلہ دیا کہ وہ ''چند قدم گھر سے......'' کو بہتر پیمانے پر شائع کریں۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو جانفشانی کی ہے اور جس شوقِ طبیعت سے اس تالیف کے لئے مواد فراہم کیا ہے وہ یقیناً لائقِ تحسین ہے۔ مجھ جیسا سپاٹ آدمی جسے علم وادب سے دور کا ہی واسطہ ہے اس کا اہل نہیں کہ ان کی کاوشوں کا منصفانہ جائزہ لے سکے اور اس ذخیرہ پر کوئی تنقید کر سکے۔ حُسنِ ترتیب، ظاہری رعنائی کی چیز ہے۔ میں اس سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اس تالیف کی ادبی وعلمی قدر وقیمت پر صحیح اظہارِ خیال تو اہلِ بصیرت ہی کریں گے۔ ''چند قدم گھر سے......'' کے اندر فکر ونظر کا جو سرمایہ ہے وہ اپنے وزن ووقار کی بدولت پُر مسرت کیفیتوں سے مالا مال ہے۔

سمیع سلمہٗ کے ادبی شوق اور ذہنی صلاحیتوں سے میری امیدیں وابستہ ہیں۔ میں ان کے روز افزوں ادبی شغف اور جذبۂ خدمت میں اپنی تمناؤں کے حسین چہرے دیکھتا ہوں۔ ان کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا کرے وہ حسین سے حسین تر کی جستجو میں حوصلہ اور استقامت کو رفیقِ راہ بنائے رہیں۔ (آمین)

شجاع الدین
حبیب باغ، علی گڑھ
۳۱؍ مارچ ۲۰۰۹ء

[شجاع صاحب مصنف کے حقیقی برادرِ کلاں ہیں۔]

یعقوب نظامی کا آبائی وطن مقبوضہ کشمیر کا ایک چھوٹا سا گاؤں سلواہ ہے جو ضلع پونچھ کی تحصیل مینڈر میں واقع ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد ان کا خاندان ہجرت کرکے پاکستان آیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں حاصل کی مڈل سکول تک گورنمنٹ سکول راہوالی گوجرانوالہ کینٹ میں پڑھے۔ ثانوی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول میرپور آزاد کشمیر میں مکمل کی۔ پھر ڈگری کالج میرپور پڑھتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں فلسفہ اور نفسیات کے مضامین کے ساتھ بی۔اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں منگیتر بن کر انگلستان آئے تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس وقت مانچسٹر سٹی کونسل کے شعبہ ترجمہ میں ڈپٹی مینجر ہیں۔

جاوید حکیم قریشی

Rs.